[illegible]
DR ZAKIR HUSAIN LIBRARY
[illegible]
[illegible]

DUE DATE

Cl. No. _____ Acc. No. 123217

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

عصری ادب

Jamia Nagar

اس شمارے میں

- موت مشتاق یوسفی
- خوشامد ادب کا عروج
- میں بڑی سخت ہیں۔

مظفر یکجا میں قادر حرج ساسی

ساہتیہ اکادمی کی نئی اردو کتابیں

ہندوستانی ادب کے معمار سیریز

		روپے
محمد قلی قطب شاہ	مسعود حسین خاں	۱۰
راجندر سنگھ بیدی	وارث علوی	۱۰
مصحفی	عابد حسین	۱۰
میر علی انیس	محمد ذاکر	۱۰
تلوک چند محروم	ام حبیبہ ناصری	۱۰

انگریزی انتھالوجی

راجندر سنگھ بیدی کے سو افسانے	گوپی چند نارنگ	۶

تراجم

[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	۱۰

فہرست مطبوعات اور تجارتی کیٹلاگ کے لیے لکھیے:

ساہتیہ اکادمی سواتی بلڈنگ نزد برلا مندر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Asri Asad Delhi

عصری ادب

شمارہ ۶۶ [illegible]

نگراں

محمد حسن

مدیران

ڈاکٹر روشن آرا

سید بہاء الدین احمد

قیمت فی شمارہ ۔ بیس روپے

ادارۂ تصنیف

ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

فون ۔ ۷۲۳۴۴۷۴

● ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سید بہاء الدین احمد نے [illegible] کے انٹر پرائزس [illegible] دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تصنیف، ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۱۰۰۰۹ [illegible]

(ماہنامہ [illegible] پرنٹ [illegible] کے [illegible])

ترتیب

سرورق، مشتاق احمد یوسفی

حرفِ آغاز ۳

باعثِ تاخیر ۶

آئینے ترچھے آئینے ۱۱

گوشۂ یوسفی

ست رنگے لمحوں کا جادو — مشتاق احمد یوسفی ۱۰
محمد حسن

مشتاق احمد یوسفی سے انٹرویو ۵۴
آصف فرخی - لاہور

ضیائی الدین اور لفظ کا مزاج ۷۶
مشتاق احمد یوسفی

شخصیات

مرزا عظیم بیگ چغتائی — ۸۵
مرزا نجم بیگ چغتائی

بلراج ساہنی ۹۹
کنول نین پرواز

[illegible] قیامت کا جنوں طاری تھا ۱۲۸
نصیر حیدر

نظمیں/گیت

بیکل اتساہی [illegible]

غزلیں

بیکل اتساہی ۱۳۶
خورشید طالب ۱۳۹
عبدالمتین جامی ۱۵۰

افسانے

العطش! العطش! ۱۵۱
رضا امام
دورِ اداس ۱۶۳
سنیل گنگوپادھیائے
ترجمہ: شانتی رنجن بھٹاچارجی
خوف ۱۸۳
نووڈ ٹلیوسن
ترجمہ: نصر ملک

کتابوں کی باتیں

محو تیل، سید انظر، سید احمد قیصر، م ح [illegible] ۱۹۸

SUBSIDIZED BY THE SAHITYA KALA PARISHAD FOR 200 COPIES

حرفِ آغاز

وقت شاید ایک نقطہ پر آکر تھم گیا ہے۔

زمین، آسمان، وقت، دن گردش میں ہیں مگر اسی طرح، بلکہ اس سے کہیں زیادہ گردش میں ہیں ہمارے روز و شب

۱۹۴۷ء میں زمین خون سے رنگین ہو گئی۔ قصور ہمارا تھا تو اتنا کہ ہم نے ووٹ کی پرچی شاید غلط بکس میں ڈال دی اور نتیجے کے طور پر ہمارے جو نمائندے "منتخب" ہوئے انھوں نے ہمیں بیچ کھایا، بانٹ کھایا، ہمیں گھر سے بے گھر کر دیا، اپنے وطن میں اجنبی بنا دیا۔ لاکھوں مر گئے، کروڑوں مہاجر ہو گئے۔ ہم نے صبر کر لیا چلو یہی قسمت کا لکھا تھا۔ حکومتیں جب بدلتی ہیں، ملک جب آزاد ہوتے ہیں تو زلزلے آتے ہیں، کھوپڑیوں کے مینار بنتے ہیں، چلو ہمارے بیسیوں کی کھوپڑیاں بھی تاریخ کے اس بے درد بے رحم مینار میں لگ گئیں دل کا کیسا ہی خون کیوں نہ ہوا ہو، ہم نے صبر کی سل سینے پر رکھ لی۔

... پھر اس دن سے آج تک ہر مہینے کبھی کبھی ہر ہفتے فسادات کی آگ روشن رہی۔ گھر جلتے رہے، بچے یتیم ہوتے رہے، بے زبان قتل ہوتے رہے اور ظلم کی تلوار کبھی فسادیوں کے ہاتھ میں تھی تو کبھی محصلوں کے کبھی گھر کو آگ لگانے والی مشعل غنڈوں نے جلائی تو کبھی اسکالر، لون اور پولیس نے۔ ہم نے قتل و خون کے اس عصر میں ان روزانہ صبح و شام کی ذلتوں اور لاشوں کا شمار بھی بھلا دیا جو مدتوں سے معمول بن چکی تھیں۔ زبان ہماری پیش رد کر دی گئی، تہذیب ہماری بے لباس ہوئی اور ہمارے بچے ہم سے ایسے بچھڑے زبان بولنے لگے ماں جائے کو خط لکھے تو وہ اسے پڑھ بھی نہ سکے کہ وہ مادری زبان پڑھنے سے محروم کیا جا چکا ہے۔

زمین وطن رنگ بدلتی رہی مگر ان سب رنگوں میں سب سے گہرا، سب سے دائمی رنگ ہمارے بہتے ہوئے خون ہی کا تھا جو ہماری رگ رگ سے ٹپک رہا تھا اور روش روش سن چمن لالہ و گل کی آبیاری کر رہا تھا۔

—— اسی طرح ۱۹۹۰ء آگیا اور اب کے برس کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ منافرت کی

جنوری - فروری - 1992 -

مستقل بنیادوں پر کھڑی کی جائے گی۔ یہی بنیادیں جو ۱۹۴۷ء کو بھی فراموش کر دیں پانچ سو ہزار سال کے پرانے واقعات اور کہانی قصوں کی بنیاد پر تاریخ جھٹلائی اور فرضی تاریخ گڑھی جائے گی کہ ہندوستان کے رہنے والے سیکولر شہری اور دھرمی ایک دوسرے کو پھر کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکیں۔

بے شک یہ بھی پہلی بار ہی ہوا کہ ایک گاندھی نے نہیں ملک کے تمام سچے سیکولر عناصر نے مل کر اس انکار کا مقابلہ کیا۔ پہلی بار ہی یہ بھی ہوا کہ حکومتِ وقت نے تمام مصلحتوں کو نہ سہی بہت سی مصلحتوں کو طاق پر رکھ کر اپنا کچھ فرض ادا کیا، مجرموں کی نشان دہی ہوئی جو دوسروں کو جیل بھیجا کرتے تھے۔ یا فساد کر کے دوسروں کے ہاتھ پاؤں تڑوایا کرتے تھے انھیں بھی جیل خانے کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا اور فسادیوں کے بھی کچھ ہاتھ پیر ٹوٹے۔ یہ بھی ہوا کہ سیکولرازم کے مسئلے پر سمجھوتہ کرنے کے بجائے حکومت وقت نے اپنی کرسی تیاگ دینے کی ہمت کی ـــــ یہ سب ہوا، مگر مستقل نفرت کا بیج تو بو ہی دیا گیا جس کی فصل وقتاً فوقتاً کاٹی جاتی رہے گی۔

ـــــ اور یہ المیہ اس ملک کے لیے بہت بڑا ہے جس کی آبادی میں صرف ۲ فیصد پڑھے لکھے ہیں جو اپنے دستخط کر سکتے ہیں، جہاں مہنگائی قحط کی سرحدوں کو چھو رہی ہے جہاں مفلسی ہے، بھوک مری ہے، بے روزگاری ہے، جہالت اور بیماری ہے اور پانی کا قطرہ تک نایاب ہے۔

مگر کیا کریں خوابوں کے قافلے تو روکے نہیں رکتے۔ اس دھرتی سے جو پیار ہے وہ تو اُمڈا ہی آتا ہے یہاں کے رہنے والوں پر جو بھروسہ ہے وہ ایسا اندھا ہے کہ اور کسی بات پر کان نہیں دھرتا۔ میرے لوگ ایسے پیارے ہیں بہک جاتے ہیں مگر سدا کے لیے سنک نہیں ہو سکتے۔ رات ان کی آنکھوں پر بھی اترتی ہے مگر رات کا انجام بھی تو ہے اور اسے آخر جانا تو تا سحر ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم وہ سحر نہ دیکھ پائیں اور رات کی اسی تیرگی میں بھسم ہو کر رہ جائیں ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

باعث تاخیر

عصری ادب کا یہ شمارہ کوئی سال بھر بعد چھپ رہا ہے۔ معذرت واجب ہے۔ اس دوران ملک بھر آٹھ مہینے بیرون ہند کے سفر میں گزرے ــــ یورپ اور مغربی ایشیا کے ملکوں میں۔ سفر پر روانگی سے قبل رسالے کی کتابت کرا کے ایک کرم فرما سے گزارش کر گیا تھا کہ براہ کرم کاغذ خرید کر پریس بھجوا دیجیے گا، کاغذ کا بل وہاں سے ادا کر دوں گا۔ انھوں نے ہامی بھر لی مگر کچھ نہ کیا۔ نتیجہ تاخیر

اور مزید تاخیر

لندن جانے کی داستان یہ ہے کہ خیر سے بی سی سی آئی (بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل) نے اپنے دور اوّل میں جناب آغا حسن عابدی کی سربراہی میں لندن کے مرکزی مقام پکاڈلی سرکس میں بڑی دھوم دھام سے اردو مرکز کھولا تھا۔ کاربرداروں کو بھی معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ لندن پہنچنے والے ادیبوں کی مان دان بھی ہوتی تھی اور جلسے بھی بڑے دھوم دھام سے ہوتے تھے مگر دروغ برگردن راوی اخباروں نے اور برطانیہ اور امریکہ کی عدالتوں نے یہ دریافت کیا کہ بینک کا سارا کاروبار ہیروئن اور منشیات کے حاصل کردہ کالے دھن کو سفید بنانے کا تھا اور اس میں بڑے بڑے ملوث تھے حد یہ ہے کہ مجلس اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کا جہاز اس دھندے میں استعمال ہوا۔

بینک بند کر دیا گیا۔ مقدمے چلے۔ امریکہ اور برطانیہ میں پابندی لگی

اور بینک دوسروں کے ہاتھ فروخت ہو گیا مگر اس سے قبل ہی ایڈیٹنگ کی سرپرستی سے محروم ہو اردو مرکز لندن بند ہو گیا اور وہ بھی اس رسوائی سے کہ قرق امین سارا اثاثہ بہ قیمتی کتابوں کے اٹھا لے گیا۔

لندن کی اردو برادری کے لیے یہ حادثہ سخت تھا۔ مجاہد ترمذی نے ہمت کی اور کسی طرح اردو سینٹر کا ڈول ڈالا۔ بیکر اسٹریٹ میں ایک دفتر کا انتظام کیا گیا۔ مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی کہ اردو سینٹر لندن کے ریڈنگ روم کا اجتماع کروں اور سنٹرل کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے اردو سنٹر کی سرگرمیوں کا خاکہ تیار کروں اور اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دوں۔ سنٹرل کمیٹی کی دوسری رکن ماسکو کے مشرقی انسٹی ٹیوٹ کی اردو کی پروفیسر اینا سوورووا مقرر ہوئیں۔ غرض اردو سنٹر لندن کی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ سے ایک معاہدہ ہوا اور دونوں اداروں نے باہمی اشتراک سے کتابوں کی تصنیف ترجمے اور طباعت کے پروگرام بنائے اور ماہانہ جلسے ہونے لگے۔ مئی ۱۹۹۲ء میں عالمی اردو کانفرنس کا بھی منصوبہ بنایا گیا۔

یہاں سے نمٹ کر اور خلیجی جنگ نمٹا کر مغربی ایشیا پہنچا۔ یہاں بھی اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام پایا۔ جشن مجروح بھی اسی زمانے میں ہوا۔ یہ پہلا نہ سہی دوسرا جشن ہوگا جو کسی ہندستانی اردو شاعر کے اعزاز میں منعقد ہوا۔ خوشی ہوئی مگر اس کا افسوس بھی ہوا کہ اب عالمی سطح پر پاکستان کے اردو والوں اور ہندستان کے اردو والوں میں خلیج بڑھتی جا رہی ہے اور ترقی پسند تحریک کے ادیبوں والی یگانگت اور محبت اب ختم ہو رہی ہے۔

اس سارے عرصے میں دو باتوں کا شدید احساس رہا۔ ایک یہ افتخار کہ اردو دنیا کے ۳۲ ملکوں میں پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔ یورپ ایشیا اور امریکہ کے کم سے کم ایک درجن ملکوں سے اردو کے رسالے اور اخبار نکل رہے ہیں اور کم سے کم دو درجن ٹیلی ویژن اور ریڈیو اسٹیشن اردو پروگرام پیش کرتے ہیں روزنامہ

• بیجنگ لندن کی اشاعت چالیس ہزار سے زیادہ ہے۔ بعض عالمی سطح پر اردو کا کام کرنے والے ان دنوں میں مرکز یت پیدا کرنے کے مواقع بھی ہیں اور امکانات بھی
رنج اس بات کا رہا کہ اردو کی سرپرستی اب ناجائز کاروبار کے ہاتھ میں آتی جا رہی ہے گویا ادب دہی شاعری تو صرف سامانِ تجارت بنتی جا رہی ہے۔ اس سے ہونے والی آمدنی کا بہت تھوڑا سا حصہ بچارے شاعروں کو ملتا ہے جو غیر ملکی زرمبادلہ میں ہونے کی وجہ سے ہندستانیوں اور پاکستانیوں کو بہت معلوم ہوتا ہے مگر دراصل اس کی منفعت اشتہاروں کی بدولت منتظمین کو جاتی ہے اور ان کے نیز میں رشتے خاصے قابل اعتراض ہوتے ہیں۔

• عصری ادب کا یہ شمارہ اس لیے بطور خاص غیرتِ فن کی نذر ہے۔ آج سے پہلے غیرتِ فن کو فائدہ کبھی ایسے نازک مراحل سے گزرنا پڑا ہو۔ ایک طرف ہیروئن اور مشیات کا دھندہ کرنے والوں نے ادب کی سرپرستی کی ٹھانی ہے اور اس طرح اپنے غیر قانونی دھندوں کو خاصہ قابل احترام بنانے کا منصوبہ پورا کر لیا ہے۔ بھولے بھالے انقلابی شاعر اور ادیب بھی اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ دوسری طرف انعامات، کرسیاں، تمغے اور چھوٹے بڑے ایسے لالچ ہیں کہ اچھے خاصے بیدار مغز اور محتاط اہل فن بھی دام ہم رنگ زمیں کو نہیں دیکھ پاتے۔
عصری ادب کا یہ شمارہ اسی دام ہم رنگ زمیں کی نشان دہی کی کوشش ہے۔
ہمارا دوسرا اہم گوشہ ہے شخصیات سے متعلق۔ اس بار اس شمارے میں گوشۂ مشتاق یوسفی کے علاوہ مجاز پر ان کے رفیق دیرینہ نصیر حیدر کا مضمون عظیم بیگ چغتائی پر ان کے صاحب زادے کا مضمون اور بلراج ساہنی پر کنول نین پرواز کے مضمون کی قسط شامل ہے۔ مجاز نے اردو شاعری میں پہلی بار جدید اور سائنسی مزاج کو عام کیا اور وسیع تر حسیت اور جدید تہذیبی طرز کو نظم کیا اور پھر مجاز کی طرح طرز زندگی جو مصلحتوں کو خاطر میں لائے بغیر قلندرانہ گزری۔

عظیم بیگ چغتائی کی زندگی کے وہ گوشے مذکورہ مضمون میں سامنے آئے ہیں جو ابھی تک نظروں سے پوشیدہ تھے عصمت کے خاکے دوزخی میں بھی ان کا ذکر نہیں اس اعتبار سے یہ خاصے کی چیز ہے۔

اس بار یورپ کا سفر بڑا سبق آموز اور عبرت خیز تھا۔

جو کچھ پڑھا اور دیکھا، اس سے یہ عقیدہ پختہ ہوا کہ دنیا کے چلانے والے تو دراصل ہیروئن اور ڈرگ کا دھندہ کرنے والے ارب پتی ہیں جو ملکوں ملکوں راج کرتے ہیں۔ بش اور گرباچیف ہوں یا نواز شریف اور نرسمہا راؤ، یہ سب تو محض کٹھ پتلیاں ہیں ان کٹھ پتلیوں کو نچانے والے کوئی اور ہیں۔ کیٹی کیٹی نے صدر ریگن کی اہلیہ محترمہ کی سوانح حیات چھاپی، اس میں صاف صاف درج ہے کہ امریکہ میں مافیا کے سربراہ اور ہیروئن کے کاروبار کے سرپرست ہالی وڈ کے مشہور گلوکار فرینک سانٹرا کے تعلقات مسز ریگن سے اس قدر قریبی تھے کہ جب یہ دونوں یک جا ہوں تو خود صدر ریگن خوابگاہ میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے اور امریکہ کے سیاسی اور تجارتی فیصلوں پر مسز ریگن کے ذریعے فرینک سانٹرا اثر انداز ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستانی ہیروئن کے سوداگروں ہی نے امسٹرڈیم سے عبدالقادر سائنس داں کے ذریعے ایٹم بم بنانے کا نسخہ پار کروایا اور حکومت تک پہنچایا۔ دوبئی ٹیلی ویژن پر تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر ہیروئن کے کاروبار کرنے والے سربراہ کی پرائیویٹ فوج کو مسلح پریڈ کرتے اور خطرناک دھندے کو چلاتے دیکھا اور اس فوج میں ۱۲ سے لے کر ۱۸ سال تک کے بچے بھی وردی پہنے شامل تھے۔ یہ اسمگلر اور اس کی فوج برما میں کمیونسٹ انقلابیوں کو کچلنے کے لیے بھی کام آتی ہے اور خود حکومت برما اور امریکی سلطنت اس سے ساز باز کرتی ہیں۔

چنانچہ ادب کیا چیز ہے زندگی پر اسمگلروں اور ہیروئن کے شہنشاہوں کی حکمرانی ہے۔ حکومتوں کو دولت اور غنڈے چاہئیں اور ان دونوں کا انتظام

انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ فتل ہائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور رشوت ستانی اور ضمیر کی خریداری عام ہے۔ ظلم گولڈ فادر (GODFATHER) کی قسطیں افسانہ نہیں حقیقت کی محض ادھوری سی جھلک ہیں ۔ ۔ ۔ اس لیے زندہ رہنا ہے تو مافیا سے معاملہ کرو ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ۔

لندن میں نعیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اردو کو کب تک حسن و عشق، سیاست اور انقلاب تک محدود رکھو گے، رسالے ہیں تو محض ادبی اخبار ہیں تو ان پر مذہب اور سیاست کا سایہ، آج دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے اور اردو والوں کو۔ اس کی اطلاع خاص کی طرف توجہ، حد یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین تک رسائی حاصل کرنے کے وسیلے بھی نہیں۔ سائنس کو اہل اردو والوں نے منہ ہی نہیں لگایا ہے۔ یوں بھی مجموعی طور پر ہم ماضی اور ادبیات کی رومانیت میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ حال اور مستقبل کے نئے سائنسی تقاضوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ سائنس اور سائنسی فکر سے اردو والے اپنی مشعلوں کے لیے نیا اجالا حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ "عصری ادب" کو اس باب میں کیا کرنا چاہیے؟

محمد حسن

رخصت ہونے والوں کو سلام عقیدت

مسٹر جناب میکش اکبرآبادی، استاد بلال احمد خاں، ڈاکٹر ظ انصاری، انور حسن نعیم، سراج انور، جلد عزیز مدنی، شعری بھوپالی، ساجد الہ آبادی، حسن شاہ، ماہ [illegible] اختر، خاور، کیف بھوپالی ہم سے رخصت ہو گئے۔ ادارہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور انھیں سلام عقیدت پیش کرتا ہے۔

ادارہ

آڑے ترچھے آئینے

خوشامدانہ ادب کا عروج

ایک اہم حادثہ ہوا بلکہ پچھلے بیس سال سے برابر ہو رہا ہے جانے انجانے اور اب تو یہ حادثہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ہمارے ذہنی اور جذباتی عمل کا حصہ بنتا جاتا ہے ستم یہ ہے کہ یہ حادثہ نہ تو صرف اردو ادب تک محدود ہے نہ محض ہندستان تک ـــــ کہ اس کا دائرہ سرطان کی طرح بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔

یہ حادثہ ہے ـــــ خوشامدانہ ادب کا عروج۔

اب اگر کوئی کہے کہ صاحب، میر، سودا، غالب اور ذوق نے بھی شاہوں کے قصیدے لکھے اور ایسے ایسے بادشاہوں کو رستم و افراسیاب سے آگے بڑھا دیا جنھیں زندگی بھر تلوار پکڑنی اور میدان جنگ کی زیارت کرنی بھی میسر نہ ہوئی تھی، تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس دور میں یہ طبقاتی شعور تھا نہ یہ انقلابی فکر اور نہ جمہور کی یہ اہمیت۔

ہمارے آپ کے دور میں جب شاعر اور ادیب کے لیے نوابوں، راجاؤں اور اہل اقتدار کی فوری اور عملی سرپرستی کم سے کم ناگزیر نہیں رہ گئی ہے یہ دلیل سند نہیں ہو سکتی بے شک اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی سیاسی رہنما کسی صدر ریاست، کسی وزیر اعظم یا کسی صاحب اقتدار کی شخصیت اور اس کے کارناموں سے واقعی متاثر ہوتا ہے یا ان کا ہم خیال ہے یا ان سے نظریاتی ہم آہنگی رکھتا ہے تو اسے بے شک یہ حق حاصل ہے کہ ان کا قصیدہ لکھے یا ان کی شان میں مضامین تحریر کرے لیکن یہ کام محض مطلب براری کے لیے خوشامد کے طور پر کیا جاتا ہے تو ادب اور ادب دونوں کے لیے شرمناک ہے

یہ ہیں کہ بیماری آزادی سے پہلے ہندستان میں موجود نہ ہو، حفیظ جالندھری
میں تو جھوٹے کو بھرتی کرلے آتی ہے، کہ چکے تھے ان کی معاشی مجبوری تھی مگر
بہوال انگریز وائسرائے کا کوئی قصیدہ نہیں لکھا تھا دبا کی شکل اس بیماری نے آزادی
کے بعد ہی حاصل کی

گاندھی جی تو کبھی اقتدار میں رہے نہیں، جواہر لعل نہرو یوں بھی ایک زمانے میں
بوب رہنما تھے آزادی کے بعد ہندستان کے وزیر اعظم بنے تو کچھ شاعروں نے بطور
عقیدت یا بطور مہم خیالی کے بھی ان پر نظمیں لکھیں مگر زیادہ نہیں۔ پھر جب ترقی پسندوں
میں بھی نہرو پرستی کی وبا پھیلے لگی اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور پامیلا ماؤنٹ بیٹن اور
جواہر لعل کے رہا وسط پر فدا کرنے والے سردار جعفری تک جواہر لعل کا قصیدہ لکھنے لگے

دختر دشمن جمہور کا بھیجے بوسہ
اور اس کو صدۂ خون شہیداں کہیے

تو یہ وبا عام ہو گئی۔ فیض صرف ہیں تو جواہر لعل کی مدح و ستائش کی بنیاد
نظر آتی تھی مگر دھیرے دھیرے دوسرے کانگریسی لیڈروں تک جا پہنچی اور ہر قسم
کا وزیر اعلیٰ یا کانگریسی رہنما اس طرح کی مدح سرائی کا مستحق ٹھہرا۔ کتابوں کی اجرا کی رسم
ہو تو وزیر بلائے جانے لگے یا ماشے تولے کے سیاسی لیڈر جن بچاروں کو رفیع احمد
محرومی اور محروم کو کار کا فرق تک معلوم نہیں جنھوں نے زندگی میں کبھی غالب کا
نام سنا نہ اقبال کا وہ ادبی مذاکروں کی صدارت اور ان کا افتتاح کرنے لگے اور جھوم
جھوم کر اردو کو بیٹی اور پیاری زبان ہونے کا سرٹیفکٹ عطا کرنے لگے اور واپس
دفتر پہنچ کر اردو کشی کے مقدس فرض انجام دیتے رہے۔

پھر ہوا گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، پولیس افسر، انکم ٹیکس کے کارگزار سب
فضل و کرم سے آقائے ولی نعمت ٹھہرے۔ اگر کسی کو خوش قسمتی سے دو جملے اردو کے
لکھنے آتے تھے یا شعر موزوں کرنے کی صلاحیت تھی تو وہ محمد حسین آزاد اور غالب سے
بھی آگے گیا اور اردو کا باوا آدم اور سرپرست اعلیٰ قرار دے دیا گیا کوئی یہ کہنے والا بھی

بھی نہیں رہ گیا کہ بھیا، تو ڈھنگ سے اشتری کر، مجھے ادب سے کیا کام!

خیر یہ بھی زیادہ قابل اعتراض نہیں، کمال تو یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اس منزل تک جا پہنچے کہ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے اور لگے آواز لگانے، کہ کوئی خوشامد کرا لو کوئی بھٹئی کرا لو۔ اس راستے میں آگئے بہت سے پڑاؤ، اردو اکادمیاں ہی نہیں حکومتوں کے انعام و اکرام، راجیہ سبھا کی رکنیت، باہر کے سفر اور دورے، عہدے، تقررات، گرانٹ، مفت کے مکانات؛ دھیرے دھیرے غیرت فن چھنتی گئی اور خوشامدانہ کلچر عروج پاتا گیا اور اس نے اس حد تک ترقی کی کہ نظریہ اور خیال، اعمال و افکار سب باطل ہو گئے، اپنا تو مسجود محض کرسی ہے جو اس پر بیٹھا ہے اسی کے گیت گانا ہے۔ شاعر اور ادیب اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کے مجموعہ کلام کا اجرا فلاں صدر، نائب صدر، وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ یا گورنر نے کیا یا اس قسم کی کسی تقریب میں بلا کر انھوں نے کسی صاحب اقتدار سے گرانٹ لے لی یا کسی کالونی کے لیے زمین حاصل کر لی ـــــ غرض ادب بے آبرو ہوا، فکر ذلیل ہوئی اور اہل فن رسوا ہوئے۔ ایک زمانے میں غالب نے کہا تھا جی ہاں اسی غالب نے جس نے بہادر شاہ ظفر سے ملکہ وکٹوریہ تک کا قصیدہ لکھا ہے اور لکھنؤ کے امجد علی شاہ کے نام کا قصیدہ باپ کا نام کاٹ کر بیٹے واجد علی شاہ کے نام کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ اہل اقتدار کی بے دفری اور کیا ہو گی۔)

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز

مگر اب یہ رسوائی بھی ہوئی تھی کہ القاب اور خطابات، عہدے اور مصلحتوں کی نہیں، انسان کی امید اور ارمان کی صلیب پر غیرت فن چڑھائی جانے اور خوشامد کا دستور بن گئی۔

پھر دور آیا ایمرجنسی کا جب اندرا گاندھی نے ملک کو دستور زباں بندی دیا۔ زباں بندی کیسی؟ زبان تو آزاد تھی شرط تھی تو صرف اتنی کہ اس سے حکومت کی تعریف کے جملے اور مصرعے ہی نکلیں ورنہ قلم کر دی جائے گی اور شوشنگ

ات یہ ہے کہ ادیبوں میں بہت کم تھے جن کی زبانیں کم سے کم خاموش ہی رہی ہوں، پھر خطابات تھے جن کے طوق اچھے اچھوں کی گردنوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ دوسرے ہر گروہ کی طرح ایک بار ساحر لدھیانوی نے جاں نثار اختر سے کہا

"اب تو تمہیں پدم شری مل جانا چاہیے۔"

جاں نثار اختر نے معصومیت سے پوچھا "کیوں، خیر تو ہے؟"

ساحر نے جواب دیا "اب ہم سے یہ ذلت اکیلے برداشت نہیں ہوتی۔"

حد یہ ہو گئی کہ اب کسی ادیب کو کچھ لکھتے یا کسی کو کہتے، دیکھتے یا سنتے ہیں تو پہلی بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ آخر کس مصلحت سے یا کس عہدے یا اعزاز کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ گمان صحیح بھی نکلتا ہے کہ یہ کچھ اس طرح ہماری رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا ہے کہ فن محض ایک ضمنی بہانہ سا ہو کر رہ گیا ہے اور اصل مقصد اس کے ذریعے کچھ حاصل کرنا ہوتا جا رہا ہے۔

ایک سوال جو اکثر ادیبوں کے ہونٹوں پر جانے انجانے میں آ جاتا ہے، یہ ہے کہ اتنے سال سے ادب کی خدمت کرتا آ رہا ہوں آخر مجھے اس سے کیا حاصل ہوا؟ مراد ہے کوئی اعزاز، کوئی انعام، کوئی عہدہ، کوئی وظیفہ، رقم، کوئی اعتراف خدمات کا سرٹیفکٹ۔ اس سوال کے سوقیانہ پن پر غور کرنے کی مہلت چاروں طرف پھیلا ہوا خوشامدانہ کلچر انہیں نہیں دیتا۔ کیا فن اپنا خود انعام نہیں ہے یا طبیعت فن اتنی سستی ہے کہ معمولی سے منافع کی خاطر صلیب پر چڑھا دی جائے اور اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ایسی گھٹیا چیز کے لیے زندگی جیسی متاع بے بہا وقف کرنا محض حماقت ہی تو ہے۔

حکومت بدل گئی، اندرا جی چلی گئیں، ان کے بیٹے کی حکومت ختم ہوئی ان کی پارٹی کی حکومت کا سورج غروب ہو گیا۔ مگر خوشامدیوں کی کرتب بازیاں نہ گئیں۔ عام یادداشت کمزور ہوتی ہے وی پی سنگھ کی حکومت نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو اتنا ضرور کیا کہ سیاست کو ایک شخصیت کے گرد گھومنے سے بچا لیا

کل تک ہر غیرت مند ہندوستانی مجبور تھا کہ ایک ناتجربہ کار لڑکے کے وعظ و نصیحت سنے اور اس کی ہاں میں ہاں ملائے۔ ٹی وی پر ہر ہندو منسٹر میں اسے اس کے کسی مقولے کو یا اس کے کسی بچے کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھے، ریڈیو پر اس کے بتائے ہوئے پروگرام اس کے خوشامدیوں کے ذریعے پیش کیے جائیں اور سنے جائیں۔ رتنا کر پانڈے اور کے کے تیواڑی (اور ان دنوں ایم جے اکبر) جیسے کھلے ماں خوشامد کرنے والے بالکل بے لگام ہوں اور عام آدمی ان کی بے تکی باتوں پر سر ہلائے جس کا جی چاہے اس کی زبان کھینچ لیں اور جس پروگرام کو چاہیں (مثلاً بوند بوند سیریل) اس کو بالکل آخری وقت میں بھی ٹیلی ویژن پر پیش ہونے سے رکوا دیں۔ وی پی سنگھ نے سیاست کو ہیرو بنانے کے تماشے کے بجائے مسائل حل کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔ مگر خوشامدیوں کی پوری فوج ابھی مایوس نہیں ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ وی پی سنگھ کے گرد جمع ہو جائے اور ان کی شاعری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے یا پھر ان کی مصوری کے کمال کو پاتال سے اور وہاں گو سے جا ملائے۔ ان خوشامدیوں کی فوج کی بہت رسائی ہوئی ہے تو گجرال صاحب تک۔ ان کو جامعہ اردو دکتور الادب کی ڈگری دیتا ہے، دلی اردو اکادمی ان کے اعزاز میں جلسے کرتی ہے۔ کبھی کسی اور ترکیب سے انھیں رجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ خوشامدی ان کے گرد اپنا جال پھیلا سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ گجرال صاحب اس جال سے اور جال پھیلانے والوں، دونوں سے ہوشیار رہیں گے اور دام میں نہیں پھنسیں گے۔ مگر اس سے خوشامدانہ کلچر کے زندہ رہنے اور نئی کروٹ لینے کا ثبوت تو ملتا ہی ہے۔ نرسمہا راؤ حکومت [illegible] خوشامد [illegible]

اور سب سے غیرتی، یہ خوشامد اور کرتب بازی، علم و دانش اور شعر و ادب کے لیے مہلک ہے۔ پہلے ضمیر کی خریداری کی شکل کچھ اور تھی، اب کوئی خریدے یا نہ خریدے خوشامدی ادیبوں کو ایسی عادت ہو گئی ہے کہ بہاروں کے دن پت جھڑ کی راتیں ہیں۔ پاکستان کا ذکر یہاں کرنا بے محل ہوگا کہ وہاں تو خیر سے آمریت اور فوجی

حکومت کا بول بالا رہا ہے البتہ وہاں کے جمہور فروخت شدہ اور فروختنی ادیبوں
کو ہمارے یہاں سے کہیں زیادہ پہچانتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں کے ایک مقتدر اور
مستند ادیب نے کراچی سے بذریعہ طیارہ جا کر سرکاری ادبی انجمن کے جلسے میں بذاتہٖ
صبا الحق شرکت کی تھی۔ اس واقعے سے مستند ادیبوں میں بے دلی پھیلی
اور جب کراچی پریس کلب میں انقلابی شاعر حبیب جالب کے اعزاز میں جلسہ
ہوا تو ہمارے ان مقتدر ادیب کے بیٹھنے کے لیے کسی نے بھی اپنی کرسی خالی نہیں
کی۔ یہ اس ضمیر فروش کی سزا تھی۔ ہندستان میں بھی بیدار جمہوری ضمیر کو خوشامدی
ادیبوں سے کسی نہ کسی طریقے سے کم از کم اپنی برأت کا اظہار تو کرنا ہی چاہیے کہ یہ
ادب کے سب سے بڑے نقب زن ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے ادیب ہی نہیں (کہ وہ ملک کی تہذیبی امانت اور
ان کے صورت گر ہوتے ہیں) ہمارا ادب بھی عرصۂ زیست پر نظر ڈالے تو
تنوک چند محروم کے لفظوں میں یہ شکوہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ عہدِ جوانی گدھوں
کو سلام کرنے اور کتوں کا ادب و احترام کرنے میں گزر گیا ؎

شرفم بعہد پیری چہ بود کہ در جوانی
بسگاں ادب نمودن بخراں سلام کردن

آئندہ شمارے کی ایک جھلک

[illegible]

محمد حسن

ست رنگے لمحوں کا تاجدار مشتاق احمد یوسفی

اردو نثر نے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وجہی، غالب، سرور اور مرزا رجب علی سے قطع نظر کیجیے سرسید احمد خاں کی سادگی سے نظریں چرا لیجیے پھر بھی محمد حسین آزاد کے اسلوب کے شکوہ ابوالکلام آزاد کی پتھروں کو پہلے جانے والی نثر اور رشید احمد صدیقی کی کیفیت زائی سے کیسے منہ موڑ لیں گے کہ انھوں نے نثر کو آرٹ بنا دیا اور لفظوں میں وہ توانائی رنگارنگی اور قزمیت پیدا کر دی کہ ہر جملے کے ساتھ جیسے آسمان پر ست رنگی دھنک جگمگا اٹھتی ہو۔

بے شک جدید دور بھی بقدر استطاعت اپنی کہکشاؤں سے خالی نہ تھا۔ رشید احمد صدیقی، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کی نثر کا ذکر نہیں کرتا گو ان میں سے ہر ایک نے وہ طرز و اسلوب نکالا کہ نثر کو نئی بالیدگی، روانی اور بکلاہی ملی۔ جدید دور میں آل احمد سرور، خورشید الاسلام، ظ انصاری اور قاضی عبدالستار کے جملوں نے ہندستان میں اور ابن انشا کی تحریروں نے پاکستان میں اردو نثر کو ایسا سجایا سنوارا بنایا کہ اس میں ایک جہان معنی سمٹ آیا اور جملے بجائے لفظوں پر صاحب تحریر کی مہر ثبت ہو گئی، ہر ایک اسلوب جداگانہ کہ ہر لفظ لکھنے والے کی ذات پات اور شخصیت کی گواہی دے وہ بھی ایسی بلند آہنگی سے جیسے سیاگرا کا آبشار گر رہا ہو۔

مگر اس سب کے باوجود حق یہ ہے کہ جدید نثر کے بے تاج بادشاہ مشتاق احمد یوسفی ہی قرار پاتے ہیں۔ اردو نثر کو جو تہہ داری، بلاغت، دردمندی اور کیفیت آفرینی کی قوت

یوسفی کی تحریروں سے ہی اس کی نظیر کم سے کم اردو کی ادبی تاریخ میں موجود نہیں تفصیل میں کی طوالت عیب بھی ہے اور شاید ناممکن بھی کہ اچھا نثری اسلوب بقول رشید احمد صدیقی آرکسٹرا کی موسیقی ہے اور اگر کوئی آرکسٹرا کے کس کس ساز کی اور اس ساز کے کس کس سُر کے لحاظ بیان کرے اور کرے بھی تو کب تک؟ یہ تو ایک کیفیت ہے کہ لفظوں سے پیدا ہوتی ہے۔ جملوں میں پھیلتی اور انگڑائی لیتے چلی جاتی ہے کبھی پیراگراف اور مضمون بن جاتی ہے۔ کبھی قصے کی پھلواری سجاتی ہے اور کردار کے باغ و بہار کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یوسفی کی نثر کو اس سارے انداز و اسلوب کو اپنے ڈھنگ سے برتنے پر پورا اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ یوسفی کا قلم چاہے تو ہنسا کے مار ڈالے اور چاہے تو عین اس وقت جب قہقہہ پوری طرح ختم بھی نہ ہوا ہو لفظوں کو وہ موڑ دے کہ آنکھیں اشکبار ہو جائیں دل درد سے دو نیم ہو کر رہ جائے یہ قدرت قضا و قدر کے علاوہ کم کسی کو نصیب ہوئی ہے۔

پیدائش ہندوستان کی ریاست راجستھان کے علاقہ ٹونک و اڑ کی ہے جو بقول خود ان

ے تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش کی تحقیق واجب تھی یوسفی صاحب سے بار بار درخواست کی کہ کم سے کم کوائف ذاتی کی فراہمی میں تعاون کریں۔ مگر ہم نہ کہا یا، دیگر ذرائع سے تحقیق کی جرأت اس لیے نہیں کرتا کہ محققین کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے۔

"ملک خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونڈنے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیے۔ اول اس موقعہ پر جب دونوں میں سے ایک وفات پا چکا ہو دوسرے اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک اردو نقاد ہو جس پر تحریر ڈھونڈنا فرض ہی نہیں ذریعہ معاش اور وجہ شہرت بھی ہو۔" (آب گم ص ۱۵۲)

ویسے نقادوں کے بارے میں بھی ان کی رائے اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔

"بکری اس غرض سے پالتے ہیں کہ اس کی مینگنی میں دودھ ملا کر جوانا اردو نقادوں کو پلائیں گے۔" ص ۲۰۳

مگر کیا کیں مرزا غالب نے ایسے موقعوں ہی کے لیے تو کہا تھا، گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے اونٹ پشماں اور مہدی حسن کے لیے مشہور ہے۔ سن بھی کوئی ۶۴-۶۵ کا ہوگا جس سے تقیین ان کا سال پیدائش نکال سکتے ہیں (کیونکہ اپنی خود نوشت سوانح عمری "گزشتہ" لکھنے کے باوجود اپنے حالات زندگی کی تدوین میں کسی قسم کا تعاون کرنے سے سختی کے ساتھ گریزاں ہیں) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں زیر تعلیم رہے اور اس کے باوجود حس مزاح بچا کے لے آئے (ایم اے او کالج کی بات دوسری تھی جس نے رشید احمد صدیقی کو پیدا کیا تھا) پاکستان بنا تو پہلے وہاں پھر لندن میں بقول ان کے کوچہ سود خواراں یعنی

حاشیہ گذشتہ سے آگے ۔ بہر حال ان کی تحریر سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

"آپ نے راجستھان میں جہاں آپ نے جوانی گنوائی اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پر کلغدار (جیوتی) ماتھے پر چلمنیاں (ڈلیاں) دس فٹ لمبی نال والی توڑے دار بندوقیں بھی ہوتی ہیں اونچے کندھے پر کھی ملکی کے سرے پر تیس پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جوتے لگائے ہاتھی میں سنگے پیر جاٹ۔ گھوڑا تو آپ نے پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الٰہی گواہ ہیں انہی کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصہ سنایا تھا جو مہاراجہ کی شتر بان پلٹن میں رسالدار تھے جب ریٹائر ہو کر اپنے آبائی قصبے، کیا نام تھا اس کا۔۔ ۔۔اودے پور تو راوائی پہنچے تو اپنی گڑھی میں ملاقاتیوں کے لیے دس بارہ مونڈھے ڈلوا دیے اور اپنے لیے اپنے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا پرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی پلٹن کا شنگرفی رنگ کا صافہ باندھے سینے پر تمغے سجائے صبح سے شام تک بیٹھے ملتے رہتے۔ ایک دن ہل ہل کر جنگ بہادر کے کارنامے بیان کر رہے تھے اور میڈل چھن چھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ کجاوے پر ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے عودی سفر پر روانہ ہو گیا۔

ے خود نوشت سوانح عمری میں یوسفی لارڈ کوٹل کے ہم خیال ہیں جو ٹریفلی کالج آکسفورڈ کا صدر بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیئرمین ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں خود نوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں۔

یوسفی کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔ عاجز اس کی ذہانت پر مستزاد عش عش کرتا رہا کہ گزشتہ بیس برس میں اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا جو ابھی کی ظرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں؟ ۔

[illegible] ہیں۔ [illegible] کے آپریشن کے بعد اب چار پانچ آف کرٹیٹ اینڈ [illegible] سے سکہ رائج حاصل کر کے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ چار کتابوں کے مصنف [illegible] کو شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہیں، چراغ تلے، مخاکم، [illegible] اور اب کوئی اور ـــــ اور اب تازہ تصنیف "آب گم"

یوسفی کا جو طنز ہلکا پھلکا کر کے کرنا چاہتا ہے وہ اردو نثر کے ساتھ ساتھ خود اپنے سے بھی بے انصافی کرتا ہے کیونکہ اس طنز یا مزاح کے پیٹے میں عصر حاضر کی ساری حسیت اور دانش وری اس طرح سمٹ آئی ہے جیسے لیسن اور برنارڈ شا کے طربیوں میں آفاقی حیات اور بڑی محرومی ہوگی اگر کوئی اس تہہ دار اور خیال انگیز نثر کو محض لطیفہ نیز کچھ پر قناعت کرے اور ہنسی ہنسی میں ٹال دے۔ یہ ٹلنے والی نثر نہیں، یہ چک جانے والی اور رگ و پے میں اتر جانے والی نثر ہے۔ یہ احساس سے ہوتی ہے اور فکر و دانش کو اپنی گرفت میں لیتی چلی جاتی ہے۔

یوسفی کی ابھی تک چار تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ ابھی بہت سے مضامین اور کتابوں کے مسودے درازوں میں اور آستینوں میں چھپائے ہوں گے اور ان کی جگالی کرتے ہوں گے یا ان کو طفیل کسی عربی شاعر کے دیکھی کے بچے کو رسمی کی طرح چاٹتے ہوں گے کہ اجال لیں تو ساٹ لائیں۔ قباحت ان کی کتابوں کے بارے میں یہ ہے کہ ان کی ہر کتاب کا حال ان کے مضمون کی عفیفہ (کتیا) کا سا ہے جو ہاتھ آئے تو بھی بھونکنے والوں کے لیے اتنی اشتیاق انگیز ثابت ہوتی ہے کہ چند ہی دن میں ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے تاکہ مغویہ مذکورہ کو کوئی دوسرا اغوا کنندہ نہ مل جائے۔ حاصل مطلب یہ کہ جب یوسفی پر کچھ لکھا جاتا ہو اور ارد گرد نظر ڈالو تو معلوم ہوتا ہے سوائے یادداشت اور "آب گم" کے سب تصانیف گم ہیں ویسے رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے غلط شعر پڑھنے کا جواز ہی یہ پیش کیا تھا کہ اچھا شعر وہ ہے جس کے الفاظ بھول جائیں اور کیفیت خوشبو کی طرح یادوں میں مہکتی رہ جائے خیر قصہ مختصر مجبوراً

ساری بحث "آب گم" کے حوالے ہی سے ہوگی اس لیے کہ باقی تصانیف تو فضلاء کے قبضے میں ہیں اور یوں بھی کہ "آب گم" بہرحال تازہ ترین تصنیف ہے جس میں یوسفی کی سبھی ادائیں دو آتشہ، سہ آتشہ ہو کر سامنے آئی ہیں۔

بے شک یوسفی نے طنز و مزاح کے مضامین سے سفر تحریر شروع کیا اور جملوں کی ساخت پر رشید احمد صدیقی اور سجاد حیدر دونوں کے اثرات مدتوں نمایاں رہے پھر اس پر اضافہ ہوا فکری تہہ داری کا اور افتاد طبع کا درد مندی کائنات کی آگہی کا اور ان تینوں کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے جملوں کی کونٹھیاں تیار کیں کردار اور قصے کی، شروع ہی سے پطرس بخاری کے مضمون "مرحوم کی یاد میں" کے مرزا صاحب کو انھوں نے بڑا بھاری بھرکم اور حسب حیثیت نام مرزا عبدالودود بیگ دے کر "آب گم" کے ایک چھینٹے سے زندہ کر لیا اور ان پر دانائی، دانش مندی اور فراست کی سبھی کنایہ شاہ کار لٹکا دیے (آخر وہ بھی ایک کھونٹی ہی تو تھے یوسفی کے خیالات کی) اور پھر اس میں اضافہ کیا اس درد مندی کا جس کی جیتی جاگتی مثال (غالباً چراغ تلے میں) کتابیں ہے سارے طنز و مزاح کا بوجھ اٹھاتا ہے اور آخر کار پڑھنے والے کی آنکھوں کو نم چھوڑ کر چلا جاتا ہے اس سے واقعہ طرازی کی شروعات ہوئی۔

"زرگزشت" میں تو کچھ زیادہ کرنا نہیں پڑا خود اپنے اوپر اور اپنے ارد گرد کے دوستوں دشمنوں ہی پر مشق جفا کرنی تھی سو کی جس میں ان کے چینک کا انگریز افسر بھی شامل تھا باہر سے سخت اندر سے نرم اور خود ان کی اپنی ذات بھی مگر "آب گم" میں یہ داستان اتنی بے منطق نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء آیا ایک ملک کے دو ملک اور پھر دو کے تین ملک بن گئے کروڑوں بے اجل ہوئے کچھ کرپان اور تلوار سے مرے، کچھ غم و اندوہ سے کچھ لٹے اور برباد و تباہ ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچے، وطن سے بے وطن ہوئے اور اپنے وطن کو اجنبی دیس اور اجنبیوں کو ہم وطن کہنے لگے، آدمی گھٹا مگر اس سے کہیں زیادہ اس کے اندر کا سرمایہ گھٹا

"آب گم" میں بڑی چابکدستی سے ۱۹۴۷ء کے "تہذیبی المیے" کے اس سارے اکٹھ پھیر کو پانچ مضامین اور پانچ کرداروں کے وسیلے سے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس طرح کہ از اول تا آخر پڑھنے والے کے لبوں پر قہقہہ آنکھوں میں آنسو اور دل میں دھڑکا رہے کہ یوسفی سیدھی راہ چلتے چلتے نہ جانے کس موڑ مڑ جائیں

ایک ہیں میاں بشارت، کہ اصلاً کانپوری ہیں اور تقسیم ہندوستان کے ریلے میں ہندوستان سے پاکستان کی راہ لیتے ہیں گویا معروف اصطلاح میں مہاجر ہیں، دوسرے ہیں ان کے خسر کہ ان پر بھی یہی گزری ہے مگر دل کی غمیں جب وہ ہندوستان میں اپنا سب اس طرح جما چکے تھے کہ جس کو چاہے بلی پر لٹکا دیں، تیسرے ہیں بشارت کے میاں عزیز خاں صاحب جنھوں نے کبھی ہندوستان کی شکل نہیں دیکھی اور بقول خود ان کے اپنی رقم کی وصولیابی کے لیے بشارت کے یہاں سیدھے پشاور سے آ دھمکے تھے اور چوتھے ہیں ملا عامی بھکشو جو گویا ہندوستان میں رہنے بسنے والے مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں گویا "آب گم" داستان ہے زبانی اس مہاجر کی جو یہاں سے رہتے بستے پاکستان چلا گیا تھا۔ ایک باب اس بارے میں ہے کہ یہاں اس پر کیا گزر رہی تھی (دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ) دوسرا باب اس بارے میں کہ پاکستان میں اس پر کیا بیتی (حویلی)، تیسرا اس باب میں کہ اس کی وہاں کے آبائی رہنے والوں سے کیسی بنی یا ان کی تہذیبی شخصیت سے اس کی میزان بیٹھی (کار۔ کابلی والا اور الہ دین بے چراغ) اور چوتھا باب اس بارے میں کہ جب میاں بشارت یاد وطن سے بے قرار ہو کر واپس کانپور پہنچے تو انھوں نے اس نگر کو کیسا پایا جو کبھی ان کا اپنا دیار تھا۔ (شہر دو قصہ) گویا چار پانچ مضامین میں یوسفی نے پورے برعظم کے تہذیبی المیے کو گٹھری بھر میں موزے کی طرح الٹ کے رکھ دیا کہ طنز اور دردمندی کی خاصیت گرم ہوتی ہے۔ (ص ۱۷۰)

اس اکٹھ پھیر میں صرف زندہ اور مردہ انسانوں کے کردار ہی کام نہیں آئے ہیں سب سے دلدوز کہانی جانوروں نے رقم کی ہے اور ان میں سرفہرست ہے

بلین نام کا ایک لنگڑا گھوڑا اور ویلزی لقب پانے والا ایک بازار و کتا دکھنے کا اسباب پھر پطرس کے اثر کی یاد دلاتا ہے جن کے ایک مضمون کتے نے اسے غیر فانی کر دیا گو یہاں بھی یوسفی کتے کی دریافت میں بہت آگے تک گئے ہیں۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی کے خاکے "کندن" کی گونج یوسفی کے اسکول کے گھنٹہ بجانے والے ریٹائرڈ چپراسی بشیر چاچا کے یہاں صاف سنائی دیتی ہے۔ ص ۲۹۲

"یکہ" کا بیان بھی اسی قبیل کی اثر پذیری ہے۔ ص ۲۷۵۔ مگر گھوڑے اور کتے کے ضمن میں جن بلاغتوں کے ساتھ یوسفی تاریخ سے لے کر عمرانیات تک اور شاعری سے لے کر فلسفے تک کی ست رنگی کا تانتیں اجالتے چلے جاتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے مثلاً کتے کے بارے میں یہ خیال کہ

> "برصغیر کے کتے سو سال تک سلطان (ٹیپو) شہید کے نام سے پکارے جاتے رہے کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آرائش، عقوبت مطہرہ اور شہادت عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی رب جلیل انھیں شہادت جاوید کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔" ص ۲۴۰

اور اسی ترنگ میں اس لینڈی کتے کا نام ویلزی رکھنا تاریخ کے کتنے ورق ایک ساتھ الٹ دیتا ہے۔ اسی راستے سے ہوتے ہوئے وہ پورے برعظم کی تشخیص مرض تک پہنچتے ہیں:

> "غور کیجیے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل دین ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پس ماندہ اور پست حوصلہ ہو اس کو اپنا ماضی معکوس اقلیدسی تناسب میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے ہر آزمائش اور ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب رجوع ہوتی ہے اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتہً تھا بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق اس نے از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ ماضی تمنائی، اس پاستان طلبی

جس میں منظر میں بھروسہ اتنا کافی سی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط
اپنا ناچ ہی نہیں عقل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔" (ص ۲)

قوموں کی بھروسہ اتنا کی ان پناہ گاہوں کے سراغ یوسفی کی تحریروں میں ملیں گے مگر اس بار "آب گم" میں یہ سراغ کچھ زیادہ واشگاف طور پر موجود ہیں ان میں ایک ہے یوسفی کے لئے پاک یا متبنیٰ وطن پاکستان میں فوجی آمریت کے "دورِ ضیاع" کا ذکر جو بڑی خوبی سے تحریر میں در آیا ہے اور شاید ان مضامین کی پہلی اور آخری معاصر شہادت (زمانی) ہے۔ یاد رہے کہ صورت حال محض پاکستان تک محدود نہیں کسی بھی ملک پر یہ اقتدار پڑ سکتی ہے بلکہ پڑتی رہتی ہے کبھی کبھی ان ملکوں پر بھی جہاں فوجی حکمراں نہیں، آمریت البتہ حکمراں ہے۔

"لیڈر، خود غرض، خاصا مصلحت بین، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم، دلفریب اور خوشامدی اور لالچی ـــــ کھوکھلے ہو جائیں تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے پھر کوئی طالع آزما آمر ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے ... ... ڈکٹیٹر خود نہیں آتا بلایا اور بلایا جاتا ہے اور جب آ جاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے باہر نکال باہر کرتا ہے باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں..... انصاف کی خود ساختہ ترازو کے اوپر نیچے پلڑوں کو اپنی تلوار کا پاسنگ کبھی اس پلڑے اور کبھی اس پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے۔ ع

ہر کہ آمد عدالت نو ساخت" ص ۱۵-۱۶

صرف بعد کو دو دیگر (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور آخر میں اتنی ہی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے

میں اپنے کان پکڑتے ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے ہوں تو
جب اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے رجیم سے یہی REGIME مراد ہے لعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ" ص ۳۶
اور اب اس بھی سجائی غزل کا بیت الغزل ملاحظہ ہو بقول غالب ع

دیکھ مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پھر جیسے جیسے امور سلطنت پر وفور تمکنت اور ہوس حکمرانی غالب
آتی ہے۔ آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے
نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے اور جو اس کے
دست آہن پوش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ
کی زمین کا رزق اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت
دیتا ہے۔

ادیبوں اور تلامیذ الرحمٰن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ
لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں اور یہ جانتا
ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور
قبیلہ ہوتا ہے جسے سائی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق
کرواتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں مطلب
یہ کہ جس کا جی چاہے جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے قطعاً کوئی
روک ٹوک نہیں بلکہ وزن، بحر اور عقل سے بھی خارج ہو تب بھی ہم
خارج نہیں ہوں گے۔" ص ۳۶

کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اتنے عادی
ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہ کر دجالی

ے زوال ہندوستان میں راجیو گاندھی کے زوال کے بعد کی صورت حال نظر میں ہے۔ (م۔ع)

پھر کبھی اور کوشش سے نکل نہ سکے کبھی کسی نے کوئی بھرے زبردستی کھڑا کرنا
چاہا بھی تو معلوم ہو کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے
ہیں اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی و غیر منصبی حالت بجود
ہی میں ادا کرنے کے عادی و خوگر ہو گئے ہیں۔" ص ۱۶۰

اس مضمون آتا جاتا انگیز اور انداز بیان ایسا بانے جانے والا کہ پڑھنے والے
کے شاید نشان زدہ الفاظ کے ذریعے ادا ہونے والے موثر بھیر، ادبی رنگینی اور ہمہ جہتی پر
غور بھی نہیں کیا ہوگا۔ یہ الفاظ کے سنے خاں کی دریافت کا ذکر آگے آئے گا، یہاں
صرف نشان دہی مقصود ہے)

لیکن اس امیر فروشی اور مافی الضمیر فروشی سے بڑا بھی ایک حادثہ ہوا، وہ ہے پورے
برصغیر کے ملکوں کی اپنی تہذیبی وراثت سے محرومی جسے سیاست نے کبھی مذہب کے
نام پر یا کسی علاقے کے نام پر تاراج کیا اور جو وراثت صدیوں نے ساری تقسیموں
کی سرحدوں پر سلائی تھی وہ اسی روایتی بچے کی طرح تکا بوٹی ہو کر رہ گئی جس کی ماں ہونے
کا دعویٰ دو عورتوں نے کیا تھا۔ یوسفی اس تکا بوٹی ہونے والے بچے کے دادگیر ہیں
کہ کم اس کے بیان کی آنکھوں میں آنسو ہیں جس کے لیے ہر آنکھ پتھر کی ہو چکی ہے
گو وہ آداب عرض کے مشترک طرز تسلیم سے خفا ہیں (ص ۲۲۲) اور کمیونسٹوں اور انقلابیوں
سے کبیدہ خاطر (ص ۱۸۲) مگر پھر بھی اس صدیوں کی کمائی سے روگردانی نہیں جس پر
کسی ایک فرقے کا اجارہ نہیں۔ شاید کسی ایک علاقے کا بھی نہیں اور جسے ہندوستان کے ہندو
اور پاکستان کے مسلمان دونوں نے راندۂ درگاہ کر دیا ہے کہ یہاں کی تنگ نظری کے
خانے کے لیے موزوں نہیں ٹھہرتی۔ ملا عاصی اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

ملا عاصی عقیدۃً بھی عادۃً بدھ مت کے پیرو تھے۔ خواہش کو گناہ جانتے تھے
مگر پھر کنوارے رہے اور کنوارے ہی مرے۔ بدھ مت کے پیرو ہوئے تو کسی نے پھبتی کسی
کہ مرتد ہو گئے، دوسرے نے کہا مسلمان تھے کب جو مرتد ہوتے۔ میاں بشارت نے تحقیق
کی کہ مولانا بدھ ازم میں تمہیں اس کے سوا اور کون سی خوبی نظر آئی کہ مہاتما بدھ اپنی بیوی

یشودھرا کو سوتا چھوڑ کر راتوں رات سٹک گئے۔ تو مسکرائے۔ کہنے لگے "میری یشودھرا تو میں خود ہوں وہ بھاگ بھری تو اب اگلے جنم میں جاگے گی۔ میاں بشارت کا بیان ہے کہ ایک محرم راز نے یہاں تک کہا کہ ملا عاصی نے وصیت کر رکھی ہے کہ میری لاش تبت لے جائی جائے۔ حالانکہ بچارے تبت والوں نے ان کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نابیناؤں کے اسکول میں مفت پڑھانے جاتے ہیں "لہجے میں مٹھاس، ملائمیت اور دھیرج بلا کا ہے۔ ہمیشہ سے تھا۔ الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے، لہجے سے دل میں اتر جاتی ہے، جادو الفاظ میں نہیں لہجے میں ہوتا ہے: غالب نے کیسی ظالم بات کہی ہے حیف کافر مردن و اوخ مسلمان زیستن۔ یعنی پروردگار مجھے کافروں کی طرح مرنے اور مسلمانوں کی طرح جینے سے بچا۔ سب کچھ سات لفظوں کے ایک مصرعے میں سمو دیا۔" (ص ۳۱)

اس تمہید کی غرض یہ تھی کہ جب میاں بشارت مدتوں بعد کراچی سے اپنے سابق وطن کانپور کی زیارت کو جاتے ہیں اور ملا عاصی کی چھڑے دم اور عسرت گزیدہ زندگی دیکھتے ہیں تو انھیں پاکستان لے آنے پر اصرار کرتے ہیں تو جواب ان کا بعد کو سنیئے گا فضا البتہ ایک نظر دیکھ لیجیے:۔

> اتنے میں ایک چتکبری بلی دبنا پر منہ میں دبائے ان کے کمرے میں داخل ہوئی، نعمت خانے میں بند کبوتر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ بلی کے پیچھے ایک پڑوسی کی بچی مینا کا پنجرہ ہاتھ میں لٹکائے اور اپنی گڑیا دوسری بغل میں دبائے آئی اور کہنے لگی کہ صبح سے ان دونوں نے کچھ نہیں کھایا بولتے بھی نہیں، دوا دے دیجیے۔ انھوں نے بیمار گڑیا کی نبض دیکھی اور مینا سے اسی کے لہجے میں بولنے لگے۔ انھوں نے ایک ڈبے میں سے لیمن ڈراپ نکال کر بچی کو دی۔ اس نے چوسا تو گڑیا کو آرام آگیا۔ وہ مسکرا دیئے..... کہنے لگے یہاں ہم سب کے دکھ درد میں ساجھی ہوں وہاں میری ضرورت کس کو ہوگی؟

یہاں ہمسے غریب ہوں کون ۔ یہاں ہم سے بھی غریب ہیں ۔۔۔۔
کون پوچھے گا ان کو بھلے میں ۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ سامنے جو جامن کا پیڑ دیکھ رہے ہو یہ میرے دادا نے لگایا تھا
جس کے پھل کھاتے ہو اور اس لڑکی سے صبح کا سلام نظر آتا ہے جو
ہے جب دونوں وقت ملتے ہیں اور شام کا جھٹ پٹا سا ہونے لگتا
ہے تو اس پر بے شمار چڑیاں جی جان سے ایسے چہچہاتی ہیں کہ دل کو
کچھ ہونے لگتا ہے۔ اس جامن کے پیڑ کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ (صفحہ ۳۳۲-۳۳۳)

۲ دسمبر ۱۹۸۰ء کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ محلے کی مسجد کے پیش امام نے کہا کہ ملحد کی صلوٰۃ الجنازہ جائز نہیں جس کے وجود ہی کے آنجہانی قائل تھے اس سے رحمت و بخشش کی دعا کیا معنی۔ بڑی دیر تک جنازہ جامن کے پیڑ کے نیچے پڑا رہا۔ بالآخر ان کے ایک عزیز شاگرد نے امامت کے فرائض انجام دیئے۔ (صفحہ ۳۳۸)
اور ان کے یہ الفاظ جو میاں بشارت کی دعوت ہجرت کے جواب میں تھے ابدی ثابت ہوئے

"تو بھی میرے ساتھ چلنے میں کیا قباحت ہے؟"

"ان بچوں کا کیا ہوگا؟"

"ہوتا کیا، بڑے ہو جائیں گے تمہیں کوئی MISS نہیں کرے گا۔ اگر
کوئی مر گئے تب کیا ہوگا؟"

"تو کیا ہوا یہ بچے، اور ان بچوں کے بچے تو زندہ رہیں گے، سینوں
میں اجالا بھر رہا ہوں مر گیا تو ان کے منہ سے بولوں گا، ان کی آنکھوں
سے دیکھوں گا۔" (صفحہ ۳۳۹)

یہ کہا ہے مشتاق احمد یوسفی نے:

"ملحد کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ اس
سچائی کا اعلان و ابلاغ بھی صرف اسی کو صرف اسی لمحے واجب ہوتا ہے
سو جو میں نے اس لمحے سے اور اپنے آپ سے کیسی وفا کی!" (صفحہ ۳۱۰)

ہندستان میں رہنے بسنے والوں کو اپنے بارے میں پاکستانی مہاجر کے تاثرات سے دلچسپی ہوگی لہٰذا یوسفی کی زبان میں ان تاثرات کی صرف دو جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں:

"رہن سہن کے معاملے میں ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے۔" (ص۲۴۲)

"ہندو رشوت لینے میں ایسی نرمتا (انکساری)، ایسا اخلاق اور اعتدال برتتا ہے کہ دل تو دوبارہ دینے کو جی چاہتا ہے۔" (ص۲۵۰)

اور کہیں انہی صفحات میں یہ بھی پڑھا تھا کہ میاں بشارت تم تو پاکستان جا کر مہاجر ہوئے ہم یہیں بیٹھے بیٹھے مہاجر ہو گئے۔

غرض دیکھا آپ نے ہر لمحے کی دہی اپنے لمحے کی سچائی صلیب اور تلخ کی کھلاؤ مشتاق یوسفی کس دردمندی اور کس دقیق نظر سے دیکھی اور دکھائی نہیں بلکہ پہلے اسی سے ایک راہ ANTIQUE کی طرف جاتی ہے۔ یہ آثار قدیمہ نہیں، اس تہذیب کے حصے ہیں جو صدیوں کی کمائی تھی ہندستان پاکستان کے ہندو، مسلم، سکھ عیسائی، بدھ اور بے مذہبوں اور لامذہبوں کی جن کے نام و نشان تک محفوظ نہیں اور یہ آثار قدیمہ کا خزانہ صرف لفظوں تک محدود نہیں کہ بقول یوسفی کے دوست جمیل صاحب کے:

"تصن برطرف، اگر ان میں سے ایک لفظ بھی ہاں صرف ایک لفظ، بھی دوبارہ رائج ہو گیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی۔" (ص۳۱)

لفظوں سے ہوتی ہوئی یہ روشنی کی لکیر تہذیب اور معاشرے کے دل دوز اور لطف زار گوشوں تک پہنچتی ہے اور بقول یوسفی اس طرح کہ صحبت یاراں کا ہر لمحہ ایک جشن میں تبدیل ہو جاتا ہے (ص۱۲) اور فضا میں دیر تک شرارجستہ اور فقرہ ہائے برجستہ کوندتے رہتے ہیں۔

جی ہاں، صرف نظر فروز ہی نہیں دل دوز گوشے بھی اور یہ دل دوزی ہے جس کی تصویر کشی کے لیے خود بقول مصنف:

"ایسی تاریکی، ایسی بے بسی، ایسے اندھیرے اور اندھیر کی
تصویر کھینچنے کے لیے تو دانتے کا قلم چاہیے۔" (ص ۱۰۸)

دورنتے کا یہ قلم مشتاق یوسفی کے ہاتھ آگیا ہے۔ ممکن ہے انٹیک ANTIQUE
کے ذخیرے سے مل گیا ہو یقین نہ ہو تو دو مناظر دیکھتے چلیے:

بوہیں کہ میاں بشارت کو سواری کا جو شوق ہوا تو ایک گھوڑا اپنی فراہم کردہ لکڑیوں
کے ڈھیر میں سے نکالا مگر جب کوچوان نے اسے تانگے میں جوتا تو "بے رحمی" والوں نے قانون
انسداد بے رحمی حیوانات کے تحت چالان کر دیا کہ گھوڑا لنگڑاتا تھا۔ آخر رشوت دے کر
جان چھوٹی۔ اب یہ معمول بن گیا کہ ہر ہفتے "بے رحمی" والے چالان کرتے اور رشوت وصول
کرتے۔ پانی سر سے اونچا ہوا تو بیس روپے رشوت دے کر "بے رحمی" والے سے بازپرس
کرنے میاں بشارت اس کے گھر جا پہنچے۔ اب جو اس گھر کی جو تصویر مشتاق یوسفی کے
قلم بلکہ موقلم نے کھینچی ہے وہ دانتے کی جہنم سے زیادہ حقیقی اور رونگٹے کھڑے کر دینے
والی ہے (اور لطف یہ ہے کہ یہ دقوم ایک طنز و مزاح والی کتاب کا ہے جو ملے بھر پہلے
آپ کو ہنسا رہی تھی۔ تصویر یہ ہے

عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ کہیں چٹائی، سرکی اور اخبار کی ردی سے بنی
ہوئی پھٹوں کے پیلے پانی کے سائے لوہے سے لٹکے پڑ رہے تھے
اور کہیں گھر کے مرد پھٹی ہوئی چٹائیوں میں دوسری پھٹی چٹائیوں کے
پیوند لگا رہے تھے۔ ایک شخص ٹاٹ پر بیٹھا ہوا تار کول پھیلا کر چھت
کے اس حصے کے لیے تریاں بنا رہا تھا جس کے نیچے اس کی بیماریاں
کی چارپائی تھی۔ دوسرے کی جھگی بالکل ڈھیر ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ
میں نہیں آرہا تھا کہ مرمت کہاں سے شروع کرے۔ چنانچہ وہ ایک
بچے کی پٹائی کرنے لگا۔ جگہ جگہ لوگ نالیاں بنا رہے تھے جن کا مقصد
بظاہر اپنی غلاظت کو پڑوسی کی غلاظت سے علیحدہ رکھنا تھا۔ ایک
صاحب آٹے کی بھیگی بوری میں بغل تک ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھ رہے

تھے کہ اندر کچھ بچا بھی ہے یا سارا ہی پیڑے بنانے کے لائق ہو گیا۔ ایک جھگی کے باہر بکری پر برساتی مکھیاں جو مصاحبوں کی طرح چپکا اور لدھڑ ہو گئی تھی، خارشی کتے کے اڑائے سے نہیں اُڑ رہی تھیں۔ یہ اس دودھ دینے والی مگر بیمار اور دم توڑتی ہوئی بکری کی اولاد تھی جسے تھوڑی دیر پہلے اس کے دو مہینے کے بچے سے ایک گز دور تین پڑوسیوں نے مل کر عُجلت پھرتی ذبح کیا تھا تاکہ چھری پھرنے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس کا خون معاون نالوں اور نالیوں کے ذریعے دور دور تک پھیل گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ ایک بھائی کی حق حلال کی کمائی کو ضائع ہونے سے بچا لیا، موت کے منہ میں سے کیسا نکالا تھا۔ انھوں نے بکری کو چند گھنٹوں میں مہینوں بعد گوشت پکنے والا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انھیں اس وقت ہوئی جب وہ اس جھگی کے سامنے سے گزرے جس میں لڑکیاں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ باہر لگی ہوئی کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں تو اب نظر آ رہی تھیں، لیکن ان کے کچے رنگوں کے باؤلے ریلوں سے ٹاٹ کی دیوار پر PSYCHEDLIC PATTERNS بن گئے تھے۔ ایک لڑکی آٹا گوندھنے کے تسلے پر سنگت کر رہی تھی کہ بارش سے اس کی ڈھولک کا گلا بیٹھ گیا تھا:

امّاں! میرے بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!
امّاں! میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!
کہ ساون آیا

ہر بول کے بعد لڑکیاں بے تحاشا ہنستیں، گاتے ہوئے ہنستیں اور ہنستے ہوئے گاتیں تو رنگ اپنی سرحد پار کر کے جوانی کے دوانی نے میں لے ملا تا کہیں اور نکل جاتا۔ سچ پوچھو تو کنواری کی کلکاری کھنکراتی ہنسی کی مُرکی ہی گیت کا سب سے البیلا ہریالا انگ تھا۔"

"یہ جھگی کے سامنے میاں بیوی لحاف کو رسی کی طرح بل دے کر
بھول رہے تھے۔ بیوی کا چہرہ اور گھونگھٹ باقی کی سونڈ کی طرح لٹک
رہا تھا۔ بیس جھگی اس بستی میں دو دن سے بارش کے سبب چولہے
نہیں جلے تھے۔ نشیبی علاقے کی کچی جھگیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی
کھڑا تھا۔ جھگیوں کی پہلی قطار کے سامنے ایک نیک نیت سماجی
ادارہ جو دو دو تنوری روٹیاں تقسیم کرنے کی کوشش کر
رہے تھے جو وہ رکشا میں رکھ کے لائے تھے۔ تین لحاف بھی
مستحقین میں بانٹنے کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ گھر سے
چلے تو اندازہ نہیں تھا کہ بیس ہزار کی بستی میں تین لحاف لے جانا کیا
ہی ہے جیسے کوئی آتشکش کی سرحد سے آگ بجھانے کی کوشش کرے
پھر یہ بھی تھا کہ کسی بھی جھگی میں دو گز زمین کا ایسا خشک خطہ نہ تھا
جہاں کوئی یہ لحاف اوڑھ کر سو سکے۔ اس بزرگ کے چاروں طرف کوئی
ڈیڑھ سو ننگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم تھا جسے وہ کیو بنانے کے فوائد
سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان ان پڑھ ٹھوٹ بچوں
کی جس حساب ان سے کہیں بہتر تھی کیونکہ ان کے اندر والا بھوکا
حساب دان بخوبی جانتا تھا اگر تین روٹیوں کو دو سو ننگے بھوکوں
اور تین لحافوں کو بیس ہزار مستحقین میں تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم
میں فقیر بزرگ کے تن پر ایک دھجی بھی باقی نہ رہے گی۔ اور اس وقت
یہی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ اشارت آگے بڑھے تو دیکھا کہ کوئی جھگی
ایسی نہیں جہاں سے بچوں کے رونے کی آواز نہ آ رہی ہو۔ پہلی مرتبہ
ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بچے رونے کی ابتدا ہی انترے سے کرتے
ہیں۔ جھگیوں میں آدھے بچے تو اس لیے پٹ رہے تھے کہ رو رہے تھے
اور بقیہ آدھے اس لیے رو رہے تھے کہ پٹ رہے تھے۔

"وہ سوچنے لگے تم تو ایک شخص کو پرسا دینے آئے تھے یہ کس دکھ ساگر میں تم نکلے طرح طرح کے خیالوں نے گھیر لیا بڑے میاں کو تو کفن بھی بھیگا ہوا نصیب ہوا ہوگا۔ یہ کیسی بستی ہے جہاں بچے دو گھر میں کھیل سکتے ہیں نہ بیاہ جہاں بیٹیاں دو گز زمین پر ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے درختوں کی طرح بڑی ہو جاتی ہیں جب یہ دلہن بیاہ کے پردیس جائے گی تو اس کے ذہن میں بچپن اور میکے کی کیا تصویر ہوگی؟ پھر خیال آیا کیسا پردیس، کہاں کا پردیس؟ یہ تو بس لال کپڑے پہن کر یہیں کہیں ایک جھگی سے دوسری جھگی میں پیر پیدل چلی جائے گی۔ یہی سکھاں سہیلیاں "کاہے کو بیاہی بدیس رے اے بابل مورے!" گاتی ہوئی اسے دو گز پرائی زمین کے ٹکڑے تک چھوڑ آئیں گی۔ پھر ایک دن مینہ برستے میں جب ایسا ہی سماں ہوگا تو اسے آخری دو گز زمین کی جانب ڈولی اٹھے گی اور زمین کا بوجھ زمین کی چھاتی میں سما جائے گا۔ مگر سنو! بندۂ خدا! تم کاہے کو یوں جی بھاری کرتے ہو؟ کہیں اس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کے دنیا کو دیکھا کرتے ہیں! درختوں کو کیچڑ گارے سے گھن تھوڑا ہی آتی ہے کبھی پھول کو بھی کھاد کی بدبو آتی ہے؟

انھوں نے ایک پھریری لی اور ان کے ہونٹوں کے دائیں کونے پر ایک کڑوی سی، ترچھی سی مسکراہٹ کا بھنور پڑ گیا جو لینے کا یارا نہیں رکھتے وہ اس طرح مسکرا دیتے ہیں۔

انھوں نے پہلے پہلی اس انوکھی بستی کو دیکھا تھا تو کیسی ابکائی آئی تھی۔ جی خوف آرہا تھا۔ بھیگی بھیگی چاندنی میں یہ شہر ایک آسیب لگتا تھا جو کسی طور پر کل ہی کا حصہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حد نگاہ تک اونچے نیچے بانس ہی بانس اور ٹپکتی چٹائیوں کی گپھائیں۔ بستی

جیسے بستی کا بچہ بچہ تھا جسے وطنی دھماکے کے بعد بچ جانے والوں نے کھا لیا ہو۔ ہر چہرے میں چاند نکلا ہوا تھا اور جیب دلدلوں پر آبی کوئیں اپنا چھلا ناچ ناچ رہی تھیں۔ جھینگر جگر جگر بولتے سناٹے دے رہے تھے جو کسی جگہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جھینگروں کے ڈیرے لوگوں نے لالٹینیں گل کر دی تھیں۔ میں تارت کے سرے اور سے چاند کو کاٹتی ایک ٹیلیری لوٹتی ہوئی گزری۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے اس کے سر پر کی ہوا سے ان کے سر کے بال اُڑے ہیں۔ نہیں یہ ایک بھیانک خواب ہے۔ جیسے ہی وہ موڑ سے نکلا گرتیوں سے یوں کی ایک موگو لیٹ آئی اور آنکھیں ایک ایک چکا چوند ہو گئیں۔ ماعدا ہوش میں ہوں یا عالم خواب ہے، کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا کرامت حسین کی حقی کے دروازے پر ایک میٹر دیکس جل رہی ہے۔ چار پانچ پُرسا دینے والے کھڑے ہیں اور باہر امیلوں کے ایک جوتے پر ان کا سفید براق گھوڑا بندھا کھڑا ہے!

مولانا کا پولیو زدہ بیٹا اس کو پڑوسی کے گھر سے آئے ہوئے موت کے کھانے کی نان کھلا رہا تھا۔

اور تصویریں! کوئی تصویر ہیں نہیں، جا بجا ایسے مرقع اور ایسے آئینہ خانے پڑے جگمگاتے ہیں کہ ان پر ٹھہر کر کوئی دو قہقہہ لگانے والا یا دو آنسو بہانے والا بھی نہیں۔

"بشارت نے حقی کے باہر کھڑے ہو کر مولانا کو آواز دی حالانکہ اس کے اندر اور باہر میں کچھ ایسا فرق نہیں تھا۔ بس چٹائی ٹاٹ اور بانسوں سے اندر کے کچھ اور باہر کے کچھ کے درمیان حد بندی کر کے ایک خیالی PRIVACY (تخلیہ) اور ملکیت کا حصار کھینچ کیا تھا۔

یہ میری حد، وہ تیری ہے

کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے حیدرآبادی انداز میں تالی بجائی جس کے جواب میں اندر سے چھ بچوں کے تلے اور پتیلیوں کا سا سیٹ نکل آیا۔ جن کی عمروں میں بظاہر نو نو مہینے سے بھی کم فرق نظر آرہا تھا سب سے بڑے لڑکے نے کہا مغرب کی نماز پڑھنے گئے ہیں، تشریف رکھیے۔ بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہاں تشریف رکھیں، ان کے پیر تلے اینٹیں ڈگمگا رہی تھیں۔ تعفن سے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ جہنم اگر روئے زمین پر کہیں ہو سکتا ہے تو

ہمیں است و ہمیں و ہمیں است

وہ دل ہی دل میں مولانا کو ڈانٹنے کا ریہرسل کرتے ہوئے آئے تھے "یہ کیا ان جیسے مولانا؟" کچکچا کر مولانا کہنے کے لیے انھوں نے بڑے طنز و تلخی سے وہ لہجہ کمپوز کیا تھا جو بہت سڑی گالی دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے لیکن جھگی اور کیچڑ دیکھ کر انھیں اچانک خیال آیا کہ میری شکایت پر اس شخص کو بالفرض جیل ہو جائے تو اس کے تو لالے پڑ جائیں گے۔ مولانا پر پھینکنے کے لیے طعن و تشنیع کے جتنے پتھر وہ جمع کر کے لائے تھے ان پر داڑھیاں لگا کر جانماز پیٹ دی تھیں تاکہ چوٹ بھلے ہی نہ آئے شرم تو آئے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ ان کا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ اس شخص کو گالی دینے سے فائدہ؟ اس کی زندگی تو خود ایک گالی ہے۔ ان کے گرد بچوں نے شور مچانا شروع کیا تو سلسلۂ ملامت ٹوٹا۔ انھوں نے ان کے نام پوچھنے شروع کیے۔ تیمور، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب۔ یا اللہ! پورا دودمانِ مغلیہ اس جھگی میں تاریخی تسلسل سے ترتیب وار اترا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے ناموں کا اسٹاک ختم ہو گیا مگر اولادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ چھٹ بھیوں پر اتر آئے تھے

مثلاً ایک لخت جگر کا پیار کا نام (مرزا) کو کاتھا جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا جس کو اس نے قلعے کی فصیل پر سے نیچے پھنکوا دیا تھا۔ اگر شفقت پدرانی ہوتا تو اس سے بھی زیادہ سخت سزا دیتا یعنی قزاقوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے حج پر بھیج دیتا یا آنکھیں نکلوا دیتا اور رحم کی اپیل کرتا تو از راہ ترحم خسروانہ و شفقت پدرانہ جلاد سے ایک ہی وار میں سر قلم کروا کے اس کی مشکل آسان کر دیتا۔ جو شہزادے بالشتیوں جیسے بچے اندر رہ گئے تھے ان کے ناموں سے بھی شکوہ شاہد ٹپکتا اور تاج و تخت سے وابستگی کا نشان ملتا تھا حالانکہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے کون تخت پر متمکن ہونے کے بعد قتل ہوا اور کون پہلے۔ بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد انتزاع سلطنت اور طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ بارہ سال میں آٹھ بادشاہ اس طرح سر پر آرائے سلطنت ہوئے کہ ایک بادشاہ ٹھیک سے بیٹھ نہیں پاتا تھا کہ اس کا تخت الٹ دیا جاتا۔ تاج اور سر ہوا میں بڑی گیندوں کی طرح اچھلنے لگے۔ ہر چند کہ اورنگ زیب کو موسیقی سے نفرت تھی لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت و تاج کے دعویداروں نے شاہی تخت کے گرد میوزیکل چیئرز کھیلنا شروع کر دیا۔ اس ادنیٰ تصرف کے ساتھ کہ میوزک بجائے شاعر لپک لپک کر قصیدے پڑھتے اور جب پڑھتے پڑھتے اچانک رک جاتے تو ایک نیا شہزادہ جھٹ سے تخت پر بیٹھ جاتا۔ نادر شاہ کو یہ مغلئی کھیل ایسا بھایا کہ تخت طاؤس اٹھوا کے وطن لے گیا۔ اس کے باوجود کھیل جاری رہا۔ تخت اٹھوانے کے ضمن میں ہم نے دو بے بانس بجے بانسری کا محاورہ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ چین کی بانسری بجانے کے بعد بادشاہوں اور امیروں کو بانس کی حاجت کبھی نہیں رہی۔ شاہوں

کا تانا پانا نے ہی نہیں پانا نے بھی نہیں ہوتا۔

"ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ خاندانِ تیمور کے جو باقی ماندہ چشم و چراغ جیل کے اندر تھے ان کے نام بھی تخت نشینی بلکہ تخت الٹنے کی ترتیب کے اعتبار سے درست ہی ہوں گے اسی لیے کہ مولانا کا حافظہ اور تاریخ کا مطالعہ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا ایسا لگتا تھا کہ لائحہ عمل بناتے وقت انھوں نے خاندانی منصوبہ شکنی کو تاریخ مغلیہ کے مقتضیوں اور تخت نشینی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے تابع رکھا ہے۔ بشارت نے پوچھا تم میں سے کسی کا نام اکبر نہیں؟ بڑے لڑکے نے جواب دیا نہیں جی وہ تو دادا جان کا تخلص ہے۔

گفتگو کا سلسلہ کچھ انھوں نے کچھ بچوں نے شروع کیا۔ انھوں نے دریافت کیا، تم کتنے بھائی بہن ہو؟ جواباً ایک بچے نے ان سے پوچھا آپ کے کتنے چچا ہیں؟ انھوں نے دریافت کیا کہ تم میں سے کوئی پڑھا ہوا بھی ہے؟ بڑے لڑکے تیمور نے ذرا اٹھا کر کہا جی ہاں! میں ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی، مسجد میں بخاری قاعدہ پڑھ کر کبھی کا فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ تین سال تک پیتل کی ایک فیکٹری میں مفت کام سیکھا، ایک سال ہوا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مشین میں آگیا۔ کاٹنا پڑا۔ اب مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا ہے۔ ہمایوں اپنے اسم نام کی طرح ہنوز خواری و آوارہ گردی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر تک پہنچتے پہنچتے پاجامہ بھی طریقت والوں کی نذر ہو گیا۔ البتہ شاہ جہاں کا ستر پھوڑوں، پھنسیوں، پیوندوں اور پٹیوں سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کے تن پر صرف اپنے والد کی ترکی ٹوپی تھی۔ بشارت کو اس کی آنکھیں اور اسے بشارت نظر آئے۔ سات سال کا تھا مگر بے حد ناتوانی کے باعث ایسی بارش

تو میں نے ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ ہاتھ پیر باجس کی تیلیاں۔ لیکن اس کے غلاف کی طرح پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ کچھ دیر بعد ننھی نورجہاں آئی۔ اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں کاجل اور کلائی پر نظر گزر کا ڈورا بندھا تھا۔ سارے منہ پر میل، کاجل، ناک اور گردن پر موٹی تھی سوائے ان حصوں کے جو ابھی ابھی آنسوؤں سے دھلے تھے۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سنہری بالوں میں جیسی لکڑیوں کے کڑوے کڑوے دھوئیں کی بو سی ہوتی تھی۔ ایک بھولی سی صورت کا لڑکا اپنا نام شاہ عالم بتا کر چل دیا۔ آدھے راستے سے واپس آکر کہنے لگا کہ میں بھول گیا تھا کہ شاہ عالم تو بڑے بھائی کا نام ہے۔ یہ سب مغل شہزادے کیچڑ میں ایسے مزے سے پھاک چل رہے تھے جیسے ان کا سلسلۂ نسب امیر تیمور صاحبقراں کے بجائے کسی راج ہنس سے ملتا ہو۔ ہر کونے کھدرے سے بچے اُبلے پڑ رہے تھے۔ ایک کہنے والا اور یہ شعر! دماغ چکرانے لگا

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

کوئی دیوار سی گری ہے کوئی

کچھ دیر بعد مولانا آتے ہوئے نظر آئے۔ کیچڑ میں ڈگمگ ڈگمگ کرتی اینٹوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہے تھے۔ اس ڈانواں ڈول پگڈنڈی پر اس طرح چلنا پڑتا تھا جیسے سرکس میں کرتب دکھانے والی لڑکی تنے ہوئے تار پر چلتی ہے۔ لیکن اس کی کیا بات ہے۔ وہ تو خود کو کھلی چھتری سے بیلنس کرتی رہتی ہے۔ ذرا ڈگمگا کر گرنے لگتی ہے تو تماشائی پلکوں پر جھیل لیتے ہیں۔ مولانا خدا جانے بشارت کو دیکھ کر بوکھلا گئے یا اتفاقاً ان کی کھڑاؤں اینٹ پھسل گئی

وہ دائیں ہاتھ کے بل جس میں دم کے پانی کا گلاس تھا، گرے۔ ان کا تہمد اور داڑھی کیچڑ میں لت پت ہو گئی اور ہاتھ پر کیچڑ کا موزہ سا چڑھ گیا۔ ایک بچے نے بدقلعی لوٹے سے پانی ڈال کر ان منہ ہاتھ دھلایا، بغیر صابن کے۔ انھوں نے انگوچھے سے تسبیح، منہ اور ہاتھ پونچھ کر بشارت سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے بشارت طے کر چکے تھے۔ رہر سل کیے ہوئے طعن آمیز ابتدائیہ فقرے جو داڑھی نماز اور گٹے سے متعلق تھے اس کیچڑ میں غرق ہو گئے قصرِ تقدس کا "چھجا" والی پھبتی بھی اسی بج بجاتی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ ان کا بے اختیار جی چاہا کہ بھاگ جائیں مگر دلدل میں آدمی جتنی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اتنی ہی تیزی سے دھنستا چلا جاتا ہے۔

"ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب شکایت و فہمائش کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی شش و پنج میں انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے جس سے ذرا دیر پہلے بکراہت مصافحہ کیا تھا، ہونٹ کھجایا تو ابکائی آنے لگی۔ اس کے بعد انھوں نے اس ہاتھ کو اپنے جسم اور کپڑوں سے ایک بالشت دور رکھا۔ مولانا غائبانہ آمد بھانپ گئے۔ خود پہل کی اس اعتراف کے ساتھ کہ میں آپ کے کوچوان رحیم بخش سے پیسے لیتا رہا ہوں۔ پڑوسن کی بچی کے علاج کے لیے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میری تعیناتی سے پہلے یہ دستور تھا کہ آدھی رقم آپ کا کوچوان رکھ لیتا تھا۔ اب جتنے پیسے آپ سے وصول کرتا ہے وہ سب مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اس کا حصہ ختم ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ مجھ سے اپنی بیوی کے لیے تعویذ لے گیا۔ اللہ نے اس کا مرض دور کر دیا۔ وہی شافی و کافی ہے۔ وہی چلاتا اور ملاتا ہے۔ اس

ے بعد وہ میرا مقدر ہو گیا۔ بہت دکھی آدمی ہے۔

مولانا نے یہ بھی بتایا کہ پہلے آپ چالان اور رشوت سے بچنے کے
جب بھی ہے دستبردے کا حکم دیتے وہ محکمہ والوں کو اس کا پیشگی
نوش دیے رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑھا اور غبت پکڑا جاتا تھا بلکہ یہاں
تک ہوا کہ ایک دفعہ انسپکٹر کو نوٹیس ہو گیا اور وہ تین ہفتے تک ڈیوٹی
پر نہیں آیا تو رحیم بخش ہمارے آفس میں یہ دریافت کرنے آیا کہ اتنے
دن سے چالان کیوں نہیں ہوا، جرمانہ تو ہے؟

بشارت نے تین سوال کو چوان سے متعلق تو کیے لیکن مولانا
کو کچھ کہنے سننے کا اب ان میں یارا نہ تھا۔ ان کا بیان جاری تھا۔ وہ
محو خاموشی سے سنتے رہے۔

"میرے والد کے کولھے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہو گئے۔ وہ
سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل
لیٹے رہنے سے ناسور ہو گئے ہیں۔ ایک تو اتنا گہرا ہے کہ پوری انگلی
اندر چلی جائے۔ انگلی برابر موٹی ایک رگ اندر نظر آتی ہے۔ پیپ
رستی رہتی ہے۔ زخم صاف کرتے ہوئے مجھے کئی دفعہ قے ہو چکی ہے
لڑکا کے ڈبوں میں پانی بھر کے چاروں پایوں کے نیچے رکھ دیے
ہیں تاکہ دو ماہ لال چیونٹے زخموں میں نہ گھسیں۔ پڑوسی آئے دن
جھگڑتا ہے کہ تمہارے بڑھو دن بھر تو خراٹے لیتے ہیں اور رات
بھر چیخے کراہتے ہیں۔ ناسوروں کی سڑاند کے مارے ہم کھانا نہیں
کھا سکتے۔" وہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ فقط چٹائی کی دیوار ہی تو بیچ میں
ہے۔ چار مہینے قبل فضل ایزدی سے ایک اور فرزند تولد پذیر ہوا۔
اللہ کی دین ہے۔ بن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک۔ اللہ نبی
کی امت کو بڑھاتا ہے۔ چھلچھے کے بعد ہی بیوی کو (WHITE LEG

ہو گئی، ہل نہیں سکتی۔ مرضیٔ مولا۔ رکشا میں ڈال کر جناح اسپتال لے گیا۔ کہنے لگے فوراً اسپتال میں داخل کراؤ مگر یہاں کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ ایک مہینے بعد پھر لے گیا۔ اب کی دفعہ کہنے لگے، اب لانے ہوا بھی بیماری ہے، ہم ایسے مریض کو ایڈمٹ نہیں کر سکتے۔ صبر کیا۔ راضی ہیں ہم اُس میں جس میں رضا ہو تیری۔ فجر اور مغرب کی نماز سے پہلے دونوں مریضوں کا گوہ موت کرتا ہوں، نماز کے بعد خود روٹی ڈالتا ہوں تو پیٹ کے پیٹ میں پچ جاتا ہے۔ ایک دفعہ نور جہاں نے ماں کے لیے بکری کا دودھ گرم کیا تو کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔"

بشارت اب کہیں اور پہنچ چکے تھے۔ اب انھیں بدبو آ رہی تھی نہ متلی ہو رہی تھی، سناٹے میں آ گئے تھے:

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ دہر
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا

مولانا نے کہا کہ دائی کا علاج ہے۔ عرق مکو، روی مصطگی، مغز بنفشک، مد افیم کا لیپ بتایا ہے۔ بڑی ہمدرد عورت ہے۔ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے پانی دم کروا کے لاتا ہوں، سوڈیڑھ سو نمازیوں کے انفاس متبرک بڑے بڑے رئیسوں کو نصیب نہیں ہوتے مگر شاید مولا کو شفا منظور نہیں۔ مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔"

مشیت ایزدی اور مرضیٔ مولا کے جتنے حوالے اس آدھ گھنٹے میں بشارت نے سنے اتنے پچھلے دس برسوں میں بھی نہیں سنے ہوں گے۔ مولانا کی باتوں سے انھیں ایسا لگا جیسے اس بے لوث عورت میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی عین مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

انھیں اس سرنگ کے دوسری طرف بھی اندھیرا ہی اندھیرا نظر

ذلت، بے بسی، ناامیدی، بے بسی، مایوسی اور اندھیری تصویر کھینچنے کے لیے تو دانتے کا قلم چاہیے۔

پلید باتھ

مولانا کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور وہ معذرت کر کے کچھ دیر کے لیے چلے گئے۔ عورتیں اپنے خیالات میں کھو گئیں۔ اس ایک آبادی میں جس میں نہ دیوار ہے، نہ دیوار ہے جس میں آواز بیس اور سو تک جاتی ہے، جہاں لوگ شاید ایک دوسرے کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں، یہاں ایک کونے میں بوڑھا باپ بڑا دم توڑ رہا ہے، دوسرے کونے میں رنجی بو رہی ہے اور درمیان میں بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ بھائی میرے! جہاں اتنی دشوار تھی وہاں تھوڑی سی اور لے کر بیوی کو اسپتال میں داخل کر لیتے تو کیا حرج تھا جان پر بنی ہو تو شراب تک حرام نہیں رہتی لیکن پھر ہانڈی، چولہا، جھاڑو بہارو کون کرتا؟ اس ٹبر کا پیٹ کیسے بھرتا مولانا نے بتایا تھا کہ رنجی کے دم سے ہی دن بیوی نے بچوں کے لیے روٹی پکائی اور کپڑے دھوئے تھے۔ بشارت سوچنے لگے کہ ان جنگجو تاتاری عورتوں کے قصیدوں سے تو تاریخ بھری پڑی ہے جو عرب شاہ کے بیان کے مطابق تیمور کی فوج کے شانہ بشانہ نیزوں اور تلواروں سے لڑتی تھیں۔ اگر کوچ کی حالت میں کسی عورت کے درد زہ شروع ہو جاتا تو وہ دوسرے لشکر سواروں کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو کھڑی ہو جاتی۔ گھوڑے سے اتر کر بچہ جنتی، پھر اسے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے گلے میں حمائل کرتی اور دوبارہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر لشکر سے جا ملتی۔ مگر جھگیوں میں چپ چاپ جان سے گزر جانے والی ان بے نام بی بیوں کا نوحہ کون لکھے گا؟ بشارت

لادم تھمنے لگا۔ اب تک مولانا نے کل ملا کر بھی سوڈیڑھ سو روپے وصول کیے ہوں گے۔ وہ ناحق یہاں آئے۔ انھوں نے موضوع بدلا اور دیہ کے پانی کی تاثیر کے بارے میں سوچنے لگے کہ ابھی تو یہ بے چاری ایک بیماری میں مبتلا ہے، سو آدمیوں کا پھوٹا ہوا پانی پی کر سو نئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔

کچھ دیر بعد مولانا نے اندر پردہ کرایا یعنی جب نور جہاں نے اپنی بیماریاں کو سر سے پیر تک چیکٹ لحاف اوڑھا کر لٹا دیا تو مولانا نے بشارت کو جھگی میں چلنے کو کہا۔ دونوں ایک چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔ ادوان پر ایک نقشین سینی میں تام چینی کی نیلی چینک اور دو کپ رکھے تھے کپ کے کناروں پر مکھیوں کی کلبلاتی جھالر۔ مولانا نے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈالی اور انگلی سی اچھی طرح رگڑ کر دھویا، پھر اس میں چائے بنا کر بشارت کو پیش کی۔ اگر وہ انگلی سے نہ دھوتے جو کچھ دیر پہلے کیچڑ میں سنی ہوئی تھی تو شاید اتنی اُبکائی نہ آتی۔ مولانا چائے دینے کے لیے جھکے تو اُن کی داڑھی سے گڑ کی بو آ رہی تھی۔

مولانا کا بیان جاری تھا۔ بشارت میں اب اتنا حوصلہ باقی نہ تھا کہ نظر اٹھا کر ان کی صورت دیکھیں۔ مجھے تو کہ بے رحمی جانور ان ساٹھ روپے تنخواہ دیتا ہے۔ ایک بیٹا سات سال کا ہے۔ ذہین ڈیل اور شکل و صورت میں سب سے اچھا۔ چار پانچ مہینے ہوئے اسے تین دن بڑا تیز بخار رہا۔ چوتھے دن بائیں ٹانگ رہ گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ بولا بولیو ہے۔ انجکشن لگا دیے۔ خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ میرا بچہ صرف ایک ہی ٹانگ سے معذور ہوا۔ چارپائی میں چار جھگی چھوڑ کر ایک بچی کی دونوں ٹانگیں رہ گئیں۔ مولانا

ہوتی ہے جب چاہتا ہے دی ہوتی ہے۔ جن باپ کی بچی ہے نظر
کی نہیں کہاں سے ہوتے ہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے جن بیگمات اس بچی
کو نظر لگا دیں کیا بتاؤں اس بہو بی بی نے کیسی دعائیں دی ہیں
آنکھوں وقت اس بچی کے لیے بھی دعا کرتا ہوں۔ ہر جمعہ کو جنگلی کبوتر
کے خون اور لونگ اور بادام کے تیل سے بیٹے اور اس بچی کی پیشانی
کی مالش کرتا ہوں۔ ویسے اس ڈاکٹر کا علاج بھی جاری ہے آپ کے
کوچوان سے جتنی بار پیسے لے اسی علاج معالجے کے واسطے لیے۔"

بشارت کو یہ سوس ہوا جیسے دماغ سن ہو گیا ہو۔ بیماری
بیماری، بیماری۔ یہاں لوگ کچھ کھان بچے پیدا کرنے اور بیمار پڑنے
کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے ہیں یا نہیں! اس آدھ گھنٹے میں ان کے
منہ سے بمشکل دس بار جملے نکلے ہوں گے۔ مولانا ہی بولتے رہے
بشارت کی زبان پر ایک سوال آ آکر رہ جاتا تھا۔ کیا سب بیگموں میں
یہی حال ہے! کیا ہر گھر میں لوگ اسی طرح رنجور بن کر جیتے ہیں؟

مولانا ہماری تنخواہ سے قرض حسنہ سمجھ کر معاف کر دیجیے۔ آپ کے
کوچوان نے دھمکی دی تھی کہ ہمارا صاحب کہتا ہے ڈرائیل کو بول
دینا کہ ایسا ذلیل کروں گا، ایسا طیا میٹ کروں گا کہ یاد کرے گا
یہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ برستا بادل ہمارا اوڑھنا اور بچھونا
ہے اس کے آگے اب کیا اور ہو گا! مولا سے دعا کی تھی کہ اکل حلال
اور صدق مقال عطا ہو عزت کی روٹی ملے، گناہ گار ہوں، دعا
قبول نہ ہوئی۔ اس پر سب کچھ روشن ہے۔ آج صبح ناشتے میں ایک
روٹی کھائی تھی اس کے بعد ایک کھیل کا دانہ بھی منہ میں گیا ہو تو
لعنت ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ وہ کہتا
ہے کہ تم ہاتھ بڑھاؤ اور ملا جو کہ تمہارے ساتھ سے ایک بھی ایک

بندہ اٹھا کر لے جائے تو تم اس سے چھین نہیں سکتے۔"

مولانا نے گرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جس میں غار پڑا ہوا تھا دھونکنی سی چل رہی تھی۔ بشارت نے نظریں جھکا لیں۔

"مدت سے حضرت ذہین شاہ جی سے بیعت ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک پڑوسی نے جو اس بیوہ بی بی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مجھے اس میں مانع سمجھتا ہے پیر و مرشد کو ایک گمنام خط بھیجا کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمۃ نے رزق حلال کو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے ارشاد فرمایا کہ جب تک تم رشوت کا ایک ایک پیسہ واپس نہ کر دو گے پلید ہاتھ سے بیعت نہیں لوں گا۔ خدا مجھ پر رحم فرمائے میرے حق میں دعا کیجیے۔"

مولانا ان کے سامنے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ ان کے ملیشیا کے کرتے پر جذب ہوتے آنسوؤں کا ایک سیاہ نخیرہ سا بن گیا تھا۔ بشارت نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ایک اور تصویر ملاحظہ ہو:

"کراچی کی سڑکیں جگ رہی تھیں۔ سینما کا آخری شو ابھی ختم ہوا ہی تھا کاروں کے شیشوں پر اوس کے ریلے بہہ رہے تھے اور اس کی تیزی بھیگ چلی تھی۔ پیلس سینما کے پاس بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک جوان نیم برہنہ پاگل عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچے کی آنکھیں کھنچی آئی ہوئی تھیں اور سوجن اور چیچڑوں سے بند ہو چکی تھیں۔ نسنگی چھاتیوں پر بچے نے دودھ ڈال دیا تھا جس پر مکھیوں نے چھاؤنی چھا رکھی تھی۔ ہر گزرنے والا ان حصوں کو جو مکھیوں سے ڈھکے ہوئے تھے صرف خوف سے دیکھتا بلکہ مڑ مڑ کے ایسی نظروں سے گھورتا چلا جاتا کہ بہ

بہت مشکل تھا کہ دراصل بھکاری کون ہے۔ پاس ہی ریلوے سٹیشن کے
پلیٹ فارم کے میں مزے لے لے ایک کتا اسے زبان سے چاٹ چاٹ
کر صاف کر رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک سات آٹھ سال کا لڑکا
موتیا کے گجرے بیچ رہا تھا۔ انھوں نے ترس کھا کر ایک گجرا لیا اور
کانسٹیبل کو دے دیا۔ اس نے اسے انفل کی نال پر لپیٹ لیا۔
بشارت مرچکا ہے خیالوں میں گم بندر روڈ، عیدگاہ، صدر اور
نرسری ہوتے ہوئے پی ای سی ایچ ایس پہنچے تو ایک کانسٹیبل ہوگا
انھوں نے لائسنس گاڑی کے بونٹ پر رکھ دیا اور اس کی روشنی
میں لکڑی جو چوروں سے بچ گئی تھی اپنے ہاتھوں سے تھانیدار
کے پلاسٹر پر ڈال آئے

ہے کیا ، ور مکافات مصنفہ ، دیگر ، (ص ۱۹)"

اس دردمندی کا ایک پہلو یہ ہے کہ یوسفی کے ہاں مٹوکے گئے فرشتوں کا گزر
ہی یہاں تو ایسے لوگ ہیں جو سنگ و آہن کا جگر رکھتے ہیں مگر ان کے اندر کچھ ایسی
ہی اور گداز ہے کہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر فرشتہ ہیں۔ حویلی والے بشارت علی فاروقی
کے سسر اور بشارت علی کے فرمانبردار مہمان صوبہ سرحد کے حاجی اورنگ زیب خاں اور ملا
ہی جن کا ذکر آچکا ہے کراچی پر خاں صاحب کا تبصرہ اپنی جگہ، مگر ذرا اس بیان کے
تیسرے حصے کی دردمندی کا رشتہ شروع کے خشونت سے تو جوڑ کر دیکھیے :

"اس سے پہلے ماموں نے ۱۹۳۲ء میں سورے کے نزدیک کاطوری خیل
علاقے میں ایک پہاڑی کوہ کی کمین گاہ سے تین گورے مار گرائے تھے
ان میں ایک کپتان تھا۔ اس کی صورت بلڈاگ جیسی تھی۔ اس خنزیر
کے بچے نے تعزیتی کے بے شمار مرید شہید کیے تھے۔ ماموں نے اس کے
کان اور ناک کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیے۔ دوسرے گورے کی

جیب سے جو معمولی سپاہی تھا اس کی مجبور کمزور ضعیف ماں اور ایک
سال کی بڑی پیاری سی بچی کے فوٹو نکلے۔ بچی کے ہاتھ میں گڑیا
تھی۔ فوٹو دیکھ کر میرا ماموں بہت رویا۔ لاش کے ہاتھ پر سے جو
سونے کی گھڑی اس نے اتاری تھی وہ واپس باندھ دی میت
کو سلائے میں کر کے واپس جا رہا تھا کہ چند قدم بعد کچھ خیال آیا۔ وہ
پلٹا اور اپنی چادر اتار کر اس پر ڈال دی۔" (ص ۲۰۰)

خاں صاحب ——— بظاہر اس لکڑی کے دام وصول کرنے پشاور سے کراچی آئے تھے جو بشارت نے ان کے ہاتھ فروخت کی تھی اور جو بقول ان کے دلدار نکلی دن بھر لڑتے تھے اور حلوہ کھاتے تھے اور پورے گھر کو سر پر اٹھائے رہتے تھے آخر طے پایا کہ بشارت اپنی سیکنڈ ہینڈ قابل مرمت کار اس رقم کے بدلے ان کے حوالے کریں اور خلیفہ ڈرائیور ہمرکاب رہے جو حجامت سے لے کر ڈرائیوری تک کے سبھی فرائض انجام دیتا تھا۔ مگر پشاور پہنچنے کے بعد خاں صاحب کا جو خط آیا اس نے کچھ اور ہی حقیقت بیان کی۔ بات یہ تھی کہ تین ہفتے پہلے ڈاکٹروں نے خاں صاحب کو جگر کا سرکوسس بتایا تھا دوسرے درجے میں جس کا کوئی علاج نہیں۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو، خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو جن کی صحت تمہیں بشاش رکھے....

"میں نے لنڈی کوتل سے لانڈی تک نگاہ ڈالی، آپ سے زیادہ بھی
خود مگر سند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہ
آیا چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آگیا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ
طبیعت کا رنگ اتارنے کا بہانہ تھا۔" (ص ۲۳۳)

گویا وہ روزانہ کے جھگڑے، وہ ڈوبی ہوئی رقم وصول کرنے پر اصرار، وہ پشتو کی
لیاں سب کچھ محض ڈھونگ تھا۔ محض خوش وقتی سے زندگی گزارنے کا بہانہ اور زندگی
ں وہ جس کے آخری چند دن ہی باقی رہ گئے تھے یہی خوش وقتی، زندگی کا یہی عنوان

لمحہ اور وہ کوشش کے لمحوں میں سمو کر ایک مشعلوں کے جلوس کی طرح اس سے گزر جاتا ہے۔ یہی شاعری یا موسیقی کی تصویروں کا ماحصل ہے یہاں دامن گیر ہوتی ہے نہ خواب ستاتے ہیں، ایک خاموش مگر نہایت عمیق دردمندی ہے جو دل کا دامن تھام لیتی ہے اور جی ٹھہر جاتا ہے۔ اور جب زندگی کا یہ رُخ سامنے آجائے تو انسان کی ہر کمزوری اس کو پیار کرنے کا نیا حیلہ بن جاتی ہے۔

اعلیٰ آرٹ کی پہچان بھی یہی بتائی گئی ہے کہ وہ غم سمیت زندگی کو اپنا کے حیات کو مکمل شکل میں دیکھ اور اختیار کر سکے اس کے جگر سوز زہر اور نشاط انگیز سرمستی کے ساتھ

TO SEE LIFE STEADILY AND AS A WHOLE

اور یہ سمائی محض تماشائی کی طرح جانب دارانہ کیفیت سے نہیں، زندگی میں شرکت اور گہری شرکت، دردمندی اور گہری دردمندی، عرفان اور گہرے عرفان ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ے "سنتری بادشاہ بھی تو طریبہ ہے۔ وہ ریڑھی والے کو کب بخشتا ہے، اور غریب ریڑھی والے سے شام آکے بھاگر ایک سیر سیبوں میں دو دانے سیب ملا کر تول دیے۔ اس کی ترازو صرف ایک چھٹانک کم تولتی ہے۔ صرف ایک چھٹانک اس لیے کہ ایک من کم تولنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر لائق صد رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے چیتھڑے لگائے ظالم سماج کو کوستے پھرتے ہیں۔ انھیں ساڑھے چار سو روپے کھلائے جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور نجم الدین کو جو ان سے زیادہ مسکین کون ہوگا، ظلم، ظالم مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پیسہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور باسالم نگلتا ہے۔ شارک دانتوں سے خون چوس کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چبا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی چھپکلی، مکڑی اور پھر سب حسب مقدور و مقدار خون کی قسمیں لگاتے ہیں۔ بھائی میرے دنیا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے سعدی انھیں اپنے انکم ٹیکس کے ڈبل بھی کھاتے یاد آگئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں، ہم سب ایک دوسرے کا آزوقہ ہیں۔ بڑے چھوٹے سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ تب نظر آتی ہے اک نقوش تری صورت"

اسی سبب مشتاق یوسفی کا شمار بھی ان میں ہوگا جن کے سر پر وقت کی اٹھتی موج نے اپنے حباب کا تاج رکھا اور ساعت گزراں نے اپنے تخت رواں پر بٹھایا (۱)

اور سب کچھ جانے دیجیے، ایسی بے بدل اور بے مثل تصویریں اور کیفیتیں بھلا اس زہر نوشی اور امرت چشی کے بغیر کیونکر ممکن ہو سکتی ہیں:۔

"وہ بھی کیسے ارمان بھرے دن تھے جب ہر دن ایک نئے کنول کی مانند کھلتا تھا" جب سائے دھانی ہوتے تھے جب دھوپ گلابی ہوتی تھی" ان کے تصور ہی سے سانس تیز تیز چلنے لگتی۔ بیتے ہوئے روز و مہ و سال فردوس کے بتوں کی مانند چاروں طرف اڑنے لگتے۔ ہائے وہ استاد فیاض خاں کی وحشی بگولے کی طرح اٹھتی ہوئی الاپ، وہ گوہر جان کی ٹھمکتی ٹھنکارتی آواز اور مختار بیگم کیسی بھری بھری آسودہ آواز سے گاتی تھی۔ اس میں اس کی اپنی جوانی تان لیتی تھی، پھر خواب گیتے پگھلنے لگتے۔ یادوں کا دریا بہتے بہتے خواب سراب کے آبِ گم میں اترتا چلا جاتا۔ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگتیں۔ زمین سے پٹ اٹھتی اور بدن سے ایک گرم مدھ ماتی مہکار پھوٹتی۔ بارش میں بھیگتے تر بتر بھیگتے کچھ بھی تو نہ چھپا پاتے پھر بادل باہر بھیتر ایسا ٹوٹ کے برستا کہ سب کچھ بہا لے جاتا۔

سینے سے گھٹا اٹھے آنکھوں سے جھڑی برسے
ساون کا نہیں بادل جو چار گھڑی برسے
برکھا ہے یہ بھادوں کی برسے تو بڑی برسے

چھاجوں مینہ برستا رہتا اور وہ ہارمونیم پر دونوں ہاتھوں سے کبھی بین، کبھی استاد جھنڈے خاں کی چھاتی دھوم پھاتی سارنگیاں جلاتے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ کالے ناگ بلوں سے نکل کے جھومنے لگتے، دیکھیں

---

(۱) انشا اللہ خاں انشا

میں پاؤں تک نہ کہیں ہو جو سے پھر ہاؤ کو پہنچنے کی طرح مشتاق
ہاتھوں پر ہوا کہیں رنگ کو دیکھ کر اس کے رنگ اپنے لہو لہو ہیں
آنکھیں ہو کہیں چندن بالوں پہ بے پھنکی اور کبھی بچری کے رنگ
جھٹلائے نہیں جھوٹے آنچل کی لے تیز ہوتی تو لفظ کیسی جھن جھن
کی طرح بجتی جیسے کسی نے مستی میں زمین اور آسمان کو اٹھا کے بجرے
کی طرح جھلا دیا ہو اور اب رنگ تاروں میں جھنک جھنکار ہے کہ کسی طور
تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

اور ایسی مصوریاں بھی بہت ہیں مگر ان سنوری دھلی شفاف تصویروں کو کوئی
کہاں تک موثر کرے ایسی دریا محبت ایسا بر کھا پیار (ص ۳۰) ان سے ٹوٹا پڑتا ہے ٹپکا
پڑتا ہے پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ وہ اب تک زندگی میں کیا کرتا رہا کہ اس کے حسن کی
فراوانی اور درد و داغ و جستجو و آرزو کے ان زاویوں سے بے خبر رہا۔ آنکھیں نئے منظروں
سے سیراب ہوتی ہیں اور تخیل نئی کائناتی افقوں تک پرواز کرتا ہے لفظوں کی دھنک
کھلتی ہے اور لفظ اور لہجہ ان رنگوں کے سمندروں میں کشتی کے بادباں اڑاتے گزرتے
ہیں۔ غرض یوسفی کا جہاں ان جانی دولتوں اور ثروتوں کے سنہرے لادے بادلوں میں
اٹھتا ہوا جاتا ہے۔

مشتاق یوسفی کے احساس کو نئی دھنک اور فکر کو نیا گداز ہی نہیں بخشا اردو نثر کو
ایک نیا لوکھا منظر دیکھا اتنہ وہ اسلوب بھی بخشا اور اتنی صفات کے باوجود یہ جملہ
کھلا پڑتا ہے اور صحیح مفہوم کی ادائیگی سے عاری۔ یہ سچ ہے کہ الفاظ کے تلازمات اور مفاہیم
کی نئی سرحدیں مشتاق یوسفی کی تحریر سے متعین ہوتی ہیں۔ میر تقی میر نے شاعری میں
جس لفظ کو ایہام کے بدلے شیوہ بیانی کے نام سے اختیار کیا تھا مشتاق یوسفی نے یہ
معنا نظر میں کر دکھایا ہے لفظ کو نئی جہت دے کر اسے نئی قوت اور نئی توانائیوں اور
تلازموں کی جہتوں سے مالا مال کرنا یوسفی کا کمال ہے۔ یہاں لفظ لفظ کے دست ہنر

میں رنگ بولنے لگتے ہیں بلکہ یوں کہیے تہذیب کی نئی سرگرمیاں ان کی زبان سے بولنے لگتی ہیں۔ کہا تو انھوں نے کسی اور کے لیے ہے مگر خود ان پر صادق آتا ہے کہ

"ملتہ یلاں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈھیل ان کے لہجہ ہی میں نہیں فقروں میں بھی پڑتا تھا۔" (ص ۱۰)

اور ایسے ایسے نازک موقعوں پر وہ ڈھیل ڈالتے ہوئے لفظوں اور فقروں کا استعمال کرتے ہیں کہ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی ہے بھلا اجنتا کی تصویروں کا بیان تو دیکھیے اور اس بیان کے پیچھے ان تصویروں کے بنانے والے بدھ بھکشوؤں کی آرزومندی کی بنتے بگڑتے ہیولوں پر تو نظر کیجیے کہ لفظ سے کیسے کیسے کام لیے جا سکتے ہیں۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی ہی تصویروں کے رنگ زیادہ چوکھے اور خطوط کہیں زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ غیاں ہوتے ہیں اجنتا اور ایلورا کے غاروں کے FRESCOES (دیواری تصویریں) بھی جیسے اس کی کلاسیکی مثال ہیں۔ کیسے بھرے پورے بدن بنائے گئے ہیں بنانے والوں نے۔ اور بنانے پر آئے تو بناتے ہی چلے گئے۔ گداز پیکر تراشنے چلے تو ہر SENSUOUS کمر بل کھاتی، گدراتی چلی گئی۔ سیدھی سبک لکیریں آپ کو مشکل ہی سے نظر آئیں گی۔ حد یہ کہ ناک تک سیدھی نہیں۔ بھاری بدن کی ان عورتوں اور اپسراؤں کے نقوش اپنے نقاش کے آشوبِ تخیل کی چغلی کھاتے ہیں۔ نارنگی کی قاش ایسے ہونٹ سہلر سے زیادہ بھری بھری چھاتیاں جو خود سنگ تراش سے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ باہر کو نکلے ہوئے بھاری کولہے جن پر گاگر رکھ دیں تو ہر قدم پر پانی دیکھنے والوں کے دل کی طرح بالنسوں اچھلتا جائے۔ ان گولائیوں کے کم و پیچ کے بیچ بل کھاتی کمر اور پیٹ جیسے جوار بھاٹا میں پیچھے ہٹتی لہر پھر وہ ٹانگیں جن کی تشبیہ کے لیے سنسکرت شاعر کو کیلے کے تنے کا سہارا لینا پڑا..... اس وصل آشنا اور نامحبوب بدن کو اور اس کے

مرزا رنگ EXAGGERATED خطوط اور کھل کھیلتے اُبھاروں کو ان ترسے
ہوئے برہمچاریوں اور بھکشوؤں نے بنایا اور خوابیدہ ہے جن پر بھوگ بلاس
عوام تھا اور جنھوں نے عورت کو صرف فیشنی اور سپنے میں دیکھا تھا اور
جب کبھی وہ سپنے میں اتنے قریب آ جاتی کہ اس کے بدن کی آنچ سے
اپنے لہو میں الاؤ سا لگ اٹھتا تو فوراً آنکھ کھل جاتی اور وہ ہتھیلی سے
آنکھیں ملتے ہوئے سنگلاخ چٹانوں پر اپنے اپنے خواب گھسنے شروع کر دیتے:
اور ایسے ہی لمحات میں مورنیں جنگل کا جنگل ناچتا نظر آتا ہے
لفظوں کا بھی سلوانہ استعمال ہو رہا ہے کبھی سنگیت اور کبھی رقص بن کر فضا پر چھا
جاتا ہے کبھی سواریوں کے بیان میں ظاہر ہوتا ہے کبھی پولیس تھانے کی چیرہ دستیوں کے
ذکر سے بھی کبھی یکے کی سراپا نگاری میں کبھی کبوتر بازی کی تفصیلات میں اور دوسرے پرندوں
اور پالتو اور غیر پالتو حیوانوں کے ذکر میں تو کبھی موسیقی اور مجرے کی تصویر کشی میں

"تو صاحب منی بیگم کا چہرہ اور بھرے بھرے بازو کچھ ایسے تھے کہ کچھ بھی
پہن لے نئی نئی سی لگتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ منی بیگم فارسی غزلیں
خوب گاتی تھی۔ لوگ بار بار فرمائش کرتے، وہ بھی عموماً بیٹھ کر گاتی
تھی کبھی دادرا ملتی یا یوں ہی ترنگ آتی تو یکایک اٹھ کھڑی ہوتی
دونوں سارنگے اور طبلچی بھی اپنے اپنے زرین پٹکے کس لیتے اور
استادہ ہو کر سنگت کرتے۔ محفل میں دو چار چکر رقصاں لگاتی۔ پھر
کسی بساط پر کھڑے ہو کر ایک ہی جگہ پھرکی کی مانند تیزی سے گھومنے
لگتی۔ زرد دوزی کی لشکارا مارتی پشواز ہر چکر کے بعد اونچی اٹھتے
اٹھتے تار بکر پہنچ جاتی۔ یوں لگتا جیسے جگنوؤں کا ایک ہالہ رقص میں
ہے۔ لے اور گردش تیز اور تیز ہوتی۔ کرن سے کرن میں آگ لگتی چلی
جاتی۔ پھر بجھنے والی نظر آتی صرف تاج نظر آتا تھا۔

کچھ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب

اور جب یکایک رُکتی تو شواز سڈول ٹانگوں پر امربیل کی طرح ترچھی
لپٹتی چلی جاتی، سازندے ہانپنے لگتے اور کھرل پر طبلچی کی تتلاتی ہوئی
انگلیوں سے لہو خون اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔" (ص ۲۵)

غرض اس اسلوب کی شعبدہ بازی اور گل کاری کو کن لفظوں میں سمیٹیں کہ حق ادا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ یوسفی جنس زدگی کی لالک اور اردو، فارسی اور انگریزی اشعار کی ترغیبات کے بے طرح شکار ہیں مگر ان کے لفظوں کی گردان کرنا اور ان کے جفت اور طاق کی شناخت کر کے تخالف اور تطابق کے خانوں میں بانٹنا شفق کے ہوش ربا رنگوں کو PRISM کی بوتل میں بند کرنے سے بھی زیادہ بدمذاقی ہوگی لہٰذا ان کے اسلوب کے طریقے سے باز آکر اس میں ڈوب جانا اور محو ہو کر اس کے عرفان کی سعی کرنا زیادہ مناسب ہے کہ ہر خوبصورتی کا صحیح ردعمل اس کا مقابلہ اور تجزیہ نہیں سپردگی ہے البتہ ردو نشر کو مبارکباد دیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اسے ایک اور پوشاک ملی ہے اور ایسے رنگ کی پوشاک جس کا ابھی کوئی نام متعین نہیں ہوا ہے۔ پیراہن یوسفی ہی اس کی پہچان ہے۔

"آبِ گم" کے آئینے میں

"آبِ گم"، مکتبہ دانیال، کراچی۔ صفحات ۴۰۴۔ قیمت ایک سو پچاس روپے

سے کھرل: وہ سیاہ حلقہ جو طبلے پر ہوتا ہے۔

آصف قرشی

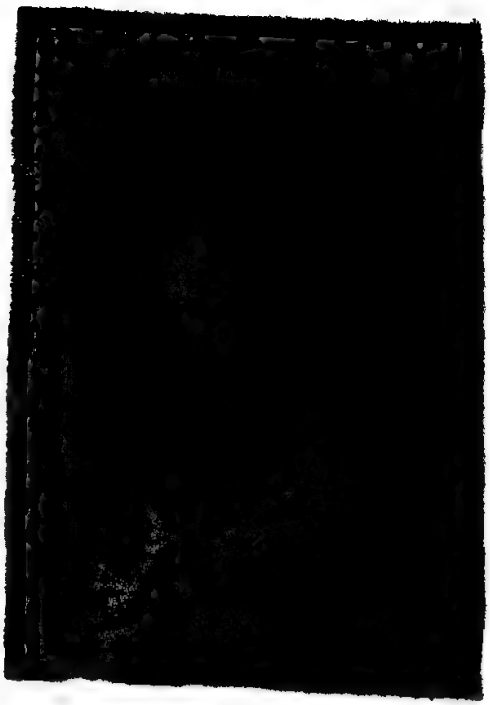

مشتاق احمد یوسفی

سے انٹرویو

آصف قرشی۔ یوسفی صاحب اس سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے آخر کار انٹرویو کے لیے وقت دے ہی دیا۔ آج کی اس گفتگو کو برپا کرنے کا بندوبست کرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوتا رہا کہ جیسے آپ انٹرویو دینے سے کچھ پہلو بچا رہے ہیں یا کنی کترا رہے ہیں۔ کیا میرا یہ قیاس درست ہے؟

مشتاق احمد یوسفی۔ بھئی، یہ ایک حد تک درست ہے۔ اس معنی میں کہ میں اپنے آپ کو کافی عرصے سے ایک گوشہ نشین بلکہ پردہ نشین ادیب سمجھتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ میں ادبی تقریبوں میں بہت کم آتا جاتا ہوں۔ اور آپ کے ساتھ تو جواب کی کچھ اور بھی وجہ ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ ایک انگریزی پرچے کا نمائندہ یا اُس میں لکھنے والا، ایک اردو لکھنے والے کو انٹرویو کرے تو وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے سرجیکل دستانے پہن کر آپ پلاؤ کھائیں۔ تو پلاؤ کی آدھی لذت تو ہاتھ سے کھانے میں ہے اور

اسی میں اس کا لطف ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کا سوال ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ انٹرویوز جو عام طور سے ہوتے ہیں ان میں ہر بار کے وہی سوال آ جاتے ہیں۔ بیش تر اس میں نجی نوعیت کے سوال ہوتے ہیں۔ ادیب کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ تو اپنی تحریر میں کہہ چکا ہوتا ہے۔ اگر اس میں کچھ تشنگی ہے تو یہ اس کی تحریر کی اور اس کے ادیب ہونے کی تشنگی ہے۔ اس کی ضرورت بالکل نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زبانی بھی کچھ کہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ چنانچہ اپنے بارے میں اور اپنے فن کے بارے میں جو بھی چیز میں نے کہنے کے لائق سمجھی وہ تحریر میں آ گئی۔ اب اس کے علاوہ جو نجی قسم کے سوالات ہوتے ہیں اس میں لوگوں کو ایک دوسری قسم کی دل چسپی ہوتی ہے جس کا خالصتاً ادبی دل چسپی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً یہ کہ شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی یا اپنی بیگم کی مرضی سے۔ آپ نے مضمون کب لکھا اور کیسے لکھا اور کیوں لکھا۔ تو ان سوالات کے جوابات، میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تحریروں میں کافی دے دیا ہے اور اس کے بعد جو انٹرویوز میں آج کل ایک رجحان ہے وہ یہ ہے کہ یا تو کوئی چونکا دینے والی بات اپنے بارے میں یا اپنے معاصروں کے بارے میں، یا کوئی اشتعال دلانے والی بات آدمی کہے جس سے اس کو پبلسٹی ملے۔ وہ ہو یا پھر ایک دوسری قسم ہے انٹرویوز کی جس کو آپ CRAFTED CONVERSATION کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی تحریر کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ WELL-RENEASED ہوتی ہے اور ریکارڈ کرا دی جاتی ہے۔ تو میں اپنے آپ کو ان دونوں کاموں کے لائق نہیں سمجھتا۔ اس لیے کم ہی انٹرویوز کا موقع ملتا ہے۔

سوال:۔ کرنل محمد خاں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی ہے اور شاید ایسی باتیں انٹرویوز میں ہی کہی جاتی ہے کہ بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے ہیں اور ان میں سے کئی مایوس ہو کر چلتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہوتا

ہے جس قسم کی تیزی اور طراری اور شوخی اور چونچالی کرنل صاحب کی تحریر میں ہے۔ تو ان کی گفتگو بھی کچھ اسی قسم کی ہوگی کہ کیسے باتوں میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں گی۔ اور جب ان لوگوں کا سامنا گوشت پوست کے ایک آدمی سے ہوتا ہے جو کبھی دل چسپ باتیں کرتا ہے اور کبھی اس کی طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی۔ تو وہ کچھ مایوس ہو کر جاتے ہیں۔ تو طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کیا آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ لوگ، اور ان میں اطرز بو کے خواہش مند افراد بھی شامل ہیں، ایسی توقعات لے کر آتے ہیں کہ گویا وہ چراغ تلے اور زرگزشت کا چلتا پھرتا اور متکلم نمونہ ایک شخص کی صورت میں پائیں گے۔

یوسفی۔ درست ہے آپ کا یہ خیال، اس لیے کہ بیش تر پڑھنے والوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مزاح نگار جیسا کچھ اپنے کرداروں کی صورت میں نظر آتا ہے کتاب میں ویسا ہی وہ خود بھی ہوگا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں کبھی۔ یہ غالباً "ڈان کیہوٹے" کے مصنف کا لطیفہ ہے کہ وہ ایک محفل میں گیا اور وہاں ایک ایڈمرل صاحب تھے انھوں نے یہی بات کافی دیر ان کی گفتگو کا انتظار کر کے کہی۔ انھوں نے کہا کہ صاحب بڑی ملولی ہوئی آپ سے مل کر۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ کتاب میں شگفتگی ہے شروع سے آخر تک۔ تو اس نے بڑا معقول جواب دیا۔ اس نے کہا کہ دیکھیے اتنی دیر سے آپ بھی بیٹھے ہیں اور میں بھی بیٹھا ہوں، میں نے آپ سے توپ چلانے کے لیے تو نہیں کہا جو آپ کے فرائض میں داخل ہے۔ تو آپ مجھ سے یہ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ میں یہاں پر پھلجھڑیاں چھوڑوں گا۔ تو کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے کہ لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ کوئی بہت ہی بذلہ سنج آدمی اپنی صحبت میں بھی ہوگا۔ ایسا ہوتا نہیں، اور جن cases میں ہوتا ہے ان کی نوعیت دوسری ہوتی ہے اور وہ بہت ہی نادر ہیں۔ مثلاً شوکت تھانوی صاحب تھے ان میں البتہ یہ خوبی تھی کہ تحریر سے کہیں زیادہ دل چسپ اور شگفتہ وہ صحبت میں ہوتے تھے

ان سے بہتر، ان سے کوئی ملنا دشوار تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مصنف سے ملنے کی بہترین صورت جو ہے وہ دو COVERS کے درمیان ہے۔ اور پھر اگر گوشت پوست کے مصنف سے آپ مل رہے ہیں تو پھر آپ کتاب کو بھول جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسری شکل آپ کے سامنے ہے اس کی پذیرائی پھر آپ پر لازم ہے، جیسا کچھ بھی وہ ہے۔

سوال :۔ شوکت تھانوی کا آپ نے ذکر کیا تو ان کے بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں یہ بات بہت آسانی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذکاوت اور بذلہ سنجی کو اپنی گفتگو میں اس طرح بے دریغ لٹایا کہ اپنی تحریر میں وہ بات پیدا نہ کر سکے۔ آسکر وائلڈ کے بارے میں آپ نے کہا ہے کہ اس نے اپنا ٹیلنٹ اپنی تحریر میں صرف کیا اور اپنا جینیس اپنی زندگی میں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی احتیاط پسندی آپ کو ایسی صورت حال سے محفوظ رہنے کی یہ راہ سجھا رہی ہو؟

یوسفی :۔ دیکھیے صورت یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس ذہانت کا اور بذلہ سنجی کا، اور ایک لحاظ سے، اگر وہ طنز نگار ہے یا مزاح نگار ہے تو تلخی کا یا کونین کا ایک محدود سرمایہ ہوتا ہے کسی کے پاس کم، کسی کے پاس زیادہ، یہ دوسرا سوال ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ ایک دو قطرے کونین کے آپ ایک گلاس میں ڈال دیں تو پورا گلاس کڑوا ہو جائے گا لیکن وہی کونین کے دو قطرے آپ کسی بہت بڑے حوض میں ڈال دیں تو اس کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ لہٰذا بہت سے مصنف ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو DILUTE کرتے رہتے ہیں مستقل، کہ جب کہنے کی بات نہیں رہی جو کہنے کی بات تھی وہ کہہ چکے اس کے بعد بھی کہے چلے جا رہے ہیں تو پھر کوئی بات بنتی نہیں۔ اسی لیے کوئی نام لینے کی چنداں ضرورت نہیں اور میرے ذہن میں اس وقت معاصرین ہیں بھی نہیں، مگر یہ اودھ پنچ کے جو لکھنے والے تھے اکثر ایسے

بوطیقا تھا اس کے شگوفوں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں خاص طور سے
کہ ان کی ساری ظرافت اور ساری برجستگی اور ساری شگفتگی جو تھی وہ صرف
الفاظ کے گرد گھومتی تھی۔ اس میں کوئی خیال یا کوئی SITUATION یا
کوئی جذبہ آپ کو اس کے پیچھے نظر نہیں آتا۔ وہ الفاظ کا نیا گلا تھی جیسے بچے
LEGO یا پہیلیوں کے سیٹ سے مختلف چیزیں بناتے رہتے ہیں، اسی طریقے
سے وہ الفاظ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مزاج جو ہے وہ ایک بہت
ہی سطحی قسم کا اور وقتی قسم کا مزاج رہا ہے۔ اس لیے ان کی پیشانی پر آپ
سوچ کی کوئی لکیر نہیں دیکھیں گے۔ میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مزاج کہ جو آپ
کو سوچنے پر مجبور کرے وہ نا پختہ ہے۔

سوال۔ یوسفی صاحب! آپ نے دو قسم کے مزاج میں تفریق کی۔ مزاج کا ایک
انداز وہ ہے کہ جو مضحک SITUATION یا واقعات کے سلسلے سے قارئین
میں لطف طبع پیدا کرتا ہے اور انھیں ہنساتا ہے۔ دوسرا مزاج وہ ہے جو
سوچنے پر اکساتا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے ہاں مزاج کا ایک انداز تو
وہ رہا کہ جیسے آپ نے اودھ پنچ کا ذکر کیا، یا پھر کلندر لے رومانی ہیرو کے
بارے میں جو افسانے لکھے گئے، جب کہ آپ کا مزاج کا ڈھنگ دوسرا ہے
، مزاج جو کبھی تکلیف بھی دیتا ہے، سوچنے پر بھی اکساتا ہے۔

یوسفی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تفکر کو اور تفنن کو میں یک جا دیکھنا چاہتا
ہوں۔ کوئی ایسی SITUATION جس میں محض HORSE-PLAY ہو،
اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، اور آج کل ایک بات خاص جو
نئی اصطلاح ہے خصوصاً مغرب میں کہ مزاح لکھنے والے اب تقریباً ناپید ہو گئے
مغرب میں۔ میں پہلے بھی کسی انٹرویو میں ذکر کر چکا تھا کہ جارج میکش نے
جو اس دور کا سب سے بڑا مزاح لکھنے والا تھا، اس نے میرے خیال میں
دس سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی JEST IN MEMORIUM اور اس

میں اس نے اسی بات کا تجزیہ کیا تھا کہ مغرب میں مزاح مر کیوں گیا تو جہاں تک مغرب کا تعلق ہے تو اب اس میں نئے مزاح لکھنے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں قدآور قسم کے۔ ہمارے یہاں البتہ ایک کھیپ آئی ایک دم اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مزاح نگاری کا یہ ایک سنہری دور تھا جس میں شفیق الرحمٰن تھے، اور تھے کیا ہیں، کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، محمد خالد اختر اور سرفہرست ابن انشا، اور ہندستان میں مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم ہیں۔ اور رشید احمد صدیقی اور پطرس تو ان سے پہلے ہیں ہی لیکن یہ جتنے نام میں نے آپ کو گنوائے ان میں پطرس اور رشید احمد صدیقی اور ابن انشا، یہ تو مرحوم ہوئے اور باقی کے جتنے نام ہیں ان میں غالباً مجتبیٰ حسین کو چھوڑ کر کسی لکھنے والے کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہے۔ تو جہاں یہ بات بہت ہی فرحت ناک ہے کہ اتنے قدآور لکھنے والے ایک ساتھ ابھرے اردو کے افق پر، وہاں یہ چیز تکلیف دہ بھی ہے کہ ان کے بعد کی جو صف ہے اس میں ایسے قد و قامت کے لوگ فی الحال ابھرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ممکن ہے کہ جو معاشرے کا مزاج ہے مغرب میں اسی کے لحاظ سے ہمارے ہاں بھی کچھ تبدیلیاں آئی ہوں۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔

سوال :۔ اس کی ایک صورت تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جیسا کہ آپ سے ابھی ذکر ہو رہا تھا کہ پڑھنے والے مزاح نگار کے تئیں کیا توقعات اور کیا رویے رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں مزاح نگار کی گفتگو سے تو لوگ دلچسپی کا بہت اظہار کرتے ہیں یہاں تک کہ اس سے ہر وقت PERFORMANCE کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات اس کی تحریر سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں برداشت اور تحمل اور عالی حوصلگی کو جس حد تک قومی مزاج میں شامل ہونا چاہیے شاید اس کی کمی ہے۔ اچھے مزاح کو APPRECIATE کرنے کے لیے ان عناصر کی جس قدر ضرورت ہے اس کا فقدان نظر آتا ہے اور اس پر

یہی بڑھتی جا رہی ہے اور صرف ادب کے میدان میں نہیں بلکہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں۔ مثلاً فلمی و ٹیلی ویژن پر کسی ایک فرقے سے تعلق رکھنے والا کردار مزاحیہ انداز میں دکھایا گیا تو اس فرقے کے تمام لوگوں نے یا اس پیشے سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں نے یہ سمجھا کہ صاحب ہماری توہین ہو گئی اور ٹی وی والے ہم سے معافی مانگیں یا اخبار والے ہم سے معافی مانگیں۔ ایسی ذہنیت کا مظاہرہ بار بار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے حالات اور ایسی فضا مزاح نگاری کے لیے نقصان دہ ہے؟

یوسفی۔ دو چیزوں میں ہمیں تفریق کرنی چاہیے۔ طنز اور مزاح۔ ہماری اردو میں بدقسمتی سے دونوں لفظ یک جا استعمال ہوتے ہیں کہ طنز و مزاح۔ انگریزی میں مثلاً آپ یہ COMBINATION نہیں دیکھیں گے۔ ایسے نہیں کہتے جیسے کہ ہم HUMOUR & SATIRE۔ کوئی شخص اگر ہے تو وہ SATIRIST ہے یا HUMORIST ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہوگا کہ وہ SATIRIST اور HUMORIST دونوں ہو۔ تو جہاں مزاح کے اپنے تقاضے ہیں کہ مزاح کوئی شخص لکھ نہیں سکتا جب تک کہ اس نے اپنے موضوع سے یا اپنے ہدف سے جی بھر کے اور روح کے محبت نہ کی ہو۔ محبت شرط اول ہے طنز میں یہ قطعی ضروری نہیں۔ طنز میں ایک تنفر سے ابتدا ہوتی ہے، ایک بے گانگی سے ابتدا ہوتی ہے کہ میرے گرد جو کچھ ہو رہا ہے میں اس کا حصہ نہیں ہوں میں اپنے آپ کو اس سے کوئی رشتہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں پاتا۔ جب کہ مزاح نگار جس مضحک کردار کا یا جس مضحک SITUATION کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کو پیار ہوتا ہے، محبت کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ تو یہ تو ہوا مزاح نگار کا اپنا رویہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جس پر تنقید کی جائے یا جس کا مضحکہ وہ اڑاتا ہے یا CARICATURE جس کا ترجمہ میں عام طور پر مسخرا کرتا ہوں یعنی مسخ، خاکہ۔ ان دونوں

کو ملا کر ایک لفظ میں نے بنایا ہے CARICATURE کے لیے، تو مسخرگی جس کا وہ کھینچتا ہے، تو اتنی سہار اس معاشرے میں، ان کرداروں میں ان اہداف میں ہونی چاہیے کہ وہ اس کو برداشت کر سکیں۔ ہمارے ہاں، جیسا آپ نے اشارہ کیا کہ کسی کے بارے میں آپ لکھیں تو وہ اپنے آپ کو لکھیں تو وہ اپنے آپ کو ایک خاص طبقے کا یا ایک خاص پیشے کا یا ایک خاص گروہ کا نمائندہ سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر وکیل ہے تو کہے گا کہ آپ نے وکیلوں کی بے عزتی کی، اور اگر بزنس مین ہے تو وہ اپنے آپ کو جرنس کمیونٹی کا علمبردار کہے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی کے بارے میں بھی کوئی تیز بات یا حقیقت پسندانہ تصویر کھینچنے میں آپ کو خاصا تامل ہوگا۔ تو یہ چیز البتہ مانع ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے والا ہر حال میں اور ہر کیفیت میں لکھے، اس کو کوئی چیز روک نہیں سکتی، اور وہ فارسی کی ایک مثل ہے کہ برہنہ حرف نتوان گفتن کمالِ گویائی، تو اس میں یہی حکمت ہے کہ برہنہ حرف ہم نہیں کہہ رہے ہیں تو پھر ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ہر حال میں اور تمام قدغن کے باوجود ہم کوئی نہ کوئی پیرایۂ اظہار نکال لیں گے، اور ایسا ہی ہوتا ہے۔

سوال :۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے خیال میں ہمارا معاشرہ طنز نگار اور مزاح نگار دونوں کے لیے مواقع اور خام مواد وافر مقدار میں فراہم کرتا ہے۔

یوسفی :۔ اس وقت تو بہت ہے لکھنے والے کے لیے۔ وہ تو بکھرا پڑا ہے چاروں طرف۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی معاشرہ نہیں بلکہ ہر معاشرہ خام مواد تو فراہم کرتا ہے لکھنے والے کو جتنا وہ لکھنا چاہے۔ لیکن ایک ایسا معاشرہ کہ جس کے مسائل اتنے گمبھیر ہوں اور جس میں اتنے تضادات ہوں اور جو اتنا CORRUPT ہو گیا ہو تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سا بھی سرا آپ اٹھا لیں تو اس میں آپ جتنا چاہیں اس کی نقاب کشائی کرتے چلے جائیں۔

سوال :- میرے سوال کا بھی مقصد تھا کہ ایسا معاشرہ کہ جس میں رواداری اور برداشت کم ہوتی چلی جا رہی ہوں اور مقدس گائیں یا sacred cows کو چھیڑنے کی اجازت نہیں ہے، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہو تو ایسے معاشرے میں مزاح لکھنے کے لیے قلم اٹھانا کئی طرح کے پیشہ ورانہ خطرات کا حامل نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابھی یہ بھی فرمایا کہ اب اس قسم کے جید لکھنے والے تھے مزاح کے میدان میں، تو اب ان کی جگہ لینے کے لیے نئے لکھنے والے اس تعداد میں یا اس معیار کے مطابق سامنے نہیں آ رہے۔ تو کیا ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تعلق ہے؟ کہیں یہ تعلق سبب کا تعلق تو نہیں؟

یوسفی :- میں سمجھتا ہوں کہ جو فرق ہیں پچھلی نسل اور موجودہ نسل میں محسوس ہوتا ہے، کچھ خاص شعبوں میں، وہی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کم و بیش محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایسا ہے کہ زرخیز مضمون تازہ کبھی بند نہیں ہوتی۔ اور یہ سمجھنا کہ اب کوئی اچھے لکھنے والے نہ آئیں گے، یہ بالکل غلط ہے۔ اس سے بھی بہتر لکھنے والے آئیں گے، اور اسی سے دنیا قائم ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنا بے معنی ہوگا۔ صرف موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نہج و قامت کے لوگ نکل نہیں رہے، نکلیں گے ضرور۔

سوال :- آپ نے جن مزاح نگاروں کا ابھی ذکر کیا تھا، آپ ان میں سے کن لوگوں سے ذہنی قربت محسوس کرتے ہیں؟ یعنی جب آپ کا ہنسنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے کتاب پڑھنے کا جی چاہتا ہے تو آپ کیا پڑھتے ہیں؟ یعنی 'خاکم بدہن' اور 'زرگزشت' کے علاوہ؟

یوسفی :- پہلی چیز تو یہ کہ میں اپنی کتاب کبھی نہیں پڑھتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا کوئی عذاب کسی ادیب کے لیے نازل نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی تحریر

آپ پڑھیے۔ میرے خیال میں ہم لوگوں کو جو سزا دی جائے گی وہ یہاں
کو جو سزا دی جائے گی وہ سزا بھی ہوگی کہ ابد الآباد تک ہم سے جہاں تک نہیں
پڑھوائی جائیں۔ اس کا تجربہ مجھے ابھی ہوا۔ مثلاً یہ کہ اس کو مجھے ہوئے بارہ سال
کا عرصہ ہوا "زرگزشت" جو میری آخری کتاب ہے، جب میں نے اپنی یہ
کتاب تقریباً مکمل کر لی تو ایک خیال مجھے یہ آیا کہ بارہ سال سے میں نے
اپنی کوئی کتاب یا آخری کتاب کم از کم نہیں دیکھی ہے تو اس میں مجھے جملوں
کی اور خیالات کی تکرار کا خدشہ محسوس ہوا۔ تو بارہ سال بعد جب میں نے
وہ کتاب پڑھی تو اس میں واقعی مجھے محسوس ہوا کہ کچھ جملوں کی تکرار ہے۔
لیکن وہ ایک بڑا عذاب تھا اور اب جو میں اس کتاب کے پروف پڑھ رہا
ہوں تو وہ ایک اس سے بھی بڑا عذاب ہے۔ لیکن یہ میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں کہ اس کے بعد انشاء اللہ میں ان تحریروں کو اب نہیں پڑھوں گا۔ اب
دوسرے مضمون کا آپ نے جو کہا، تو میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب
اس معنی میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی سعادت نصیب کی کہ اتنا
اچھا مزاح پڑھنے کو ملا۔ یہ جتنے نام میں نے آپ کو گنوائے، جنرل شفیق الرحمان،
کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، ابن انشا، محمد خالد اختر، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم
اور دوسرے، اور پطرس اور رشید احمد صدیقی، تو ظاہر ہے کہ سرفہرست ہیں۔ تو یہ
تو ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم ایسے دور میں پیدا ہوئے کہ جس میں یہ لوگ ہیں
پڑھنے کو ملا۔ اگر یہ حضرات نہ ہوتے تو ہم بھی نہ ہوتے۔ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ
اسی لیے لکھ رہے ہیں کہ یہ حضرات ہم سے پہلے یا ہمارے زمانے میں لکھ رہے تھے
جہاں تک پسندیدگی کا تعلق ہے تو وہ تو سب پسند ہیں لیکن پطرس آج بھی
ایسا ہے کہ کبھی گاڑی اٹک جاتی ہے تو اس کا ایک صفحہ کھولتے ہی تو ان کی بہت
سی تحریریں نکل جاتی ہیں اور قلم رواں ہو جاتا ہے۔ یہ پطرس میں بات ہے لیکن
ایک بات میں عرض کر دوں کہ یہ سوال گھوم پھر کے آتا ہے جہاں تک میرے

تاثر کا تعلق ہے، وہ انگریزی مصنفین ہیں۔

سوال:۔ اچھا، مثلاً کون سے مصنف آپ کو پسند ہیں؟

یوسفی:۔ مثلاً مارک ٹوئین جو بابا آدم ہیں مزاح نگاری کے۔ سولنٹ، وہ اتنے HUMORIST نہیں کہ جتنے SATIRIST ہیں۔ اسٹیفن لی کاک۔ پھر جارج مکیش۔ اور اردو مصنفین میں جیمز جوئس اور پھر انتھونی برجیس ANTHONY BURGESS ان سے میں اگر یہ لفظ بھی استعمال کیا جائے تو ان سے INFLUENCED ہوا ہوں اگر پوچھا جائے کہ کس سے INFLUENCED ہوا تو ان کا نام لوں گا ایک زمانے میں لارنس ڈیرل LAURENCE DURRELL بھی بہت سطح رہا تھا اور کبھی کبھی مجھے اس وجہ سے ضرور مایوسی ہوتی ہے کہ لوگ میری تحریروں میں تحقیق یا دمی پر چھائیاں، کبھی رشید احمد صدیقی کی یا کبھی پطرس کی ان کو دکھائی دیتی ہیں لیکن جو میرے اصل ماخذ ہیں ان کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی۔

سوال:۔ مجھے اس وقت میں جیمز جوئس کا نام سن کر قدرے تعجب ہو رہا ہے اس کا اندازِ تحریر آپ کے لکھنے کے انداز سے بہت مختلف ہے۔

یوسفی:۔ طنز نگار تو وہ نہیں ہے لیکن ایک تکنیک جو مونتاج کی ہے اور PASTICHE بھی اس میں ہے کہیں کہیں وہ تو اپنی جگہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے بڑا ناول نگار اور اس سے زیادہ..... کیا لفظ میں استعمال کروں اس کے لیے..... قوت سے لکھنے والا مشکل سے ملے گا تو یہ ضروری نہیں کہ ہم متاثر کسی مزاح نگار سے ہی ہوں، قطعی نہیں۔ جہاں تک اس کے لکھنے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک وہ انگریزی نثر میں حرفِ آخر ہے اور اگر کسی کو ناول لکھنا ہے تو جیمز جوئس راہ میں ایک پہاڑ بھی ہے اور مینارۂ نور بھی ہے۔ جیسا بھی آپ اس کو سمجھیں مگر وہ ہے اپنی جگہ۔ اس لحاظ سے جیمز جوئس سے خصوصاً پچھلے دس سال میں بیزیلہ

متاثر ہوا ہوں۔ اور اب انگریزی میں [illegible]
ذکر ہوں، تو اب تو جو کچھ بھی پڑھتے ہیں وہ ظاہر ہے تنقیدی ہے [illegible]
ایسا ہے کہ اب جتنے بھی لکھنے والے ہیں جو کامیاب ناول نگار ہیں [illegible]
میں ایک PUNGENT اور ASTRINGENT عنصر پائیں گے اور اس کے بغیر
ان کے ناول بکتے بھی نہیں چاہے جتنے ہی سنجیدہ لکھنے والے ہوں [illegible]
میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

سوال :۔ مغرب میں طنز اور مزاح کو ادب کی ایک الگ صنف سمجھنے کے بجائے ناول اور افسانے میں اس کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ ممکن ہے کہ مزاح نگاری میں کم لوگوں کے سامنے آنے کا جو آپ نے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہی ہو۔

یوسفی :۔ جی ہاں صحیح ہے۔ میں نے کہیں کہا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ہر چیز میں حل ہو جاتی ہیں۔ مذہب، الکحل اور مزاح۔ یہ آپ جس چیز کے ساتھ چاہیں بڑی آسانی سے انھیں ملا سکتے ہیں MIX UP کر سکتے ہیں۔ مختلف تجربے بڑے دلچسپ ہوتے رہے ہیں۔

سوال :۔ ان تینوں چیزوں میں اس کے علاوہ بھی کوئی مماثلت آپ کو نظر آتی ہے؟

یوسفی :۔ اور تو بظاہر نہیں ہے۔ ایک البتہ مماثلت آپ کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ "بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی" اور یہ اتنا اچھا مصرعہ اتنا جامع اور مکمل مصرعہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرعہ نہ میں نے کبھی یاد کرنے کی کوشش کی اور نہ مجھے اس کا ملال کہ مجھے اس کا دوسرا مصرعہ یاد نہیں۔ بات غالب یہ کہتا ہے کہ آشوبِ آگہی جو ہے، عقل کا جو فتور ہے اور عقل جس آزمائش اور عذاب میں انسان کو ڈالتی ہے اس کے مقابلے کے لیے کسی نشے کی ضرورت ہے۔ اس آشوبِ آگہی کا مقابلہ بغیر کسی نشے کے نہیں ہو سکتا۔ اس نشے کی مختلف شکلیں ہیں جس کو جو نشہ راس آئے اور موافق آئے

مثلاً یہ کہ کسی کو تصوف راس آگیا کسی کو ہیروئن راس آگئی اور کسی نے مزاح میں پناہ لی کسی نے اکمل میں پناہ لی اور کسی نے جنس میں پناہ لی تو یہ تینوں چیزیں جو میں نے گنائیں آپ کو، مذہب، اکمل اور مزاح، یہ تینوں پناہ گاہ ضرور ہیں یعنی درجہ ان کا غیر مساوی ضرور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مساوی ہیں لیکن اپنے اپنے طور پر تینوں SEDATIVES ہیں لیکن یہ سوال آؤٹ آف کورس پوچھا آپ نے ہم سے۔

سوال۔ آؤٹ آف کورس تو پوچھا لیکن اس کا جواب آپ نے ایسا بلیغ دیا کہ بابو شاید بلکہ مزاح کے بارے میں آپ نے اتنی سنجیدگی کا اظہار کیا کہ اس سے مزاح کے بارے میں ایک مشن کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔

یوسفی۔ ایسا ہے کہ زندگی کو گوارا بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا آدمی ڈھونڈتا ہے۔ اگر VALIUM آج سے دو ہزار سال پہلے دریافت ہو گئی ہوتی تو بہت سے فلسفے وجود میں ہی نہ آتے۔ انسان کا مسئلہ دوسرے طریقے سے حل ہو جاتا لیکن اب ایسا ہے کہ زندگی کو قابل قبول اور گوارا بنانا اور خلق خدا کو بھی گوارا اور قابل قبول اپنے لیے بنانا، اس کے اپنے تمام تضادات کے باوجود یہ فریضہ ..... فریضہ اس معنی میں کہ خوش رہنا ہر انسان کا حق ہی نہیں فرض بھی ہے ..... اور جو شے بھی اس فریضے کی ادائیگی میں ممد و معاون ثابت ہو وہ نہایت مفید ہے۔ تو اس لحاظ سے مزاح زندگی کو زیادہ گوارا، زیادہ خوشگوار بنا دیتا ہے اور ممکن ہے کہ راہ میں پھول نہ کھلاتا ہو لیکن کانٹے بہت سے ہٹا دیتا ہے راستے سے۔ اب مذہب اس کو رضائے الٰہی میں راضی رہنا کہتا ہے دانتے اپنے طور پر کہتا ہے کہ:

IN HIS WILL ALONE, WE SHALL FIND PEACE.

مزاح دوسرے طریقے سے ایک بھونا کرتا ہے زندگی کے ساتھ، کہ جو چیز ہمیں بظاہر ..... میں اس کے لیے انگریزی کے الفاظ استعمال کروں گا .....

[illegible] HOSTILE [illegible] ANAMOLOUS [illegible] INCONGRUOUS
یا ABNORMAL [illegible] یا ABSURD [illegible] ..... [illegible]
جن کو مزاح قابل قبول بنا دیتا ہے اس لیے کہ یہی اس کے موضوعات ہیں۔ اس
لحاظ سے مزاح زندگی کو سہنے کے لائق اور ENJOY کرنے کے لائق بناتا ہے
اور بھی چیزیں بناتی ہے ان میں یہ بھی ایک ہے۔

سوال :- بات کا رخ بدل گیا ورنہ میں آپ سے دوسری نوعیت کا سوال پوچھنے
والا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کی ان دونوں کتابوں کے درمیان کوئی بارہ
تیرہ سال کا وقفہ ہے۔ آپ کی اکثر تحریروں کی درمیانی مدت خاصی طویل
ہوتی ہے۔ اس سے لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ اپنی تحریر کو سجانے اور بنانے
میں بہت وقت صرف کرتے ہیں۔ اس خیال کو تقویت آپ کے اسلوب کے انداز
سے بھی ہوتی ہے جس میں تزئین و آرائش کا خاصا دخل ہے۔ شاید اسی وجہ سے
لوگوں نے آپ پر نہ صرف زبان و بیان بلکہ خیال کے سلسلے میں بھی مشکل پسندی
کا الزام لگایا ہے۔ کسی بھی مزاح نگار کے لیے یہ الزام کس قدر عجیب ہے!

یوسفی :- دیکھیے جب ہم کسی چیز کو مشکل کہتے ہیں ادب میں تو اس کے دو مطلب ہو سکتے
ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو خیال یا جس جذبے کا اظہار منظور ہے وہ خود بہت ادق اور
پیچیدہ ہے یا اس کا پیرایۂ اظہار جو ہم نے اختیار کیا وہ گنجلک ہے۔ یہی دو
شکلیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک خیال کا تعلق ہے اس میں تو کوئی
ایسی بات مجھے نظر نہیں آتی کہ جس کو یہ کہا جائے کہ کوئی بہت ہی عمیق یا فلسفیا
بات میں نے کہہ دی جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ ایسا تو میں نہیں سمجھتا۔
اب رہا اس کا کہ الفاظ نامانوس ہو سکتے ہیں، الفاظ ادق ہو سکتے ہیں تو اس میں
میری ایک گزارش ہے اور وہ یہ کہ ذہن میں یہ رکھیے کہ ہماری لفظیات یا VOCA-
BULARY - دن بدن تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آپ حالی کے زمانے
کی اردو اٹھا کر دیکھیں یا غالب کے زمانے کی دیکھیں، شبلی کی اردو دیکھیں [illegible]

آزادی کی اردو دیکھیں، پھر آپ ادھر جدید عہد میں آجائیں، رشید احمد صدیقی کا بیان دیکھیں۔ آپ اس میں بے شمار ایسے لفظ پائیں گے جن کو آج کا قاری مشکل پاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے طے کر رکھا ہے کہ میری جتنی لفظیات ہے اس کو میں بڑھاؤں گا نہیں، جتنا میں نے سیکھ لیا میٹرک پاس کر کے یا بی اے پاس کر کے وہ کافی ہے۔ اور اس کے بعد میں اس میں کوئی اضافہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر کوئی مصنف ایسا لفظ استعمال کرتا ہے کہ جس سے میں ناآشنا ہوں تو وہ مصنف اپنا طریقۂ اظہار بدلے، میں اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ایک فرق پیدا ہوا ہے کہ ڈکشنری دیکھنے کے لیے لوگ تیار نہیں ہوتے اب اس کا نتیجہ آپ کو ٹی وی پر بھی نظر آتا ہے، ریڈیو پر بھی، اخبارات میں بھی، کہ لکھنے والا ہر وقت ایک خوف زدہ آدمی کی حیثیت سے لکھتا ہے کہ میرے پڑھنے والے اس کو سمجھیں گے کہ نہیں۔ اگر میرے پڑھنے والے اس لفظ کو نہیں سمجھیں گے تو میں کوئی اور لفظ استعمال کر لوں۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ سکڑتا جاتا ہے اور جیسے ایک [illegible] ایجاد ہو گئی تھی کہ دو سو الفاظ میں آپ اپنا ہر مطلب ادا کر دیتے تھے تو اگر ادب اسی کا نام ہے تو ہم بھی دھیرے دھیرے ان دو سو الفاظ کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ غالباً سکڑتے سکڑتے ایک بنیادی اردو بن جائے گی۔ اردو یا کوئی اور زبان، کیونکہ یہ اب سب زبانوں کا مسئلہ ہے ایک اردو ہی کا نہیں۔ اس کے مقابلے میں آپ یہ دیکھیں کہ جب شیکسپیئر نے لکھا آج کوئی چار سو کے قریب برس ہونے کو آئے تو شیکسپیئر کا جو AUDIENCE تھا اس کا پچانوے فی صد حصہ جاہل اور ان پڑھ تھا لیکن شیکسپیئر نے جب لکھا اور ان ہی لوگوں کے لیے لکھا لیکن اس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ جو یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں لوگ اسے سمجھیں گے یا نہیں۔ اس لیے کہ شیکسپیئر کی لفظیات آج بھی میرے خیال میں سب سے وسیع اور سب سے متنوع ہے۔ میرے خیال میں کسی اور انگریزی ادیب یا شاعر نے اتنی کثیر تعداد میں الفاظ استعمال نہیں کیے

ہمارے ہاں ایسی وسیع لفظیات نظیر اکبر آبادی کی تھی ہے۔ [illegible]
کہ جب شیکسپیئر نے لکھا تو اس کو ایسی کوئی INHIBITION نہیں تھی کہ یہ
لفظ میں نے لکھ دیا اور اس کو نہیں بھیجیں گے تو پھر کیا ہوگا میرا [illegible]
نہیں دیکھیں گے یا نکالے نہیں جائے گا۔ آپ دیکھیں کہ اس نے ایک جگہ لکھا ہے
SEAS INCARNADINE یہ لفظ انگریزی میں، میں نے ایک جگہ پڑھا کہ
صرف ایک اور مصنف نے ایک جگہ استعمال کیا، اور کسی مصنف کی ہمت
نہیں ہوئی کہ اس لفظ کو استعمال کرے۔ لیکن شیکسپیئر نے جس جگہ استعمال کیا
ہے آپ کوئی دوسرا لفظ وہاں استعمال کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی جگہ وہ مثال
کے طور پر CRIMSON بھی کہہ سکتا تھا مگر اس نے نہیں کیا۔ اس نے
INCARNADINE کا لفظ استعمال کیا۔ اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی سمجھے گا
یا نہیں سمجھے گا۔ آخر کو سمجھا لوگوں نے۔ تو مصنف اپنی سطح بھی آپ متعین کرتا
ہے۔ ہم یہ کیوں سمجھ لیں کہ ہمارے پڑھنے والے نچلی سطح رکھتے ہیں، طبعی ہیں
نااہل ہیں، ان کی فہم ناقص ہے لہٰذا ہم بات کو بہت آسان کر کے اس طریقے
سے لکھیں کہ جیسے غبی لوگوں کو یا SUB-NORMALS کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہم
ان کو اپنی سطح کو گرا دیں۔ یہ ایک بنیادی فرق یاد رکھنا چاہیے۔ اچھا اب اس
کو آپ ذہن میں رکھیں۔ مثال کے طور پر میں فارسی بالکل نہیں جانتا کم از کم
کو اس بات پر یقین آتا ہے کہ میں فارسی سے بالکل نابلد ہوں۔ تو فارسی عربی
کے الفاظ تو میرے ہاں یوں بھی کم آتے ہیں تو ڈکشنری البتہ ایسا ہے کہ کوئی
دن میری زندگی میں ایسا نہیں گزرا سوائے بیماری کے، جب ڈکشنری میں نے
کم از کم دس مرتبہ نہیں دیکھی ہو۔ اور اگر کبھی میں کسی ویران جزیرے میں [illegible]
آپ کو پایا میں نے SHIP WRECK کی حالت میں، تو میں اپنے ساتھ [illegible]
سے پہلے ڈکشنری لے جاؤں گا۔ اگر مجھے انتخاب کی سہولت دی جائے [illegible]
سب سے پہلے ڈکشنری ہوگی، دوسرا کلام تیسرا اور اس کے ساتھ [illegible]

دلچسپی ہے بہت FASCINATE کرتی ہے اور میں ان لوگوں کو بڑا بدقسمت سمجھتا ہوں جو ڈکشنری نہیں دیکھتے۔ آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ الہ آباد کے جو اپنے زمانے کے بڑے اچھے لکھنے والے تھے اور آج بھی ان کا مقام بہت بلند ہے گو کہ ان کے سماجی نظریات قابل قبول بالکل نہیں ہیں بہرحال قطع نظر اس سے۔ تو ان کا قاعدہ یہ ایک تھا کہ دن میں وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سیکھتے تھے۔ جب دن ختم ہوتا تھا اور رات کو وہ لیٹتے تھے تو وہ اس پر غور کرتے تھے کہ آج میں نے کون سی نئی بات سیکھی۔ اگر اس دن انہیں ایسی کوئی نئی بات نظر نہیں آتی تھی تو پھر وہ یہ کرتے تھے کہ ڈکشنری اٹھا لاتے تھے اور اس میں سے کوئی نیا لفظ سیکھ لیتے تھے۔ تو اس میں مجھے بڑی دانائی اور حکمت نظر آتی ہے۔ کہ اگر کچھ اور نہیں سیکھا تو ایک تو سیکھیں اس لیے کہ لفظ، خالی لفظ نہیں ہے، لفظ تو پورا ایک براعظم ہے۔ براعظم اس معنی میں کہ اس کی اپنی ایک CLIMATE ہے، اس کا اپنا ایک درجۂ حرارت ہے۔ میرا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ

THERE IS NO SUCH THING AS SYNONYMS. WHAT WE CALL AS SYNONYMS ARE ENTIRELY DIFFERENT WORDS.

ایک لفظ ایک معنی میں صرف ایک ہی ملے گا آپ کو۔ اس معنی کا کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوگا۔ یہ ایک نگینہ سا ہے جو انگوٹھی میں ایک خاص سائز کا اور خاص شکل کا ہی ملے گا، دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں آئے گا۔ اگر دوسرا لفظ آتا ہے تو اس کے کچھ اور SHADES ہوں گے۔ مثلاً میں یہ کہتا ہوں کہ اب اس کھکھیڑ میں کون پڑے، اس الجھیڑے میں کون پڑے، اس مشکل میں کون پڑے یا اس عذاب میں کون پڑے۔ حضور میں تو کھکھیڑ ہی کہوں گا۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب کھکھیڑ آج کل مانوس نہیں ہے تو میں معذرت کروں گا کہ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ کچھ ایسا تعلق ہے ہر لفظ کے ساتھ

کسی بھی زبان کا لفظ ہو، ہر زبان میں ایک مفہوم کا محض ایک ہی لفظ نہیں
اور جس کو ہم متبادل سمجھتے ہیں اور مترادف سمجھتے ہیں وہ کوئی دوسرے
ہے جو لفظوں کے مزاج داں ہیں جیسے انشاجی تھے۔ انشاجی لفظوں کے بڑے
مزاج داں تھے۔ اور انشاجی کے جہاں اور بڑے کارنامے ہیں، میں نے تو ایک
زمانے میں یہ کہا تھا اور ایک زمانے میں کیا، میں تو اب بھی اس پر قائم ہوں
جو میں نے کہا تھا کہ انشاجی ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ اس پر
کچھ دوست آزردہ بھی ہوئے اور ایک آدھ تحریریں پریس میں بھی آئیں جس
میں میری چھتاڑ کی گئی۔ حالانکہ میری چھتاڑ کرنے سے انشاجی کی عظمت میں
کوئی فرق نہیں آتا۔ مجھے آپ نالائق ثابت کر کے انشاجی کی عظمت میں کوئی
کمی نہیں لا سکتے۔ اس کے باوجود آپ دیکھیے کہ جس وقت انشاجی کے سامنے
کوئی لفظ آتا ہے تو وہ جھجکتے نہیں ہیں۔ اس معنی میں کہ وہ یہ نہیں سوچتے
کہ یہ لفظ بڑا پرانا ہے، یہ لفظ متروک ہو چکا ہے، یہ لفظ آج کل نہیں سمجھیں گے
وہ اسے بلا تکان اور بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان
کا ایک کارنامہ ہے کہ انھوں نے بعض لفظوں کو بالکل نئی زندگی دی ہے تو
مشکل پسندی کے آپ کے سوال کا جواب تو مل گیا۔

سوال: مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ نقاد حضرات آپ کے اسلوب میں دقت
پسندی کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس میں صناعی بہت ہے، اس میں آورد کا
احساس ہوتا ہے اور یہ کہ اس میں SPONTANEITY نہیں ہے۔ تو کیا آپ
اس اعتراض سے متفق ہیں؟

یوسفی: دیکھیے دوسروں کا کیا تاثر ہے تو اس کے بارے میں تو میں صرف یہی
کہوں گا کہ ممکن ہے وہ تاثر درست ہو لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے
ہاں جس چیز کو SPONTANEITY کہا جاتا ہے، وہ ہم نے شعر سے
ہمارے ہاں اس بات پر بڑا فخر کیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب

لکھتے ہیں اور جو لکھ دیتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔ یہ بات بڑی فخر و بیان کی جاتی ہے اور بڑی تعریف کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہی بات آپ انگریزی میں لکھ دیں تو اس سے بڑا CONDEMNATION اس شخص کا نہیں ہو سکتا کی نہایت کاہل آدمی ہے وہ۔ جیسے ہیمنگ وے ہے۔ ہیمنگ وے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ اس سے زیادہ سلیس، سادہ انگریزی اور مفرد الفاظ کسی نے استعمال نہیں کیے بلکہ جو مکالمہ اس نے لکھا اس کی مثال اس سے پہلے کوئی نہیں ملتی بے ساختگی کی۔ اور اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ صاحب اس نے تو زبان کو، جو اس کا BAREST MINIMUM ہوتا ہے اس پر لے آیا۔ درست اپنی جگہ۔ اس کو نوبل پرائز جس کتاب کے بعد ملا تھا OLD MAN AND THE SEA یہ کتاب جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی سوا سو صفحے کی کتاب ہے۔ اس وقت تک اس کتاب کے نوے مسودے مل چکے ہیں۔ وہ تو خیر ٹائپ میں تھے لیکن اس وقت تک نوے تصحیح شدہ ڈرافٹ اس کے مل چکے ہیں۔ یہ اس شخص کا ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس سے زیادہ SPONTANEOUS کوئی اور نہیں تھا۔ ہر فن ایک ریاض چاہتا ہے۔ اگر اس میں آورد معلوم ہوتی ہے تو وہ میری محنت کا قصور نہیں ہے میرے فن کی خامی ہے۔ تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے زیادہ محنت کی اس لیے خراب ہو گیا بلکہ یہ ہے کہ میرے فن میں خامی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ خیال کر لینا کہ بعض لکھنے والے ایسے ہیں جو قلم زد نہیں کرتے یہ بڑا تو کوئی خوبی کی بات قطعی نہیں۔ اور اس کے فن کی اچھائی یا برائی سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ دیکھیے کہ ہیمنگ وے ایک ہی ناول پر پندرہ سال کام کرتا رہا مرنے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کی تصحیح کر رہا تھا۔ اب اگر اس میں کوئی کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ فنی خامی الگ چیز ہے لیکن اس پر ہم اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا کر لیں گے کہ میری نے اتنا غور کیوں کیا یا اس کے لکھنے میں۔ اب جہاں تک میرے

بارہ سال کا تعلق ہے تو اس عرصے میں کچھ پیشہ ورانہ [illegible]
آئیں۔ میں یہاں سے لندن چلا گیا، پھر وہاں میری بیماریوں کا سلسلہ شروع
ہوا۔ دل کی بیماری اور السر دغیرہ۔ اب ایک اور آپریشن میرا ہونے والا ہے
پہلی آپریشن حال ہی میں ہرنیہ کا ہوا تھا۔ آپ مسکرا رہے ہیں۔ حالانکہ نہیں
ختم ہو جاتی ہے۔ گردے کی اس تکلیف کی وجہ سے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ لکھ
نہیں سکتا۔ پچھلے سات آٹھ سال سے یہ تکلیف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں
آپ کو بتا دوں کہ میں بچپن ہی سے فرش پر بیٹھ کر اور یہاں گھٹنے پر رکھ کر جیسے
کاتب اور منشی اور پرانے زمانے کے بڑے لکھا کرتے ہیں، اردو میں اس طریقے
سے لکھتا ہوں، انگریزی میز کرسی پر بیٹھ کر لکھتا ہوں، انگریزی میں فرش پر
بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا اور اردو میز کرسی پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا۔ تو میں ان الجھنوں
میں گرفتار رہا لیکن اس کے باوجود جیسا میں نے آپ کو بتایا اس وقت ایک
ساڑھے چار سو صفحے کی کتاب تیار ہے۔ اتنی ہی ضخامت کی کتاب ناپختہ حالت
میں وہاں پڑی ہوئی ہے۔ تو بارہ سال میں نو سو صفحے کوئی بری بات نہیں
ہے۔ اس لیے کہ مزاج میں آپ بتائیے کہ اتنی مقدار میں کتنے اور لوگوں نے
لکھا ہے۔ اب تک بارہ سو صفحے بنتے ہیں میرے۔ اس میں اگر اللہ نے اور زندگی
دی تو ممکن ہے اور اضافہ ہو جائے۔

سوال: ابھی آپ نے اپنی مزاح نگاری کے ساتھ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کا
ذکر کیا، آپ کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ جس سے ہم سب واقف ہیں کہ آپ
ہمارے سربرآوردہ مزاح نگار ہی نہیں صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں، دوسری طرف
آپ مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز اور متمکن رہے ہیں جن کا ادب سے کوئی
واسطہ نہیں۔ تو ایک ادیب اور ایک اہم افسر کی آپ کی دو حیثیتیں ہیں آپ ان
میں کس طرح تفریق کرتے ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ خاصا ذاتی سوال ہے؟

جواب: صحیح ہے مگر اس سے مجھے کبھی کوئی الجھن نہیں ہوئی۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ

تجربہ ہماری اردو میں خاص طور سے جو آئی ہے وہ بیشتر OUTSIDERS ہوتے ہیں تو وہ لوگ جن کا پیشہ یا اوڑھنا بچھونا ادب یا صحافت ہے ان کے ہاں وہ تازگی جس کی آپ توقع رکھتے ہیں بعض اوقات نہیں ملتی۔ لکھنا پڑھنا ہمارے لیے مشکور کی نہیں محبوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کبھی اس میں کوئی الجھن ہمیں محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہمیں اچھا لگتا ہے کہ دن بھر کی مشقت کے بعد ایک بالکل دوسری دنیا میں آدمی داخل ہو۔ اچھا آپ نے اسلوب کے PERFECTION کے بارے میں جو سوال کیا تھا اس پر ایک دلچسپ قصہ سناؤں آپ کو۔ وہ قصہ یہ ہے جناب کہ ہم کبھی کسی کی فرمائش پر لکھتے نہیں ہیں بہت پہلے کا ذکر ہے یہ کوئی ۵۵، ۵۰ کے آس پاس کہ جب ہمیں ساڑھے چار سو یا پانچسو روپے تنخواہ ملتی تھی اور ہم نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ہمارے دوست حنیف رامے اس زمانے کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ انھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ فلاں موضوع پر آپ لکھ دیجیے۔ ہم نے لکھ دیا۔ اب جب اس کے چھپنے کے دن آئے تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے نہایت لغو چیز لکھی ہے بالکل لغو اور ہم اس کو FACE نہیں کر سکتے تھے اس زمانے میں ہم مشتاق احمد کے نام سے لکھتے تھے۔ اس خیال سے کہ لوگ ہمیں پہچان نہ سکیں اس لیے کہ بینک میں لکھنے پڑھنے والے لوگوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ ان پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اور ایک صاحب نے بڑی اچھی بات ہم سے کہی۔ کہنے لگے کہ دیکھیے برا نہ مانیے گا۔ کیا فرمائیں۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ وہ ایک ماہر امراض چشم ہے بہت اچھا اور شاعر بھی ہے تو آپ آپریشن اس سے کروائیں گے یا اس سے کروائیں گے جو صرف آنکھوں کا سرجن ہے۔ تو اسی بنا پر وہ صاحب اس بینک میں پیسہ نہیں رکھتے تھے جس میں میں ملازم تھا۔ وہ تھا یہ ہوا کہ سو برس رسالے میں وہ مضمون چھپا۔ پنجاب بک ڈپو والے ایجنٹ ہیں یہاں اس کے۔ میں ان سے روز ٹیلی فون پر پوچھتا تھا کہ رسالہ آیا کہ نہیں آیا۔ ایک دن انھوں نے کہا آگیا ہے۔ میں نے پوچھا کتنی کاپی ہیں انھوں نے

کہا آپ کو کتنی درکار ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، آپ کے پاس کتنی آئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب سو آئی ہیں۔ تو میں گیا اسی وقت میری تنخواہ اس وقت کل کٹ کٹا کر سالے چار سو روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ تین روپے کی سو یہ ایک کاپی تھی۔ میں سو کاپی ان کی تین سو روپے میں لے آیا اور لا کر میں نے بینک میں جو چپراسی تھا اس سے کہا کہ میاں اس کو SHREDDING MACHINE میں سب ڈال دو۔ اس کے بعد جیسے میں اب آپ کو فخریہ قصہ سنا رہا ہوں کہ صاحب میں تو اتنا نفاست پسند ہوں کہ میں نے یہ کیا تو میرا خیال تھا کہ اس کے بعد کراچی میں تو میری بدنامی نہیں ہوگی۔ تو جیسے اس وقت آپ کو فخریہ قصہ سنا رہا ہوں تو میں یہ قصہ اس کے چار پانچ دن بعد ایک صاحب کو سنانے لگا۔ ان کا نام میں آپ کو بتا دیتا ہوں مگر آپ ریکارڈ پر نہ لائیے گا۔ تو میں نے ان سے کہا کہ بھئی ہم نے تو یہ کیا، ہماری غیرت گوارا نہ کر سکی اور ہم نے یہ کر دیا تو وہ صاحب ایک دم بپھر گئے یعنی نہایت مؤدب اور نہایت با اخلاق آدمی تھے۔ کہنے لگے کہ یہ آپ نے کیا کیا، اس سے بڑی تو کوئی بدذوقی نہیں ہو سکتی۔ یہ کام تو پہلے ایک دفعہ ہوا تھا جب اسکندریہ میں لوگوں نے کتب خانہ جلا دیا تھا۔ وہ الزام ہے مسلمانوں پر، مگر آپ نے اس سے بدتر کام کیا۔ میں نے کہا بات کیا ہوئی۔ پتہ یہ چلا کہ سو یہ ایک اس شمارے میں اُن کی پہلی غزل چھپی تھی۔ یہ میں نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی غزل بھی غارت ہو گئی میرا مقصد ان کی غزل پر پانی پھیرنا نہیں تھا بلکہ اپنی تحریر کے بارے میں ایک معیار کی پابندی تھی۔ میں نے اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(ڈاکٹر مشفق خواجہ اور ذوالفقار مصطفےٰ
کے شکریے کے ساتھ)

شتاق احمد یوسفی

ضیا محی الدین اور لفظ کا مزاج

نوٹ: "اردو مرکز لندن نے ۱۶ فروری ۱۹۹۹ء کو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں ضیا محی الدین کے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ اس میں یہ مضمون بطور خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

ابھی ہم سب نے غالب کی عبارت کا جادو اور ضیا محی الدین کی ادا بھی اور اشارت شناسی کا کمال دیکھا۔ میں تو ابھی اس سحر زدہ حصار سے نہیں نکلا جہاں انھوں نے لا کر چھوڑا تھا۔ اہتزاز و تحسین میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ حسنِ سماعت پر حرفِ ستائش بھی بار گزرتا ہے۔

ضیا محی الدین بنیادی طور پر اسٹیج کے آدمی ہیں۔ لہٰذا اسی کے حوالے سے مختصر سی گفتگو کی ابتدا کروں گا۔

آپ نے لندن کے تھیٹروں میں دیکھا ہوگا کہ شو سے پہلے آرٹ پیپر پر چھپے ہوئے کتابچے قیمتاً ملتے ہیں جنھیں خریدنا تھیٹر دیکھنے کے ان کہے آداب میں داخل ہے۔ ان کتابچوں میں کاسٹ کی تصویریں اور مفصل تعارف ہوتا ہے۔ جب آپ بڑے شوق سے کتابچہ خرید کر نیم تاریک ہال میں داخل ہوتے ہیں اور اس سیٹ کی جانب بڑھتے ہیں جس پر گائیڈ اپنی منی سی ٹارچ کی ایسی روشنی ڈالتی ہے

[illegible] گاروں کے دہان سے بھی زیادہ [illegible] بہت سے بھی زیادہ [illegible]
[illegible] ہے تو کتابچے کی تصویریں اور حروف تو درکنار آپ کو [illegible]
[illegible] جس کی گود میں آپ اوور کوٹ، چھتری، پستول کے پیکٹ اور کتابچے [illegible]
[illegible] کی کوشش کرتے ہیں۔ پایان کار، جوانوں کی ایکلوسیکس [illegible]
[illegible] کی گوشی گھڑکیوں کے بعد آپ کو اپنی مقسومہ یعنی کرسی مل جاتی ہے اور آپ
[illegible] کو اس میں اس طرح فٹ کر لیتے ہیں جیسے یہاں کی عوامیں ۱۵ نمبر کے [illegible]
[illegible] ۱۰ نمبر کے کوزے میں اس طرح بند کر لیتی ہیں کہ بقول نظیر اکبرآبادی:

آگا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے

یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور وُوں بھی واہ واہ ہے

آپ کا بقیہ وقت کتابچہ پڑھنے کے بجائے دوسروں کو اپنی گود میں بیٹھنے [illegible]
[illegible] رکھنے میں گزرتا ہے۔ اتنے میں تیسری گھنٹی بجتی ہے اور ہال میں ایسا سناٹا
[illegible] طاری ہوتا ہے کہ دو چار لمحے تو آپ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ بینائی بتدریج
[illegible] زائل ہو رہی ہے یا اندھیرے میں کوئی واردات ہونے والی ہے۔ اس کے بعد
[illegible] اسٹیج پر یکلخت روشنی ہوتی ہے۔ ہال میں ایسا سناٹا طاری ہوتا ہے کہ آپ
[illegible] اوورکوٹ کے اندر بھی چلغوزہ چھیلیں تو آخری قطار والے تک کی گالی صاف سنا [illegible]
[illegible] دے۔ کھیل ختم ہوتا ہے، آپ جملہ ناظرین کے ساتھ کھڑے ہو کر اداکاری کی داد دیتے
[illegible] ہیں۔ پردہ اٹھتا اور گرتا رہتا ہے۔ تالیوں سے ہاتھ جھنجھنانے لگتے ہیں مگر جی ہی جانتا
[illegible] ہے کہ یہ سامنے یونہی کھڑے رہیں کہ انھوں نے تھکے ہاروں کا دل شاد کیا اور ایک
[illegible] جہانِ دیگر پہنچا دیا۔ اسی عالم میں آپ اس تعارفی کتابچے کو نزدیک ترین ڈسٹ
[illegible] بن میں پھینک دیتے ہیں کہ فن کار تک پہنچنے کے لیے اب آپ کسی تعارف [illegible]
[illegible] کے محتاج نہیں۔

ابھی آپ نے ایک نہایت ممتاز اور صاحب طرز اداکار کے فن کا اعجاز اور [illegible]
[illegible] بچشم و بگوش خود دیکھا اور سنا اور اب میرے توضیحی اور توصیفی کلمات کی حیثیت

ہیں کتابچے سے زیادہ نہیں جس کا شرف آپ بارہا دیکھ چکے ہیں۔

ادھر چند برسوں سے ضیا محی الدین صاحب ـــــ یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ میں ان کو دوسری اور آخری مرتبہ صاحب کہہ رہا ہوں کسی نامور آرٹسٹ یا ادیب کو صاحب کہنا صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ اول وہ قضائے الٰہی یا تقاضائے بشریت سے وفات پا چکا ہو۔ یا اس سے بھی بدتر انجام ہوا ہو یعنی وہ کسی بینک میں ایسے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جہاں بہ یک وقت سود اور قوم کا غم کھانے اور اس کا حساب رکھنے کے وافر مواقع ہوں۔

تو عرض یہ کرنے چلا تھا کہ ادھر چند برسوں سے ضیا محی الدین نے ـــــ یہاں پھر یہ واضح کرتا چلوں کہ انھیں فقط ضیا کہتے ہوئے بھی میرا قلم بوجوہ کانپتا ہے اس کی دوسری وجہ یہ کہ انھیں اس نام سے پکارنے کا حق یا تو ان کی بیگم کو پہنچتا ہے یا ان کے ہم عمر بے تکلف دوستوں کو۔ اب اگر میں انھیں اپنا ہم عمر بتاؤں تو میرا تو کچھ نہیں بگڑے گا ان کے ابھی کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔

دوسری وجہ صاحب کہہ کر پکارنے کی وہی ہے جو آپ کے ذہن میں آئی۔ میں نے دوسرا پیراگراف قبل حمد، تمام کچھ اس طرح شروع کیا تھا کہ ادھر چند برسوں سے ضیا محی الدین ہر سال مختلف تصانیف سے چیدہ چیدہ اقتباسات پڑھتے ہیں اور ڈھیروں داد وصول کرتے ہیں۔ یہ ارمغانِ فرنگ وطنِ عزیز بھی لے کر جاتے ہیں۔ بحمداللہ اب اس تقریب دل پذیر نے سالانہ جشن کی سی صورت اختیار کر لی ہے ان کی پڑھت READING اور RECITATION کا یہی مرادف ذہن میں آتا ہے۔ جی چاہے تو بلند خوانی یا خواندگی کہیے) کے کیسٹ ہماری ان کتابوں سے زیادہ بکتے ہیں جن کے اقتباسات ان میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر و اعتراف اس لیے بھی واجب ہو گیا کہ وہ اس عاجز کو بھی نوازتے رہتے ہیں۔ زرگزشت سے ایک اقتباس سن کر ہمارے ہمدم و ہمراز، مرزا عبدالودود بیگ ہماری پیٹھ

جھینپ کر کہنے لگے کہ واللہ ضیاء محی الدین نے تقریر میں جان ڈال دی۔
ان کے کیلی منٹ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کچھ اور گمان گزرا تو ہم نے
مگر مرزا! جان تو مُردے میں ڈالی جاتی ہے۔
بولے "اور کیا ضیاء محی الدین نے یہی تو کیا ہے۔ بے جان بولتا ہے مسلمانوں
ہاتھ میں۔"

یہ بات ہماری حد تک تو درست ہے لیکن رتن ناتھ سرشار، چودھری محمد علی
ردولوی، فیض، ن۔م۔ راشد اور پطرس کی تصانیف سے جو شہ پارے انھوں نے
پڑھے ہیں وہ جہاں لکھنے والے کے کمالِ فن کا نمونہ ہیں وہاں پڑھنے اور پیش کرنے
والے کے حسنِ انتخاب، سخن فہمی، نکتہ سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت، لفظ کا مزاج اور
لہجہ اور لہجے کا ٹھاٹھ پہچاننے کی صلاحیت کا صحیح معنوں میں منہ بولتا ثبوت ہیں۔
جملے کی بُنت اور بناوٹ ہی پر توجہ نہیں دیتے بلکہ لفظ کے بناؤ اور سجاؤ سے بھی
اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی آواز اور اندازِ اظہار کی RANGE بہت وسیع ہے۔
نہ صرف تلخی، ترشی اور شیرینی کی مختلف سطحوں اور نزاکتوں سے واقف ہیں بلکہ آواز
میں اپنے لہجے کا ذائقہ بھی شامل کرنا جانتے ہیں۔ ایک کامیاب اور نامراد کار کی طرح
کردار کی زبان، اُن کی زبان اور لہجہ اُن کا اپنا لہجہ بن جاتا ہے۔ تمام چہرے ہیں میرے
چہرے، ہر ایک لہجہ ہے میرا لہجہ۔

فارسی کی ایک مثل ہے "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" یعنی مصنف
اپنی تصنیف کو بہتر پڑھ سکتا ہے۔ مگر قیاس کہتا ہے کہ یہ مثل غالباً ایسے زمانے میں
وضع کی گئی جو ہمارے زمانے سے ملتا جلتا تھا۔ ہمارا مطلب ہے باہمی رشک و حسد
معاصرانہ چشمک اور چقلش کے لحاظ سے۔ اپنے ہم عصروں کا کلام بگاڑ کر پڑھنا
صدی کی ایجاد نہیں ہے۔ سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔

بعض مصنفوں کی زبان سے ان کی تصنیف اور کلام سننے کے بعد ہم اس نتیجہ
پر پہنچے ہیں کہ یہ مثل درست نہیں۔ تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ مصنف کی

سے اس کی تحریر سننے کا یہ فائدہ ہے کہ املا کی غلطیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ان کی جگہ تلفظ کی غلطیاں در آتی ہیں۔ جیسی خوبصورت اور شفاف نثر قدرت اللہ شہاب مرحوم نے لکھی ویسی کم لکھنے والوں کو نصیب ہوگی لیکن جب وہ اپنا لکھا آپ پڑھتے تھے تو ایسا تاثر ملتا تھا کہ سننے والوں کا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان کے ہاتھ سے مسودہ چھین کر خود پڑھ کر سنائیں کہ ؎

دیکھیں اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

اپنی تحریر اور کلام کو خراب کرنے کا اپنا اپنا قابل تقلید انداز ہوتا ہے۔

ایک شاعر تھے جو مصرع کا پہلا لفظ پڑھنے سے پہلے ہی ہاتھ چلانا شروع کر دیتے تھے۔ پہلے دایاں چلاتے وہ تھک جاتا تو پھر بائیں سے بریت بھاؤ بتاتے۔ شعر پڑھتے وقت جوش صاحب کی طرح دونوں ہاتھ بیک وقت نہیں چلاتے تھے۔ اس خوف سے کہ اگر دونوں تھک گئے تو کاہے سے مطلب ادا کریں گے۔

جوش صاحب بھی محفلوں میں کلام سنانے سے پہلے بعض اوقات پوچھتے تھے موٹا مال پیش کروں یا باریک۔ ظاہر ہے لوگ باریک ہی کی فرمائش کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے باریک مال میں بھی پہاڑ دھڑکتے تھے۔ ۸۰ سال کے سن میں بھی آواز میں بجلیاں کڑکتی تھیں۔ مقتضائے حال کچھ بھی ہو، بات کتنی ہی نرم کیوں نہ ہو لہجے کی گھن گرج دبی رہتی تھی۔ شاعری میں وصل کی فرمائش بھی اسی طور کرتے تھے جیسے کسی نادہند قرضدار سے ڈوبی ہوئی رقم ڈانٹ ڈپٹ کر کے وصول کرنا چاہتے ہیں اور اسے ڈانٹنے میں جو مزہ مل رہا ہے وہ وصولی میں نہیں۔ اس کے برعکس اختر شیرانی اس طرح طلب کرتے ہیں جیسے کوئی بچہ GOOD CONDUCT کے صلے میں چاکلیٹ مانگ رہا ہو۔

جدید شاعری کے مزاج اور رجحانات سے جیسی اور جتنی واقفیت ہمارے یار طرح دار ساقی فاروقی کو ہے ویسی اور اتنی بلکہ اس کی آدھی بھی ہمیں نصیب ہوتی تو محض اسی بنا پر پندرہ سال پہلے بینک سے نکال دیے گئے ہوتے۔

قادری نے فرسودہ کہنے سے بچا ہوا [illegible]
جو نہایت جرأت مندانہ اور خوبصورت تجربے ہیں وہ باشبہ [illegible]
کے مداح ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام پڑھنے کی ایک منفرد اور نہایت [illegible]
ایجاد کی ہے۔ اس ضمن میں ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ اگر کوئی [illegible]
ان کا کلام اسی طرح پڑھ کر انھیں سنا دے تو وہ قطع تک پہنچنے سے پہلے ہی [illegible]
کا سر کاٹ کر اور اس پر اپنی مونچھوں کی مالا لپیٹ کر اس کی بیوہ کی ہتھیلی پر رکھ
دیں گے۔ ع جا تجھے کشمکش حشر سے آزاد کیا

فیض صاحب کی نظمیں جس طرح ڈوب کر ضیاء الدین نے پڑھی ہیں وہ
صرف ان کی عقیدت بلکہ ان کی نکتہ شناسی اور سخن سنجی کا ثبوت ہے جو بحمد اللہ
EMI نے کیسٹ کی شکل میں محفوظ کر لیا ہے۔ فیض صاحب کی شخصیت میں ایسی
موہنی اور ان کے لہجے میں اتنا خلوص اور کھرا پن تھا اور ہم اس سے اس درجہ مانوس
ہو گئے تھے کہ ہمیں یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اشعار اس طرح پڑھتے تھے جیسے
کسی جانی دشمن کا کلام ہو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے
دو تین لفظوں کے بعد وہ ایک سسکی سی لے کر اپنے کلام میں ایک لذیذ سا سکتہ پیدا
کرتے۔ سگریٹ کے رسیا تھے۔ وہ دستیاب نہ ہو تو لفظ کا کش ایسا لگاتے کہ سننے
والے دھت ہو ہو جاتے۔ چند سال پہلے اسی ہال میں میں نے عرض کیا تھا کہ

"یہ فیض کے کلام کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے کلام کو بگاڑ کر
پڑھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے چاہنے والوں کو یہ
انداز ایسا بھایا کہ آخر کو یہی معیار ٹھہرا۔ ان کا اکھڑا اکھڑا لہجہ دیکھتے
دیکھتے ایک فیشن بن گیا۔ فیض صاحب "چین اسموکر" تھے۔ یہ مطلب
ہے سگریٹ سے سگریٹ ہی نہیں قالین بھی سلگاتے رہتے تھے
مصرع اور فقرہ کی سانس ٹوٹ ٹوٹ جاتی، وقفے وقفے سے ایک
گھائل سی سسکی بھی سنائی دیتی اور سننے والوں کا پیار اسکو

متن میں معانی میں گھومتا چلا جاتا کسی کہنے والے نے از راہِ تفنن
کہا بھی کہ فیض صاحب نے دراصل اپنے نقادوں کا خاصہ مزید
خراب کرنے کے لیے تحت اللفظ پڑھنے کی یہ طرز ایجاد کی ہے۔

بسا اوقات لفظ کے مفہوم کے جملہ امکانات کا اندازہ GOLD PRINT (مجلد
مطبوعہ) سے نہیں ہوتا۔ لفظ کے مختلف شیڈز اور نہیں اس وقت تک نہیں
کھلتیں جب تک وہ زبان سے ادا کیا جائے۔ سیاق و سباق اور وہ لہجہ جو اسے
ادا کرتے وقت اختیار کیا جائے، لفظ کو ایک بالکل جدا مفہوم اور فقرے کو ایک
اور ہی تیور اور کاٹ بخشتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ مفہوم بعینہٖ وہی ہو جو لکھنے
والے کا مقصود تھا۔ ہر بڑے ایکٹر نے شیکسپیئر کے الفاظ کو اپنے طور پر کہا اور ہر کردار
کو اپنا جامہ پہنایا ہے۔ لفظ تو وہی رہتے ہیں کہ جو تھے مگر معنی و مفہوم میں توسیع
ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میکبتھ کا ایک انتہائی سادہ جملہ لیجیے:

TOMORROW, AND TOMORROW, AND TOMORROW

یا ہملٹ کی مشہور لائن:

TO BE OR NOT TO BE THAT IS THE QUESTION

ایک جملہ پانچ الفاظ پر مشتمل ہے اور دوسرا دس پر۔ یہاں کوئی لفظ ادق نہیں
کوئی گنجلک یا اٹپٹا پیچ نہیں۔ لیکن ہر بڑے ایکٹر نے، خواہ وہ GARRICK ہو
JOHN GIELGUD یا LAURENCE OLIVIER ان جملوں کو بالکل مختلف انداز سے ادا کیا ہے۔
ایکٹر جب لفظ کی کوئی نئی تہ یا معنی کا کوئی نازک سا شیڈ دریافت کرتا ہے
تو وہ بھی تخلیق کے عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ پھر پھول میں پھول پہننے والے کی
خوشبو بس جاتی ہے۔

تحت اللفظ پڑھنے کی روایت ہمارے ہاں بہت پرانی نہیں ہے۔ داستان گوئی کو
پذیرائی اور لوگوں کی دلچسپی میں شمار نہیں کر سکتے۔ سب سے نامور داستان گو میر باقر علی
داستان کہتے تھے۔ ان کی ایک داستان کا متن ہوان کے کسی مداح نے

نب کیا تھا۔ ہم نے بھی پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ استاد ابراہیم [illegible]
ستے والوں کو کمانی چاہیے تھی۔ اب جو نثر پڑھنے کا رواج چل پڑا ہے تو اس [illegible]
نے جاتے ہیں۔ اول تو سب میری ہی طرح صرف اپنی نثر پڑھتے ہیں۔ دوم اس [illegible]
التزام رکھتے ہیں کہ اول تا آخر MONOTONE میں پڑھیں۔ منصف مزاج سامعین
یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ موصوف لکھتے زیادہ خراب ہیں یا پڑھتے زیادہ خراب ہیں۔ البتہ
ندہ صاحب طرز نثر نگار مونوٹون سے گریز کرتے ہیں مگر وہ اپنے انداز پر ایسے فریفتہ
ہیں کہ اپنے ہر فقرے پر جھوم جھوم جاتے ہیں اور ایک ایک لفظ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ
دیا ثرب کا پتا پھینک رہے ہیں۔ ضیا محی الدین نے نثر پڑھنے کا جو انتہائی پُر تاثر
انداز اپنایا ہے اور خواندگی کا جو اعلیٰ معیار قایم کیا ہے اس میں صرف ایک عیب ہے
وہ یہ کہ جس کسی نے نقل میں ان کی طرح پڑھنے کی کوشش کی وہ مارا جائے گا۔ یہ راگ
اور سنگھار اور یہ ساز انھیں کو سجتا ہے۔ ع

ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

وہ زبان کی صحت، لہجے اور تلفظ کی درستی اور کلیدی فقرے کی ادائیگی پر خاصا
ریاض کرتے ہیں۔ اور یہ ان کے فن کی پرکاری ہے کہ وہ اپنے سامعین اور ناظرین کو
اس کا ذرا احساس نہیں ہونے دیتے۔ وہ اس منزل سے آسان گزر جاتے ہیں۔ ورنہ
ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو گفتگو میں ادبدا کر ایسے الفاظ ماورائے تلفظ کے ساتھ
ڈھوڈھو کر لاتے ہیں کہ انھیں سن کر ہم جیسے کم مایہ لوگ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم
نے خود کو عالم ہونے سے باز رکھا۔ ہماری مراد ان حضرات سے ہے جو جدوجہد، ورثہ،
زیادتی، شناخت، موسم، سمت کہہ کر الفاظ کے بدیسی ماخذ و مخرج سے اپنی واقفیت
کا ثبوت ہر تیسرے جملے میں بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ فارسی کے گاڑھے گاڑھے دودھ میں
آمیزش نہیں ہونے دیتے۔ پانی تو درکنار، دیسی شکر تک ملانے کے روادار نہیں۔ بعض
اوقات تھن سے منہ لگا کر دودھ پیتے اور ہم جیسوں کو دولتی مارتے رہتے ہیں۔ ایک
بار ڈاکٹر کو تو ہم نے محبت کو محبت کہتے بھی سنا۔ اپنے ہاتھوں سے بھی [illegible]

کہلاتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس تلفظ یعنی محبت کو محبت کہہ کر کوئی کچھ کرے
تو یقین جانئے وہ کلام محبت نہیں، کچھ اور کر رہا ہے۔

فنا کی اعلیٰ خالص کی چیز کو عام آدمی تک پہنچانے کی اہمیت ہی کے نہیں،
اس کے طریقے بھی واقف ہیں۔ دوسروں کو سمجھانا، خود سمجھنے سے کہیں زیادہ مشکل
کام ہے۔ ادبی شہ پاروں کے لیے قبول عام کی راہ ہموار کرنے میں انھوں نے جس
طور پہل کی ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ اس عمل میں جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے
اور دل میں بات اتارنے کے لیے جو بہروپ اور سانگ بھرنے پڑتے ہیں ان پر وہ
مکمل قادر قدرت رکھتے ہیں۔

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ان کے ایک ادنیٰ مداح اور پُرشوق تماشائی کی حیثیت سے اور آپ سب
کی جانب سے میں ان کا شکر گزار ہوں کہ آج انھوں نے ہمیں ایسے فن کی جھلک
دکھائی جو حسین کو حسین تر تو کرتا ہی ہے لیکن بعض اوقات سادہ کو بھی پُرکار بنا کے
دکھا دیتا ہے۔ وہ فن اور وہ فن کار لائق صد احترام و ستائش ہے جو

حرف سادہ کو عنایت کرے اعجاز کلرنگ

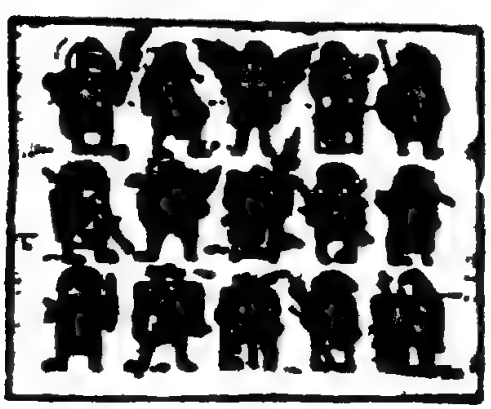

چند باتیں — چند یادیں

تحریر: مرزا نجم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی ..... اعظم گڑھ یوپی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا
یم بیگ چغتائی کا خاندانی شہر آگرہ تھا۔ اس سے پہلے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی زندگی
یان کروں میں سمجھتا ہوں کہ کچھ تھوڑا بہت بزرگوں کے بارے میں لکھنا ضروری ہے۔
رزا قیم بیگ چغتائی نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ بی اے کر کے یوپی سول سروس میں
چلے گئے۔ کالج کے زمانہ میں کشتی لڑتے تھے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے ایک مضمون
لکھا ہے "علی گڑھ کے کھلنڈرے" اس میں ذکر کیا ہے کہ مرزا قیم بیگ چغتائی کشتی
ہت خوبصورت لڑتے تھے۔ یوپی کے مختلف شہروں میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ خان بہادر کا
خطاب ملا اور فری میسن کے ممبر بھی ہوا کرتے تھے۔ بڑے غریب پرور آدمی تھے۔ اپنے
چھوٹے سالے کو آٹھ برس کی عمر سے پالا اس کے علاوہ محلہ اور رشتہ داروں کے
ہ بھی پالے یتیموں کا بہت خیال کرتے تھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ اتنے بچے
پلتے تھے کہ ہاکی کی ٹیم گھر کی ہوا کرتی تھی گھر پر سب بچوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ
ورزش کشتی اور لکڑی چلانا بھی سکھائی جاتی تھی۔ شکار کے بہت شوقین تھے۔ خود کی دس
اولادیں تھیں چار بیٹیاں اور چھ بیٹے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی تیسری اولاد تھے اور
عصمت چغتائی نویں اولاد ہیں اسی طرح عصمت چغتائی کی پرورش عظیم بیگ چغتائی

سے کی تھی۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے تایا کا نام مرزا ابراہیم بیگ چغتائی تھا شاعر تھے ان کے سب سے بڑے بیٹے کا نام مرزا فہیم بیگ چغتائی تھا اور وہ اپنے والد کی طرح شاعر تھے اور افسانہ بھی لکھتے تھے دہلی، لاہور اور پشاور کی ادبی محفلوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے پشاور سے جو پہلا اردو اخبار نکلا ہے اس کے پہلے ایڈیٹر بھی تھے۔ عظیم بیگ چغتائی کے چچا کا نام مرزا مستقیم بیگ چغتائی تھا اور بڑے بھائی مرزا قسیم بیگ چغتائی کی طرح ادب سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی امراؤ علی عالم فاضل تھے اور ان کی ایک کتاب ہے جو مسلمانوں کے ہندوستان میں بسنے کی تاریخ ہے یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کا نام "رزم بزم" ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ابتدائی تعلیم حسن اسکول بدایوں یوپی میں ہوئی اس کے بعد اٹاوہ مسلم اسکول سے میٹرک کیا جس زمانہ میں میٹرک میں پڑھتے تھے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اسکول میں ہاکی کھیلتے تھے گھر پر مذہبی تعلیم کے ساتھ کشتی اور لکڑی چلانا بھی سیکھی شطرنج بہت اچھی کھیلتے تھے۔ پہلی کتاب "قصر صحرا" جب لکھی تو نویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ اس کی دوسری جلد دسویں میں لکھی۔ میٹرک کے بعد اپنے والد سے شادی کے لیے کہا تو جواب ملا کہ تم ایک معمولی کلرک ہو بیوی بچوں کا خرچہ کیسے برداشت کرو گے۔ اس کے جواب میں عظیم بیگ چغتائی نے کہا صاحب دنیا میں صرف ڈپٹی کلکٹر ہی شادی نہیں کرتے کلرک اور چپراسی بھی شادی کرتے ہیں خیر اس قسم کی بحث کے بعد عظیم بیگ چغتائی صاحب کی شادی رامپور کے پٹھان خاندان میں عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن کے جیٹھ کی لڑکی سے ہوئی تھی یعنی مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بہنوئی بیوی کے سگے چچا تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بہت کم عمری سے لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا پہلی کتاب

نوٹ دھوتی میں لکھی اس کے بعد کلرکی کرتے اور لکھتے رہے مگر یہ نوکری زیادہ [illegible]
کرتے کیونکہ ایک دفعہ معمولی سی غلطی پر بینک منیجر نے بہت ڈانٹا اور یہ بھی کہا کہ
جانے کہاں سے جاہل کام کرنے آگئے ہیں۔ اس پر مرزا عظیم بیگ چغتائی کو غصہ آگیا اور
انھوں نے منیجر کو ہاتھ مار دیا اس لیے نوکری چھوڑنی پڑی۔ نوکری چھوڑنے کے بعد علی گڑھ
اپنے والد کے پاس آگئے۔ شادی کے وقت یہ طے پایا تھا کہ شادی کے بعد خود خرچہ
برداشت کرنا پڑے گا اس لیے مرزا عظیم بیگ چغتائی نے علی گڑھ میں جانسن کے تالے کی
فیکٹری میں نوکری کرلی اور ساتھ ساتھ کالج میں داخلہ بھی لے لیا رات کو کام کرتے تھے
اور دن کو کالج جاتے تھے اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے مگر ہنڈیا چولہا الگ تھا۔
ملازمت اور تعلیم کے زمانہ میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہو چکے تھے دوسری بیٹی
مدحت چغتائی کو مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہن نے گود لے لیا تھا جو رامپور میں بیاہی ہوئی
تھیں اور بڑی نزہت چغتائی اور بڑا لڑکا مرزا علیم بیگ علی گڑھ میں ساتھ رہتے تھے
اس کے باوجود گھر کا خرچ اتنا ہو جاتا تھا کہ گزر مشکل سے ہوتی تھی اور جب ہاتھ بہت
تنگ ہو جاتا تھا تو بیوی بچوں کو رامپور میکے بھیج دیتے تھے اور جب بہت دن ہو جاتے
اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے والد اور والدہ کو اپنے پہلے پوتا پوتی یاد آتے تو وہ کہتے
تھے کہ بچوں کو بلاؤ اور اس پر مرزا عظیم بیگ چغتائی جواب دیتے تھے کہ میرے پاس
پیسے نہیں ہیں میں نہیں بلا سکتا تو پوتا اور پوتی کو بلانے کے لیے والد پیسے دیتے تھے
کیونکہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے پہلے لڑکا اور لڑکی دادا دادی کو بہت عزیز تھے اور
میرے خیال میں پوتا پوتی کو سامنے رکھنے کی وجہ سے گھر میں رہنے کی جگہ دے رکھی
تھی غیر ان حالات میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے علی گڑھ سے بی اے، ایل ایل بی کیا
معاشیات ان کا خاص مضمون تھا اور گولڈ میڈل ملا تھا۔ علی گڑھ میں تعلیم اور ملازمت
کے علاوہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھاتے بھی تھے اور لکھتے بھی رہتے تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بڑے بھائی مرزا نسیم بیگ چغتائی نے میٹرک کر کے پڑھنا چھوڑ دیا تھا ان کو دوبارہ پڑھنے پر لگایا۔ خان بہادر نسیم بیگ چغتائی ویسے تو بڑے غریب پرور تھے مگر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے جو شادی پر کہا تھا کہ بیوی بچوں کا خرچہ برداشت کرنا ہوگا تو اس پر قائم رہے سب کا خرچہ برداشت کرتے تھے اور اپنے بیٹے عظیم بیگ کے سوا چھپر دینے کے علاوہ بالکل مدد نہیں کی۔ مرزا عظیم بیگ سے چھوٹے بڑے جانے کتنے لڑکے رہتے تھے سب کو روٹی کپڑا ملتا تھا اور ان میں بہت سے لکھتے پڑھتے بھی نہیں تھے۔ شکار کی پارٹیاں ہوتی تھیں اور عیش کرتے تھے مگر مرزا عظیم بیگ چغتائی کو ہوکا بیل بنے ہوئے تھے اور کبھی ان کے والد اور والدہ کو رحم نہیں آیا خیر اس قسم کی زندگی میں گزاری اور پھر وکالت شروع کی۔ وکالت میں اچھے خاصے پیسے کما لیتے تھے اس لیے جب بڑے بھائی نے ایل ایل بی کر لیا تو ان کو اپنے ساتھ لگا لیا اور وکالت کرنا سکھائی شروع سے ان کو ہر مقدمہ پر آدھے پیسے دیتے تھے۔ بڑے بھائی مقدمہ نہ بھی لڑتے اس لیے ہی ایک دفعہ مرزا نسیم بیگ صاحب کراچی میں مجھ سے کہنے لگے۔ کہ بھئی ہم تو وہ کرتے تھے جو مناسب تھا (مرزا عظیم بیگ چغتائی کا گھر کا نام) بڑے ہونے کے باوجود چھوٹے بھائی کی بڑوں کی طرح عزت کرتے تھے۔

خان بہادر مرزا نسیم بیگ چغتائی یوپی سے ریٹائر ہونے کے بعد جودھپور راجستھان آ گئے کیونکہ ان کے دو سالے ظفر حسین عثمانی اور فرحت حسین عثمانی جودھپور میں اچھے عہدوں پر ملازم تھے اور کچھ دنوں کے بعد مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی آگرہ اور رامپور میں وکالت کر کے جودھپور آ گئے اور وکالت شروع کی۔ الگ مکان لے کر رہتے تھے جودھپور میں دو لڑکے اور ایک لڑکی اور پیدا ہوئی یہاں عظیم بیگ چغتائی کی اولاد کے نام بھی لکھتا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے لکھ رہا ہوں۔ نزہت، مدحت، زعیم، نعیم، علیم اور عظمت ان ناموں کے آخر میں "ت" آتا ہے لڑکیوں کے ہیں اور جن ناموں کے آخر میں "م"

آتا ہے لڑکوں کے لیے صرف مدت رہتی تھی سب اخلاق ساتھ رہتی تھی [illegible]
اور رحیم دادا دادی کے پاس بھی بہت رہتے تھے۔

عظیم بیگ ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے اس زمانہ میں ریاست جاورہ کے نواب صاحب نے اپنی ریاست میں ملازمت دینے کے لیے خط لکھا۔ عظیم بیگ چغتائی وکیل تھے اس لیے ریاست کے چیف جج کا عہدہ پیش کیا۔ عظیم بیگ چغتائی نے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود نواب صاحب کی پیشکش قبول کر لی۔ مرزا قسیم بیگ چغتائی نوابوں کی نوکری پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ہندو ریاست میں ملازمت کی تھی۔ عظیم بیگ کے بڑے ماموں ظفر حسین عثمانی صاحب نے بھی روکنا چاہا کہ تم جودھپور کے مشہور وکیل ہو اور تمہیں اب کسی وقت بھی جودھپور میں جج کا عہدہ مل سکتا ہے اور جودھپور جاورہ سے بڑی ریاست ہے اس لیے نہیں جانا چاہیے۔ مگر عظیم بیگ چغتائی نے کسی کی نہیں سنی اور سن بھی کیسے سکتے تھے۔ انھوں نے سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کیا تھا اور وہ بھی بیس بتیس سال کی عمر میں۔ جاورہ جانے کے بعد عظیم بیگ چغتائی اپنے سبھی بھائیوں کو نہیں بھولے۔ سب سے پہلے اپنے بڑے بھائی نسیم بیگ کو بلایا اور سکریٹری لگوا دیا۔ عصمت چغتائی کو بلایا ان کے پڑھنے لکھنے کے لیے الگ کمرہ بنوایا اور جب پڑھ لکھ گئیں تو لڑکیوں کے اسکول میں نوکر رکھوا دیا۔ جاورہ ہی میں تھے تو جودھپور میں مرزا قسیم بیگ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد دوسرے چھوٹے بھائی بھی جاورہ ملنے آئے یا پھر اس امید پر کہ ہمیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے ایک چھوٹے بھائی جسیم بیگ بھی انگلستان سے پڑھ کر واپس آئے تو سب سے پہلے جاورہ آئے کیونکہ چھوٹے بھائی ہونے کے علاوہ جسیم بیگ کو انگلستان بھجوانے میں مالی اور زبانی امداد کی تھی۔ مرزا قسیم بیگ نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ عظیم بیگ صاحب نے کہا کہ میں بھی خرچ برداشت کروں گا۔ تب والد نے ان کو پڑھنے بھیجا تھا۔ خیر جسیم بیگ صاحب کو

بھی نوکری چھوڑ دی تھی مگر وہ جھوٹی ریاست میں نوکری کرنا نہیں چاہتے تھے اور بعد میں جاورہ میں ملازمت کی تھی۔

جاورہ کی نوکری زیادہ دن نہیں کر سکے۔ نواب صاحب نے پہلے تو "مکھر بہادر" کی اخبار بند کر دی اس کے بعد نسیم بیگ صاحب سے ناراض ہو گئے اور انھیں نوکری چھوڑ کر جانا پڑا اس کے بعد نواب صاحب عظیم بیگ چغتائی سے بھی ناراض ہو گئے۔ عظیم بیگ حساس آدمی تھے اور دمہ کی شکایت بھی تھی۔ مگر ویسے اچھے خاصے تھے بس دمہ کا زور ہوتا تو دوا لیتے تھے۔ جاورہ میں گولف بھی کھیلتے تھے۔ نئے ڈاکٹر سے دوا لی اس کے بعد سے اور زیادہ طبیعت خراب ہو گئی۔ لوگوں نے منع کیا تھا کہ اس ڈاکٹر سے علاج مت کراؤ مگر نہیں مانے اور صحت اور گرنی شروع ہو گئی۔ پھر پہاڑ پر بھی آرام کرنے گئے اسی زمانے میں صحت چغتائی بڑی بیٹی نزہت اور شاید چھوٹی بیٹی کو لے کر بغیر نوکری سے استعفا دیے راتوں رات جاورہ سے بریلی چلی گئیں۔ عظیم بیگ چغتائی پہاڑ سے واپس آئے تو سب سے چھوٹے بیٹے علیم کے ساتھ بیگم عظیم رامپور چلی گئیں۔ عظیم بیگ زعیم علیم اور سامان کے ساتھ جودھپور آ گئے۔ لوگوں نے بڑی افراتفری میں جاورہ چھوڑا تھوڑے دن بعد بیگم عظیم بیگ چھوٹے بیٹے اور بیٹی کو ساتھ لے کر جودھپور آ گئیں اس وقت جودھپور میں عظیم بیگ چغتائی کے تین چھوٹے بھائی رہتے تھے اور والدہ بھی رہتی تھیں ان بھائیوں کے نام یہ ہیں وسیم بیگ، بصیم بیگ اور عصیم بیگ، وسیم بیگ میٹرک تک پڑھے ہوئے تھے اور محکمہ خاص میں معمولی کلرک تھے۔ شادی شدہ تھے اور ایک لڑکا تھا۔ بصیم بیگ میٹرک بھی نہیں تھے، میونسپلٹی میں کلرک تھے عصیم بیگ کو عظیم بیگ صاحب نے ماہر تحریر کا کارسپونڈنس کورس کروا دیا تھا مگر کوئی خاص کام نہیں شروع ہوا تھا۔ عظیم بیگ کی والدہ کو آگرے کے مکانوں کا کرایہ آتا تھا مگر خان بہادر وسیم بیگ کا چھوٹا ہوا گھر کا سامان بکنا شروع ہو گیا اور یہ بھائی اس سامان پر

لوٹتے تھے۔ حلیم بیگ چغتائی کچھ پیسے والد سے لیتے تھے باقی سامان بیچ کر گزارا کرتے تھے کچھ دنوں کے بعد عصمت چغتائی بھی بریلی آگئیں اور راج محل گرلس اسکول میں پڑھانے لگیں۔

جودھپور آکر عظیم بیگ نے وکالت پھر شروع کر دی اور اپنی کتابوں کی اشاعت بھی خود کرتے تھے کمپنی کا نام دفتر کتابت رکھا تھا ایک دن میں برآمدہ میں کھڑا تھا عظیم بیگ کچہری سے آئے تانگے سے اترے ان کے ہاتھ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ جب میں بڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ کیا قصہ تھا شاہد احمد دہلوی کے والد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی کتاب دہلی میں چھپی تھی اور ملاؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ شاہد احمد دہلوی گھبرا گئے انھوں نے عظیم بیگ کو لکھا تو انھوں نے کہا کہ جودھپور بھیج دو اور پھر مختلف شہروں کو بھیج دی جائے گی شاہد دہلوی نے ایسا ہی کیا اور ملاؤں کے وفد سے کہہ دیا کہ میرے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ جودھپور میں عظیم بیگ کے پاس ہیں۔ کتابیں جودھپور آنے سے پہلے ہی مظاہرے ہونے لگے اور قتل کی دھمکیاں ملنی شروع ہو گئیں عظیم بیگ چغتائی نے بھی اعلان کر دیا کہ میں پستول رکھتا ہوں اور روز کچہری پستول لے کر جاتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد پستول رکھنا چھوڑ دیا انھیں نہیں معلوم تھا کہ خود ان کا بھائی وسیم بیگ ملاؤں سے ملا ہوا ہے۔ انھوں نے ملاؤں کو بتا دیا کہ اب پستول نہیں رکھتے ملاؤں نے ایک انگریز غنڈے سے عظیم بیگ پر حملہ کروا دیا۔ اس نے لکڑی سے حملہ کیا تھا عظیم بیگ لکڑی چلانا جانتے تھے انھوں نے سب وار ہاتھوں پر روک لیے ایک بھی سر پر نہیں پڑنے دیا۔ وہ گھبرا گیا اور بھاگ گیا اس لیے ہاتھوں پر چوٹ آئی تھی وہ خون میں بھرے ہوئے تھے۔ خیر اس حادثہ کے بعد ملاؤں سے مسجد میں ملاپ ہو گیا معافی مانگنی پڑی۔ جب گھر میں بھیدی ہو تو کیسے لڑ سکتے تھے۔ خیر سب کتابیں آتے ہی جلا دی گئیں۔ ملا کتابیں جلوا کر خوش ہو گئے مگر ایک کتاب رکھ لی تھی کہ پڑھا جائے کہ کیا لکھا

ہے مگر اس کتاب پڑھنے سے پہلے چھوٹے بھائی نسیم بیگ نے ملاؤں کو خبر کر دی کہ ایک
کتاب لکھی گئی ہے پھر ملاؤں نے کر گھر پر چڑھ آئے تو مجبوراً وہ آخری کتاب بھی نہیں پڑھ
سکی کی نظر ہو گئی مگر وہ کتاب آج پاکستان میں چھپتی ہے۔

جاورہ سے آنے کے بعد کمزور ہوتے گئے دواؤں کا اثر نروس سسٹم پر ہو رہا تھا
ایک دفعہ جو جھیر ہسپتال میں گئے ہے پھر وکالت چھوڑنے پڑی۔ کیونکہ دھیرے دھیرے
کمزور ہوتے گئے اور پلنگ سے لگ گئے۔ کرسے نیچے کا دھڑ مفلوج ہو گیا لکھتے تو رہتے
ہی تھے پلنگ سے لگ جانے کے بعد لکھنا پڑھنا زیادہ ہی ہو گیا کیونکہ گزارے کے لیے
ہاتھ اور دماغ ہی کام کر رہے تھے لیٹے لیٹے اتنی ہمت رکھتے تھے کہ علی گڑھ کے جانس
تاروں کی ایجنسی لے رکھی تھی جو دھیور کے تاجروں کو سپلائی کرتے تھے۔ جو دھیور ریلوے
اور پولیس کے بلٹوں وغیرہ کے آرڈر لیتے تھے یا پھر تاجروں کے ذریعے سپلائی کرتے
تھے لکھ رہے تھے اور گانے لکھنے کے لیے اپنے تایا زاد بھائی
مرزا نعیم بیگ کو بلایا تھا مگر اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ نعیم بیگ بڑے ابا والد کو گود
میں اٹھا کر دھوپ میں بٹھاتے تھے۔ نعیم بڑے ابا بچوں کو کہانیاں بھی سناتے تھے
کہانی سنانے کا انداز بہت خوبصورت تھا پھر نعیم بڑے ابا چلے گئے فلم نہ
بن سکی۔

خان بہادر نسیم بیگ چغتائی کے گھر کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اس لیے گھر
سامان بکنا شروع ہو گیا تھا اور بھائیوں میں جھگڑے شروع ہو گئے علیم بیگ چغتائی
سب سے چھوٹے تھے مگر سب سے لمبے چوڑے اور تگڑے تھے اور کام بھی کوئی خاص
نہیں کر رہے تھے اس لیے یہ حضرت ہی سب سامان بیچ کر کھا رہے تھے سب سے
چھوٹے ہونے کی وجہ سے ماں کے بھی لاڈلے تھے وسیم اور بصیم بڑے ضرور تھے مگر صرف
زبان لڑاتے تھے اور لڑتے رہتے تھے کیونکہ ان کے حصہ میں کچھ نہیں آ رہا تھا جھگڑا

میں عصمت چغتائی نے عظیم بیگ سے بیان لیا اور یہ بھی پوچھا کہ بہت سے لوگ آپ کو
سے بھی ہیں تو انھوں نے کہا کہ نہیں کیونکہ وہ اس وقت جالندھر میں تھے اور عصمت
بھی جالندھر میں تھیں یا بمبئی میں۔ عظیم بیگ چغتائی نے عصیم بیگ نے کافی بدتمیزی کی
اپنی عزت اپنے ہاتھ کے تحت وہ ان تینوں بھائیوں کے جھگڑے سے الگ رہنا چاہتے
یہ لوگ بجلی کے بل تک پر لڑتے تھے اس لیے عظیم بیگ چغتائی نے تو جھگڑوں سے بچنے
کے لیے بجلی کا میٹر الگ لگوا لیا تھا۔

عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کا ان لوگوں پر بڑا اثر تھا یا پھر اس کی کسی کمزوری
سے یا پھر ان لوگوں کی آمدنی اتنی کم تھی کہ یہ لوگ دوائیں چرا لیتے اخبار اور رسالے خود تو
خرید نہ سکتے تھے اس لیے وہ لگا چرا لیتے تھے اور وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے اخبار رسالے پڑھا
کرتے تھے اردو ہندی کے سب رسالے اور اخبار آتے تھے اور وہ سب میں لکھتے تھے
اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے مفلوج ہونے کے بعد صرف لکھنا ہی رہ گیا
تھا۔ کمزور ہوتے جا رہے تھے اس لیے کبھی اپنے بڑے بیٹے زمیم کو افسانہ بولتے تھے اور
وہ لکھتے تھے کوئی دس گیارہ برس کے ہوں گے اور کبھی اپنے بھانجے کو افسانہ بولتے
تھے اور وہ لکھتے تھے۔ دل بہلانے کے لیے اکثر مجھ سے شطرنج کھیلتے۔ اس لیے میری
شطرنج کم عمری سے اتنی اچھی تھی کہ عصیم بیگ اور رصیم بیگ کو ہرا لیتا تھا اس زمانے میں
ایک افسانہ کے پندرہ بیس روپے ملتے تھے گھر کے خرچ کے لیے کم از کم تین چار افسانہ
مہینہ میں لکھنے پڑتے تھے پھر کتابوں سے آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ جائیداد کی بکنی
سے بھی کما لیتے تھے اس طرح لیٹے لیٹے عظیم بیگ چغتائی کی آمدنی اپنے تینوں بھائیوں
اور عصمت چغتائی سے زیادہ تھی اس لیے یہ سب الگ رہتے تھے کہ یہ شخص لیٹے
لیٹے ہم سے زیادہ کما لیتے ہیں۔ یہاں ایک قصہ بھی لکھ دوں۔ رصیم بیگ صاحب کی
شادی کا ولیمہ ہوا تو دلہن بنانے کے لیے زیور نہیں تھے تو بیگم عظیم بیگ کا زیور مانگ کر

دلہن بنا لائی گئی۔ دوسرے دن بصیم بیگ صاحب زیور واپس دینے آئے تو میں بھی وہیں
موجود تھا۔ بصیم بیگ نے پوچھا کہ بھائی آپ کے پاس کتنا زیور ہوگا۔ اس پر عظیم بیگ چغتائی
نے جواب دیا کہ تم سب بھائی اپنی بیویوں کا زیور ایک جگہ جمع کر لو اور دگنا کر لو تب بھی
کم رہے گا۔ یہ وجہ تھی کہ سب لوگ عظیم بیگ سے نفرت کرنے لگے تھے جو تین بہنیں اور
دو بھائی جو بھوپال میں نہیں رہتے تھے وہ عظیم بیگ سے نفرت نہیں کرتے تھے جو بھوپال
میں ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ پروفیسر ٹیچر اور طالب علم ملنے آتے تھے کچھ نئے لکھنے
والے اصلاح لینے آتے تھے یہ مقبولیت بھی وسیم بیگ، عصمت چغتائی اور عصیم بیگ
کو پسند نہ آئی ہاں عصمت چغتائی، وسیم بیگ اور بصیم بیگ بدتمیزی نہیں کرتے تھے۔
بدتمیزی کرنے میں صرف عصیم بیگ تھے اس کے علاوہ عظیم بیگ چغتائی کو ایذا دینے کے
لیے یہ لوگ، خاص کر عظیم بیگ بچوں پر ظلم کرتے تھے۔ بیگم عظیم بیگ کو بھی بہت تنگ
کیا۔ وہ صرف دو کمروں میں بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ بات بے بات بچوں کو مارتے تھے
یہاں دو تھے لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے چھوٹی بیٹی طلعت پانچ چھ برس
ہوگی معمولی سی بات پر عصمت چغتائی نے بال پکڑ کر اس زور سے کھینچے ہیں کہ ایک
بڑا گچھا ہاتھ میں آگیا تھا۔ ایک میرا اپنا قصہ ہے کہ میں کوئی آٹھ برس کا تھا اپنے
بڑے لڑکے کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا اور جیت رہا تھا عصیم بیگ چغتائی بڑے
لڑکے کو بتا رہے تھے بے ایمانی کرنی چاہیے میں نے ہاتھ پکڑ لیا اور بے ایمانی نہ
کرنے دی تو غصہ ہو کر اتنا مارا کہ بے ہوش کر دیا تھا ان لوگوں کی مار سے بڑے
اور دو بہنیں بچی ہوئی تھیں۔ کیونکہ نزہت اور زعیم پہلے پوتا پوتی تھے اور دادی
بہت لاڈلے تھے اس لیے عذاب تین چھوٹوں پر تھا میرے خیال میں یہ لوگ بچوں
پر ظلم کر کے نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ یہ میں ضرور کہوں گا کہ عصمت
مجھ پر کافی مہربان رہتی تھیں۔

بیگم عظیم بیگ چغتائی اور بچے ٹرین سے رامپور چلی گئیں۔ صرف عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ وہ گئے۔ بڑی بیٹی نزہت علی گڑھ میں پڑھتی تھیں اور آتی جاتی رہتی تھیں۔ بیگم عظیم بیگ چغتائی کے رامپور جانے کے بعد عصیم بیگ چغتائی نے ظلم کی حد کر دی۔ عظیم بیگ کے کمرے کے دروازے آنگن میں کھلتے تھے ان کو بند کر کے تختہ جڑ دیا اور دھوپ اور تازہ ہوا آنے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ جس وقت تختہ جڑ رہے تھے تو عظیم بیگ کہہ رہے تھے اے جو یہ کیا کر رہا ہے (جو عصیم بیگ کا پیار کا نام تھا) گڑگڑا رہے تھے اور یہ چھوٹے اپنے آپ کو شیر سمجھ رہے تھے۔ اس سے پہلے ایک اور کمزور اور اسی سال سے بھی زیادہ عمر والے تایا ابراہیم بیگ صاحب کو بھی گھر سے نکال چکے تھے۔ دونوں حادثوں کے وقت میں کھڑا ہوا تھا بچہ تھا مگر ایک ایک بات یاد ہے جب وہ تختہ جڑ رہے تھے تو آنگن میں عصمت چغتائی اور ان کے دو بھائی بصیم اور وسیم بھی موجود تھے اور عظیم بیگ چغتائی کی والدہ بھی موجود تھیں مگر عظیم بیگ کا کوئی نہ تھا یہی نہیں بلکہ بچوں کو بھی حکم دیا کہ باپ کے پاس جاؤ گے تو پٹو گے۔ بچے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ میں شطرنج کھیل کر دل بہلاتا تھا اور بڑے بھائی افسانہ لکھتے تھے بڑی بیٹی نزہت علی گڑھ سے آئی تو دروازے بند دیکھے، لڑکی تھی خود توڑ نہیں سکتی تھی۔ باپ کی محبت میں بڑے ماموں ظفر حسین عثمانی کو بلا کر لائی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بڑے ماموں اللہ کا واسطہ دے رہے تھے اپنے بڑھاپے کا واسطہ دے رہے تھے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ یہ تم لوگوں نے کیا کر رکھا ہے۔ عصمت چغتائی وسیم بیگ، بصیم بیگ اور والدہ سب ہی موجود تھے عصیم بیگ اوپر چھت پر کھڑے تھے۔ ان التجاؤں کا جواب بڑے ماموں کو چپ کرانے کے لیے عصیم بیگ نے یہ دیا — "ے بڈھے تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے تیری گردن بھی مروڑ دوں گا" یہ لفظ بہ لفظ لکھ رہا ہوں۔ عصمت چغتائی "دوزخی" میں لکھتی ہیں گالی گلوچ کی زبان وائلنس اختیار کر لی۔ حالانکہ ان لوگوں نے عظیم بیگ کی زندگی دوزخ بنا دی تھی۔

لڑی بہت زیادہ روتی دھوتی ہل گئیں کچھ دنوں کے بعد ہی عظیم بیگ چغتائی کی طبیعت مزید خراب ہونا شروع ہو گئی اور وہ دن نزدیک آنے لگا سب بڑا بیٹا قریب تین چار سال سے مفلوج تھے پلنگ سے لگے ہوئے تھے لیکن قلم آخر وقت تک چلتا رہا اخبار بھی نکال رہے تھے اشتہار شروع کر دیے تھے اخبار کا نام "جارجی" رکھا تھا سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ۱۹ اگست کی شام کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ دوسرے دن صبح ۲۰ اگست کو گھر کی فضا بہت مکدر تھی ویسے تو جب سے ہم لوگ جاورہ سے آئے تھے فضا تو کبھی بھی اچھی نہیں رہی مگر اس دن مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ دہشت طاری تھی نہ کیا ہو گا۔ سب ہی لوگ آنگن میں تھے۔ عظیم بیگ چغتائی کے کمرے کے دروازے کھول دیے تھے۔ عظیم بیگ کی والدہ نے دروازوں کے تختے اتروا دیے تھے اور اب ان کے آنے جانے میں آسانی ہو گئی تھی یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح کے نکلنے کے لیے دروازے کھول دیے گئے تھے اس سے پہلے گھر کے باہر سے پچھلے دروازے سے آ جا سکتے تھے یا پھر چھت پر چڑھ کر ایک سیڑھی اس کمرے میں جاتی تھی جہاں عظیم بیگ کو ان لوگوں نے قید کر رکھا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسکول جانا ہے کہ نہیں۔ میرے دو بھائی کہاں تھے مجھے نہیں یاد۔ اتنے میں جنو بھائی (عصیم بیگ) اوپر سے ہاتھ میں بکس اور ہولڈال لیے نیچے اترے کسی مقدمہ میں باہر جا رہے تھے ان کی نظر عظیم بیگ چغتائی کے کمرے کے دروازوں پر پڑی کھلے ہوئے دیکھے یہ بھی دیکھا کہ لوگ اندر باہر آ جا رہے ہیں ـــــ عصیم بیگ کا پارہ چڑھ گیا بڑی بدتمیزی سے بولے یہ دروازے کس نے کھولے ہیں اس پر دادی نے جواب دیا میں نے کھلوائے ہیں مجھے منے (عظیم بیگ) کے پاس آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے کیونکہ میرے گھٹنوں میں تکلیف ہے (گٹھیا کی بیماری تھی) مجھ سے سیڑھیاں نہیں اتری چڑھی جاتیں اور عصیم بیگ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ سب ہی لوگ آنگن میں تھے کسی کی مجال نہیں تھی جو بولتا۔ ادھر عظیم بیگ

آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔ رات سے ہی نزع کی حالت تھی ہوش آتے تھے اور جاتے
پھر کسی نے کہا کہ ماں کو یاد کر رہے ہیں چیلا دوسری بیٹی صحت کو مدد کہتے تھے۔ یہ
بیٹی تھی رامپور والی بہن نے گود لے رکھی تھی نزع کی حالت میں دن کی آواز نکل رہی
تھی پھر مجھے جانے کیوں دادی نے اسکول بھیج دیا۔ میرے بڑے اور چھوٹے بھائی
اس منحوس دن اسکول نہیں گئے۔

اسکول میں گھنٹہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ میرے رشتہ دار جو کالج میں پڑھتے تھے
لینے آگئے۔ انھوں نے کلاس کے ماسٹر سے انگریزی میں کچھ کہا مجھے لفظ نہیں یاد
میں سمجھ گیا کہ یتیم ہو گیا خاموشی سے ان کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر گھر آیا پورے راستے
دونوں نے بات نہیں کی۔ خاموش رہے گھر آکر کمرے میں جانا چاہا مگر جانے نہیں
گیا۔ عصمت چغتائی کے کسی گاندھی کے چیلے نے ہم بچوں کو گلے لگا کر تسلی نہیں دی میت
کو غسل دیا گیا آنگن میں کمروں سے پانی بہہ کر آرہا تھا سب لوگ آنگن میں تھے۔ تھوڑی
کے بعد جنازہ آنگن میں لا کر رکھا گیا کوئی آخری دفعہ منہ دکھانے کے لیے کفن کھولنے
مگر دادی نے روک دیا۔ وہاں کون تھا جو منہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ماں بھائی بہن تو
دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ بھی کسی نے نہیں سوچا کہ آخری دفعہ بچوں کو تو باپ کا
دکھا دو۔ بچوں کو بھی آخری دیدار نہیں کروایا اور نہ ہی کسی کو دو آنسو بہاتے دیکھا
ہم لوگوں کے آنسو بھی خشک تھے جنازہ اٹھوا دیا گیا ہم تین بھائی بھی ڈرے جنازہ کے
پیچھے ہو لیے ہم تینوں ساتھ تھے ہم پر دہشت طاری تھی۔ قبرستان پہنچے نماز جنازہ
ہوئی اس کے بعد عظیم بیگ کے بڑے ماموں ظفر حسین عثمانی نے قبر میں اتارا اس وقت
میرے بڑے بھائی نے کہا کہ جب آخری دفعہ منہ دکھائیں تو رونا نہیں کیونکہ مرد نہیں
روتے۔ ہم تین مرد بھی جب آخری دفعہ ماموں نے منہ دکھایا ہے تو اور مردوں کی طرح
نہیں روئے نہ ہی آنسو ٹپکے اور تھوڑی دیر میں منہ بند کر دیا گیا بڑے ماموں قبر سے

آئے سب نے مٹی پلیدنی شروع کر دی۔ ہم بھائیوں نے بھی مٹی ڈالی اور تھوڑی دیر میں قبر بنا دی گئی۔ خان بہادر قسیم بیگ کے برابر میں دفن ہوئے فاتحہ پڑھی گئی اور ہم لوگ گھر واپس آ گئے۔ گھر آ کر پھر کمرے میں جانا چاہا مگر نہیں جانے دیا گیا۔ ویسے اب رکھا ہی کیا تھا یہ بھی یاد ہے جو پیسے تکیے کے نیچے سے نکلے تھے کفن دفن کے بعد ۲۴ یا ۲۵ روپے بچے تھے۔

اس رات عصمت چغتائی مجھے ساتھ لے کر سوئی ہیں ویسے بھی مجھ پر مہرباں رہتی تھیں سونے سے پہلے کہنے لگیں کتنی تکلیف میں تھے سب تکلیفیں دور ہوئیں۔ مجھ پر ایسی دہشت طاری تھی کہ میں پھر بھی نہیں رویا اور خاموش رہا۔ پھر مجھ سے کہا یا اجازت لی کہ میں نے بھائی کے قلم لے لوں کیونکہ میں لکھتی ہوں (اس سے پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ عصمت چغتائی مصنف ہیں میری عمر نو برس تھی) مجھے یاد ہے میں نے کہا کہ لے لیں۔ عظیم بیگ چغتائی تین چار کھرکے قلم رکھتے تھے لال، ہری اور نیلی سیاہی کے لیے الگ الگ قلم تھے جب ۱۹۵۴ میں کراچی سے بمبئی گیا ہوں تو عصمت چغتائی کے پاس وہ قلم نہیں تھے نہ میں نے پوچھا کہ وہ قلم کیا ہوئے۔

(چوتھی قسط)

مہراج سامنی

عوامی تھیٹر کانفرنس
کے بعد

کنول نین پرواز

جب تک گاڑی احمد آباد سے بمبئی سنٹرل پہنچی، طبیعت بے حد شکستہ حالت میں تھی عوامی تھیٹر کی کامیاب کانفرنس کے بعد اگرچہ دل و دماغ آسمان پر تھے لیکن جسم کچھ دنوں سے آرام دہ بستر کے لیے پکار رہا تھا۔ میں نے والدین کو پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ واپسی میں ناسک کے لیے ایک دم سے گاڑی کا ملنا مشکل ہو جائے گا اس لیے دو تین روز باندرہ میں گزار کر وہاں واپس لوٹوں گا۔

مہراج جی میری حالت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ لوگ بھیشم جی، شیلا جی اور شوکت اعظمی ٹیکسی لے کر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک آدھ لوگوں کو اتار رہے تھے وہ بے حد مُصر تھے کہ میں اُن کے ساتھ جو چلوں اور پھر ایک دو روز آرام کرنے کے بعد وہیں سے ناسک چلا جاؤں۔ ان کی اس دعوت میں بڑی کشش تھی لیکن یہ

ممکن نہیں تھا۔ اول تو ان کے یہاں کافی لوگ ٹھہرے تھے، دوسرے میں نے اپنے باندرہ میں رشتہ داروں کو لکھ دیا تھا کہ ناسک جانے سے پہلے ان کے یہاں ضرور آؤں گا۔ میں نے کہا "وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔"

زیادہ زور دینے پر وہ مان گئے لیکن مجھے باندرہ تک ساتھ ٹیکسی میں چلنے کو کہا۔ اسٹیشن سے سیدھی بس ٹری باقاعدگی سے میری جائے رہائش تک چلی تھی۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے وعدہ کیا کہ دو تین ہفتوں میں پھر بمبئی آؤں گا اور ان سے ضرور ملاقات ہوگی!

دوسرے روز میں باندرہ سے دوپہر کو اپنے والد صاحب کے کاروباری دفتر اپنی ڈاک وغیرہ دیکھنے گیا۔ تو سرینگر کے دونوں دوستوں پران کشور اور جتوجتہ کی چوپڑہ کے خط ملے۔ پران کو میری کانفرنس کی رپورٹ ابھی تک نہیں ملی تھی۔ یہ میں نے احمد آباد سے ہی بھیج دی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ رپورٹ ملتے ہی وہ دونوں خدمت کو اشاعت کے لیے دے دیں گے۔ چوپڑہ کے خط سے پتہ چلا کہ وہ اب جلدی بمبئی آ رہے ہیں۔ ان کے خط سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بمبئی پہنچ گئے ہوں گے۔ رامانند ساگر کے بارے میں لکھا تھا کہ اب وہ اپنی ہی فلم "بارود بند" کی تیاری میں ہیں، بلراج ساہنی کو اس کو اس میں اہم پارٹ دینے کی سوچ رہے ہیں اور دادر کے قریب ماٹنگا کے علاقے میں فلیٹ وغیرہ کا انتظام ہو رہا ہے۔ لیکن میرے پاس رامانند ساگر کا پتہ نہیں تھا۔

دفتر سے نکلتے ہی میں نے کافی ہاؤس کا رخ کیا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ شاید انھیں کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ پھر میں میرین ڈرائیو کے کیفے "پیرسین ڈیری" پہنچا جو فلمی لوگوں کے ملنے کا اڈہ تھا ——— وہاں بھی ان کا کچھ پتہ نہیں ملا۔ حالانکہ ان کے اور میری جان پہچان کے لوگ وہاں موجود تھے۔

تیسرے روز میں ناسک میں تھا۔

جس بات کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا، ناسک پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ ہفتہ

ہمارا ڈاکٹر دوبارہ آیا۔ اس نے بتایا کہ زیادہ فکر کی کوئی بات نہیں جگہ جگہ کے کھانے اور آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے جسم میں بے حد تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ تین چار ہفتے میں طبیعت بحال ہو جائے گی۔

خوش قسمتی سے یہ جگہ شہر کی آبادی سے دس بارہ میل دور تھی۔ ہمارا مکان بڑی اونچائی پر تھا۔ یہاں دو بنگلے تھے۔ والد صاحب کے دوست جنھوں نے اس مکان کا انتظام کیا تھا، دوسرے بنگلے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ہفتے میں پانچ دن سمئی کے دفتر میں کام کرتے تھے اور جمعہ کی شام کو دو تین روز کے لیے اپنی موٹر کار سے یہاں آجاتے تھے۔ برلا کالونی کوئی دس منٹ چل کر راستے میں تھی۔ یہ مکان بھی اس کالونی کا حصہ تھے۔ چاروں طرف ہرے بھرے کھیت تھے۔ نیچے کی طرف ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی سارا دن بھلی بھلی ہوا چلتی تھی اور رات کو قدرے ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ بجلی کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے نہ تو ریڈیو تھا اور نہ ہی رات کو پڑھنے کا انتظام اس لیے دن بھر پڑھنے اور لکھنے کے لیے بہت وقت ہوتا تھا۔

طبیعت بحال ہوتے ہی ایک روز میں کالونی تک جا پہنچا۔ اسکول کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس عمارت میں اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے رہنے کا انتظام بھی تھا عمارت میں کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ یہ گہما گہمی اس لیے تھی کہ اسکول میں استادوں وغیرہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ میری ہمشیرہ کو بھی یہاں پڑھانے کا کام مل گیا تھا۔ اسکول کے پرنسپل مسٹر پنڈت اپنے کشمیر کے ہی تھے۔ ان کے چھوٹے بہن بھائی اور ماں جی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے!

ایک روز شام کو بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے ان کے چھوٹے بھائی نے جو میری عمر کے تھے اور میرے دوست بن گئے تھے، میرا اپنے ایک اور بھائی سے تعارف کرایا، بھوشن جی! وہ سمئی میں رہتے تھے۔ انھیں فلموں سے بے حد دلچسپی تھی بلکہ وہ فلموں میں کھنے کی بہت کوشش کر رہے تھے۔ جب ان کے چھوٹے بھائی نے انھیں بتایا کہ میں بلراج جی کو اچھی طرح جانتا ہوں تو کہنے لگے "یار! پھر ان سے تعارف ہو جائے۔"

شام کو بیڈ بائک اور بیڈمنٹن کے کھیلوں میں ہم لوگ اکثر حصہ لیتے اور پھر کھیتوں میں دور دور تک چہل قدمی۔ میری طرح انہیں بھی اس بات کا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن بلراج ساہنی ہندستان کی فلمی صنعت پر چھا جائیں گے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ رامانند ساگر انہیں "بازو بند" میں پارٹ دے رہے ہیں، کہنے لگے "تو آپ ساگر صاحب کو بھی جانتے ہیں؟ ـــــ میرا بھی ان لوگوں سے تعارف ضرور ہونا چاہیئے"

میں نے کہا "بلراج ساہنی اور رامانند ساگر کی ملاقات بھی میری بدولت ہی ممکن ہوئی تھی ـــــ میں اگلے ہفتے بمبئی جا رہا ہوں، بتایئے کہاں ملاقات کا انتظام ہو؟"

بھوشن جی، طویل قد، بھرا ہوا جسم، کشادہ کندھے، گندمی رنگ، گھونگریالے بال، ہالی وڈ کے مشہور اداکار کلارک گیبل کی سی مونچھیں ـــــ جن کی پتلون کی کمر پر میں بھی دہی سلیقہ تھا جو ان کی مونچھوں کی بناوٹ میں۔

بہت پیاری اردو بولتے تھے، بڑی خوبصورت آواز تھی۔ میں نے سوچا اس شخص کو ایکٹر بننے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے، لیکن پھر ہماری فلم انڈسٹری کے آداب و اطوار ہی کچھ اور ہیں۔ ایک روز میں نے ان سے یوں ہی کہا "اگر آپ کو فلم میں ہیرو کا پارٹ مل گیا تو یہ بھوشن نام کچھ جچ نہیں رہا، آپ نے کوئی اور نام سوچا ہے؟"

ایک لمحہ خاموش رہے پھر بولے "جی ہاں، راجکمار کیسا رہے گا؟"

اب میں بمبئی جانے کے لیے بے تاب تھا۔ تین ہفتے کے آرام کے بعد ڈاکٹر نے سفر کرنے کی اجازت دے ہی دی۔ میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچا تو انہوں نے بتایا کہ میرے امریکہ میں رہنے والے چچا صاحب بڑی بے تابی سے میرا وہاں انتظار کر رہے تھے۔ ان کے صاحب زادے بھی وہیں تھے اور کام بڑھنے کی وجہ سے انہیں میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے والد صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ ان کے دفتر

میں ہر روز منیجر کے لیے کام کر کے کچھ تجربہ حاصل کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہوا
تھیٹر میں کچھ ہفتے کام کرنے کا پلان ملتوی کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک روز [illegible]
صاحب کے گھر پر فون ملایا تو خوش قسمتی سے وہ گھر پر تھے۔ بولے "یار کمال ہے [illegible]
زمانہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی، اس اتوار کو آجاؤ۔"

میں نے انھیں بتایا کہ اس اتوار کو میں مصروف ہوں۔ کہنے لگے "اگلے اتوار
کو میرے کچھ مہمان دہلی سے یہاں آرہے ہیں۔ مجھے بمبئی سنٹرل انھیں لینے جانا ہے۔
دوپہر کو چرچ گیٹ آرہا ہوں، پیرسن ڈیری میں مل جاؤ۔ دو چار گھنٹے ادھر ادھر
گھوما جائے۔ تم شام تک میرے ساتھ رہو، پانچ بجے کی گاڑی سے یہ لوگ آرہے ہیں
مجھے ان کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اگلے سوموار کو ملنے کا پروگرام طے ہوگیا
مجھے پیرسین ڈیری میں زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا۔ انھوں نے دو تین
کا وقت دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دوپہر کا پروگرام بنا لیا تھا۔ پیرسین ڈ
میں ایک آدھ چائے پینے کے بعد جہانگیر آرٹ گیلری اور پھر وہاں سے ریگل سینما
امریکی فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔

میں نے انھیں اپنا پروگرام بتایا تو کہنے لگے "زمانہ ہوا گیلری میں گئے ہو
بڑا نیک خیال ہے۔ آج فلم کا پروگرام رہنے دو، دیر ہو جائے گی۔ ہاں گیلری کے قر
جیتا ریستوران ہے، ساؤتھ انڈیا کا بہترین کھانا ملتا ہے، بڑے اچھے سنیک
بھی ہوتے ہیں وہ اکثر مصوروں کی نمائش بھی کرتے ہیں، سنا ہے بہترین جگہ ہے۔"

میں نے ان کی بات مان لی کہ فلم کا پروگرام پھر کسی اور روز بنائیں گے۔ آ
چاہیں تو میں نے صلاح دی جہانگیر آرٹ گیلری کے بعد جیتا پر بھی ایک نظر ڈ
جیں۔ ساؤتھ انڈیا کے سنیک SNACKS کے لیے بوری بندر کے اسٹیشن کے ریستو
کا جواب نہیں، بڑی صاف ستھری جگہ ہے، اسٹیشن تو تمہیں جانا ہی ہے وہاں آر
سے ایک دو گھنٹے ٹھہر سکتے ہیں وہیں گپ بازی بھی ہوتی رہے گی۔"

وہ مان گئے۔

پریسین ڈھری میں ہم لوگ ایک گھنٹہ بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بھیشم جی جلد ہی دہلی لوٹ جائیں گے۔ بغیر کام کے یہاں بمبئی جیسے شہر میں رہنا ممکن نہیں۔ علاوہ تھیٹر سے کسی آمدنی کا سوال ہی نہیں اٹھتا، ان کی اپنی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ بچوں کو پریس میں پڑھانے کے بہت خرچے ہیں۔ پھر انھوں نے یکدم سے موضوع بدل دیا "ہاں تو تم امریکہ کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہو؟ وہاں کیا کام کرو گے؟ واپس لوٹنے میں شادی خانہ آبادی"

میں نے کہا "آپ بھی بالکل میری اُن بچی کی طرح بات کر رہے ہیں جن کے ہاں میں باندرہ میں رہتا ہوں۔ اُن کا بس چلے تو میری آج ہی شادی کر دیں۔ انھیں ڈر ہے کہ امریکہ میں کوئی امریکن لڑکی مجھے پھانس لے گی اور پھر اگر شادی کر بھی لوں تو امریکہ میں میں منسا ہے چاچا صاحب کا فلیٹ بہت بڑا نہیں، ان کے لڑکے بھی ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں حالانکہ ان کے بیوی بچے یہیں رہتے ہیں لیکن شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں، اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہ اس بچاری لڑکی کو دو چار برس کے لیے اکیلے یہاں چھوڑ دیا جائے"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو" وہ ہنس کر بولے "ویسے یار کوئی تمہاری نظر میں تو ضرور ہوگی؟"

میرے جواب دینے سے پہلے خود ہی بول اٹھے "شادی نہ سہی لیکن سگائی وغیرہ کرنے میں تو کوئی ہرج نہیں، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، لڑکیاں بمبئی میں بھی بہت ہیں"

ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر باہر آئے تو پہلے تو انھوں نے ایک ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کی۔ پھر کہنے لگے کہ آج اتنی زیادہ گرمی نہیں، چرچ گیٹ تک تو سڑک کی اس طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ پھر ایرس EROS سینما سے ایک باغ سے بھی گزرنے کا راستہ تھا۔ کالا گھوڑا کے بت کے سامنے ہی تو جہانگیر آرٹ گیلری تھی، ہم نے پیدل چل کر جانے کا فیصلہ کیا۔

گیلری میں کافی لوگ تھے۔ یہ محض بیکار نوجوان نہیں تھے بلکہ اکثر ادھیڑ عمر کے لوگ تھے۔ میں نے کہا "لگتا ہے بمبئی میں جیسے سب عمر کے لوگوں کو تصویر کشی کے فن میں دلچسپی ہے اور پھر اکثر متوسط گھرانے کے لوگ ہیں۔ یہ قیمتی تصویریں خریدنے کے لیے یہاں صرف مالدار ہی آسکتے ہیں۔"

وہ بولے "میں مغلیہ زمانے کی مثال دے سکتا ہوں۔ اکبر اور شاہ جہاں شاید ہماری تواریخ میں سب سے بڑے فن اور موسیقی کے سرپرست تھے لیکن ادب اور آرٹ کو مالدار اور حکومت کی اتنی سرپرستی کی ضرورت نہیں، جتنی عوام کی ہے۔ اگر زندگی کے حالات مناسب ہوں اور آرٹسٹ روزی کمانے کی فکر نہ ہو تو سماج کے ہر فرد میں نہ صرف اسی نمائشوں میں یہ تصویریں رکھنے کی خواہش بلکہ انھیں خریدنے کی اہلیت بھی ہوگی۔ روس میں دیکھیے کیا ہو رہا ہے عوامی آرٹ اور عوامی سرپرستی۔"

ایک تصویر دیکھ کر وہ رک گئے اور پھر بولے "یہ کانگڑہ کی تصویر ہے ـــــ بے حد خوبصورت ہے۔ لیکن آرٹ کو صرف قدرتی خوبصورتی تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے مجھے کشمیر کی قدرتی خوبصورتی کا خیال آرہا ہے۔ وہاں کی جھیلیں، آبشار، باغات، پہاڑ، فن کار کے لیے یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ لیکن اس پس منظر کے سامنے غربت ہے، بیکاری ہے، بھوک ہے، بے بسی ہے ـــــ ڈوگرہ آرٹ کی ایک بہت اچھی روایت چلتی آرہی ہے۔ کشمیری آرٹ کب تک اس کا انتظار کرے گا؟"

میں نے انھیں بتایا کہ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ اب مصوری کی ایک نئی پود کا جنم ہو رہا ہے۔ اس میں بٹ، کاچرو اور کول بہت نمایاں ہیں ان کے گھروں میں رنگارنگی اور زندگی کی لگن ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ان مصوروں کی تصویریں بھی ایسی ہی گیلریوں میں دکھائے جانے کے قابل ہوں گی بلکہ انھیں آج بھی اس نمائش میں حصہ لینا چاہیے۔"

یہ سن کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کشمیر کے

ان مصروفیتوں کے روشنی مستقبل میں خود ان کی ذاتی امنگوں کا دخل ہے۔

جب ہم دونوں جہانگیر آرٹ گیلری سے باہر آئے تو ابھی گاڑی کے آنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے کہا "اگر آپ چاہیں تو یہیں چائے پی لی جائے۔"

وہ بولیں "تم نے آج نوری بندر کے ریستوران کے لیے کہا ہے تو آج کافی وہیں پی جائے گی۔ وقت کافی ہے۔ گرمی زیادہ نہیں، پیدل چلتے ہیں۔"

ہم سوچ ہی رہے تھے کہ خوش قسمتی سے نوری بندر کی بس آگئی۔ ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

ریلوے اسٹیشن کا ریستوران حسب معمول لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمیں کھڑکی کے قریب ہی ایک میز پر جگہ مل گئی۔ یہاں سے سب پلیٹ فارم نظر آرہے تھے اور وہ بورڈ بھی بالکل سامنے تھا جہاں آنے اور جانے والی گاڑیوں کے وقت دیے جا رہے تھے۔ انھوں نے کافی اور میں نے چائے منگوائی، ساتھ میں سموسے اور کوچین کا ایک خاص سیک

-- اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بلراج جی ریستوران کی سروس اور کوالٹی سے بے حد متاثر تھے۔ کہنے لگے "ایک روز اپنے ان مہمانوں کو بھی یہاں لانا پڑے گا۔ آپ بھی شرکت کیجیے گا۔"

-- میں نے ان مہمانوں کے بارے میں پوچھا چاہا تو انھوں نے صرف ایک قہقہے سے اس کا جواب دیا۔

جب تک دہلی سے آنے والی گاڑی کا اعلان ہوا تو چائے اور کافی کے دو دور چل چکے تھے۔ بل آیا تو انھوں نے ویٹر کے ہاتھ سے لے لیا۔

میں نے کہا "اس ریستوران کی دعوت میں نے آپ کو دی تھی مجھے یہ بل ادا کرنے دیجیے بلراج جی!"

ویٹر کے ہاتھ میں بل کے پیسے دیتے ہوئے وہ مجھ سے بولے "پتر (برخوردار) جب امریکہ سے بڑے صاحب بن کر آؤ گے تو پھر تمہیں ہی بل دینے کے لیے کہوں گا"

آج تم صرف خاموش رہو، آج بزرگوں کو اس خدمت کا موقع دو۔"

"بزرگ" میں نے قہقہہ لگا کر کہا "میں تو سوچتا تھا کہ ہم دو جنے ہیں یہ بزرگی کہاں سے آگئی؟"

اس وقت انھوں نے پہلی بار مجھے "تم" کہہ کر پکارا تھا۔

جب ہم پلیٹ فارم پر آئے تو گاڑی اندر داخل ہو چکی تھی۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ ٹیٹ کے قریب ہی کھڑے رہیں۔ لیکن انھوں نے یکدم سے آگے تیزی سے بڑھنا شروع کر دیا۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بلراج جی کی نظریں گاڑی کے ہر کمپارٹمنٹ میں جیسے اپنے "مہمانوں" کو باہر ہی باہر سے ڈھونڈنے کی کوشش میں تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا کہ یہ سب لوگ اس گاڑی کے دوبارہ روانہ ہونے پر کہیں جا رہے ہیں یا اپنے مہمانوں کا استقبال کرنے آئے ہیں۔ ہمارے ریلوے اسٹیشنوں کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ پلیٹ فارم پر اکثر لوگ تماش بین ہوتے ہیں یا ایک مہمان کو لینے کے لیے سارا کنبہ چلا آتا ہے۔ یہ روایت شاید اس زمانے سے چلی آ رہی ہے جب ریلوے انجن اور گاڑیوں کو دیکھنے کے لیے نہ صرف بچے بلکہ ہر عمر کے لوگوں کو اشتیاق تھا۔

میں ابھی اس طرز زندگی کے بارے میں اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا کہ سامنے سے زور زور کی آواز سنائی دی "ماما جی، ماما جی۔"

اور دیکھتے ہی دیکھتے دو نوجوان خواتین بلراج جی کے قریب آ پہنچیں۔

بلراج جی آگے بڑھے اور تینوں بغلگیر ہو گئے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ارے یہ تو ان کی بھانجیاں اوشی اور پرساں ہیں۔ میرا سر چکرا گیا "ہیلو ہیلو" کے الفاظ جیسے میرے ہونٹوں پر منجمد ہو گئے۔ بلراج جی زور زور سے قہقہہ لگا کر کہہ رہے تھے "بھئی میں ان مہمانوں سے ملو۔ ارے آپ تو ایک دوسرے کو جانتے ہی ہیں؟"

بلراج جی کی آنکھوں میں جس شرارت کی چمک تھی اب میں اس سے بخوبی

واقف ہو چکا تھا۔

میرے نیویارک کے سفر کے لیے اب ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ ممبئی سے بار بار بمبئی آنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک روز صبح کی ڈاک کھولی تو ایک خط دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ خط بلراج جی کی سگی بھابھی پربھا کا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ بلراج جی شکایت کر رہے ہیں کہ آپ کو جو ہوائے زمانہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اب آپ کا امریکہ جانے کا پروگرام بن چکا ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اگلے اتوار ضرور آئیے وہ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

ضروری باتیں؟

خیر اگلے ہفتے میں نے باندرہ جانے کا پروگرام بنا ہی لیا اور اس اتوار کو ان کے "دعوت نامے" کے مطابق لنچ پر پہنچ ہی گیا۔ گھر پر پہلے ایسا لگا جیسے صرف نوکر ہی ہے کسی نے میرا "خیر مقدم" نہیں کیا لیکن اتنے میں پربھا برآمدے میں آئی اور بولی "ماما جی اور اوشی سمندر میں ایک آدھ غوطہ لگانے گئے ہوئے ہیں، بس آنے ہی والے ہوں گے، آپ ڈرائنگ روم میں ہی آجائیے۔ میں کچن میں نوکر کی کھانے میں مدد کر رہی ہوں، یوں کہیں آج آپ بھوکے ہی رہیں گے، کافی بھجواؤں آپ کے لیے یا کچھ ٹھنڈا پئیں گے؟"

میں نے لسی کی فرمائش کی۔

لسی آگئی اور اس کے ساتھ ہی بلراج جی اور اوشی بھی۔

کھانے کی میز پر جیسے لنچ تیار ہی تھا۔ لنچ کی میز پر کچھ زیادہ باتیں نہیں ہوئیں وہ دونوں بہنیں بس چند ہفتوں کے لیے آئی تھیں پھر دہلی واپس جا رہی تھیں، کالج میں وہاں داخلہ تھا۔ بلراج جی تھکے ہوئے لگ رہے تھے ـــــ اوشی حسب معمول چہک رہی تھیں۔

"ضرور، ماتیم!" میرا ذہن بار بار جیسے اس بات کو دہرا رہا تھا۔ کھانے

کے بعد بلراج جی اٹھ کھڑے ہوئے: "آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ دوپہر کو دو تین بجے سونے کی کتنی بُری عادت پڑی ہوئی ہے، لیکن آج مجھے اس عادت کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ ایک کم بخت پروڈیوسر نے آج اتوار کی دوپہر کو ہی ملنے کو کہا ہے۔ کنول! تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "بلراج جی! اس میں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں، میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

پہلے وہ نہیں مانے، پھر کہنے لگے "کوئی بات نہیں، لوکل ٹرین سے ہی چلے گے راستے میں کچھ گپ بازی ہوتی رہے گی۔"

میں راستے میں باندرہ اُتر گیا، وہ دادر کسی فلم اسٹوڈیو جا رہے تھے ــــ راستے میں کوئی ضروری باتیں نہیں ہوئیں۔

اگلے روز جب میں اپنے کاروباری دفتر کام کے لیے گیا تو میرے چھوٹے چا جی اس وقت یہ آفس سنبھال رہے تھے۔ کہنے لگے "ابھی ابھی ایک خاتون کا فون تھا، فون نمبر لیا ہے لیکن نام نہیں بتایا، کہہ رہی تھیں آپ کہہ جائیں گے۔"

یہ بلراج جی کے گھر کا فون نمبر تھا۔ میں نے ایکدم سے فون کیا اور بلراج جی کو پر آنے کی گذارش کی تو اوشی فون پر آئیں، کہنے لگے "افسوس ہے کل آپ جلدی جانا پڑا۔ بلراج جی کہہ رہے تھے کہ ایک روز دوپہر کو آپ ہمیں چرچ گیٹ مل جائیں۔ ہم چاروں ایروس پر انگریزی فلم دیکھیں گے اور پھر پیرسین ڈیری چیتنا میں چلے وغیرہ پی جائے گی۔"

دوسرے روز کا پروگرام طے ہو گیا۔

دوپہر کے تین بجے ان لوگوں سے چرچ گیٹ اسٹیشن پر ملنا تھا۔ یہاں لو ٹرین ہر پانچ دس منٹ میں آتی رہتی ہے اس لیے یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کون گاڑی سے آئیں گے۔ میں وہاں پونے تین بجے پہنچ گیا اور بورڈ پر سانتا کروز آنے والی ہر گاڑی سے اُترنے والے مسافروں پر میری نظر تھی۔

سوا تین بجے تک ان لوگوں کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ میں پلیٹ فارم کے گیٹ کے بالکل قریب ہی کھڑا تھا اس لیے وہ لوگ دوسری طرف سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے سوچا ساڑھے تین بجے تک انتظار کروں گا۔ اگر وہ لوگ نہیں آئے تو پھر سین ٹی ہری کیفے کی طرف آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دوں گا۔

اگلی گاڑی جب آئی تو اترنے والوں میں میں نے پربھا کو دیکھا کہ وہ اکیلی تھی۔ انھوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور جلدی جلدی وہ پلیٹ فارم سے باہر آئیں آتے ہی بولیں "سوری ——— بلراج جی اور اوشی کچھ دیر سے آئیں گے، بلراج جی اوشی کو چھوڑنے کہیں اور لے کر جانا تھا۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم دونوں سامنے ایرانی ریسٹوران میں ان کا انتظار کریں۔ اگر انھیں پھر بھی دیر ہو گئی تو سیدھے ایروس سینما چلے آئیں۔ ان کے کہنے میں ان کا انتظار کرنے کو کہا ہے۔"

ایرانی کیفے میں ہم لوگ کوئی پون گھنٹے انتظار کرتے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں "دینو (دیپتی ساہنی) کی وفات کے بعد انھیں اگرچہ دونوں بچوں کی بے حد فکر تھی۔ ایسے ہی جب پربھا کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ چاروں بہن بھائی بلراج جی کے بہت قریب آ گئے تھے۔ وہ ان سب کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "انھیں تو ساری دنیا سے پیار ہے۔"

کہنے لگیں "آپ کو معلوم نہیں وہ آپ کی کتنی تعریف کرتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں، آپ اچھے ادیب ہیں کم عمر ہیں، دیکھنے میں اچھے ہیں، کوئی امریکی لڑکی آپ کو پھنسا لے گی، کیا یہ سچ ہے؟"

میرے پاس ایسے معصوم سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے ایروس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک "اجنبی عورت کا خط" دکھائی جا رہی تھی۔ جون ——— ایک بڑی اچھی اداکارہ تھیں۔ میں خوش تھا کہ ہمیں یہ فلم دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہم سینما کے ریسٹوران میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتے رہے۔

[illegible] ابھی تک کوئی نام و نشان نہیں تھا
[illegible] بلراج جی کی جنیت پر شک ہو رہا تھا
امریکہ میں کوئی لڑکی مجھے پھنسا لے گی ـــ میں دل ہی دل میں ان کے
اس خیال پر ہنس رہا تھا۔

جون کے پہلے ہفتے میں میرا جہاز بوسٹن کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میرے
اندرہ والے رشتہ دار، میرے والدین، میری بہنیں اور کچھ اور لوگ مجھے الوداع
کہنے آئے۔ میری نظریں بلراج جی کو ڈھونڈتی رہیں ـــ وہ نہیں آئے۔

جہاز کراچی، عدن، پورٹ سعید اور بارسلونا (اسپین) میں کچھ روز رکتا
ہوا تقریباً ایک مہینے کے بعد بوسٹن پہنچا۔ جہاز پر کئی دلچسپ لوگوں سے ملاقات
ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب PASSENGER BOAT میں جگہ ملنا بہت مشکل تھا۔ مہینوں
انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ کارگو جہاز تھا ..... جس میں تقریباً بیس لوگ مسافر تھے
بارسلونا میں تین روز رہنے پر وہاں لکھنے کے لیے کافی مواد مل گیا تھا۔

بوسٹن سے ریل گاڑی سے نیویارک کا سفر تھا۔

نیویارک پہنچتے ہی میں کام پر لگ گیا۔ ہندستان اور وہاں کے لوگ
جیسے اب کسی اور دنیا میں چلے گئے تھے۔ یہ دنیا ہی کوئی اور تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں
SKYSCRAPERS اور رنگ برنگی روشنیوں NEON LIGHT کی دنیا تھی۔ ایک ہفتہ
نیویارک کے دفتر میں کام کرنے کے بعد میں امریکہ کے مشرقی ساحل EAST
COAST کی ریاستوں کے دورے پر روانہ ہوا۔ یہ سفر مجھے جنوبی یو ایس اے
کی ریاست ٹیکساس تک لے گیا۔

اس امریکی طرز زندگی میں کافی تضاد اور امتیاز تھا۔ ایک طرف نئی زندگی
کی چکاچوند اور دوسری طرف رجعت پسندانہ عناصر کا غلبہ ـــ ایک طرف
بڑے بڑے شہر [illegible] طرف

"کالے لوگوں" کی غربت اور بے بسی۔

اب کوریا کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ امریکہ میں ایسے بھی لوگ تھے جو جاپان کی طرح کوریا پر بھی ایٹم بم گرانے کے حق میں تھے تاکہ اس لڑائی کو جلد سے جلد ختم کر دیا جائے۔ یہ وہ لوگ تھے جو میک رتھی ازم ——— کی پوری حمایت کر رہے تھے۔ یہ لوگ کتاب گھروں اور یونی ورسٹیوں میں ترقی پسند کتابیں پھاڑ کر پھینک رہے تھے یا انھیں جلا رہے تھے

"امریکنوں" کا بے کا جنوبی ریاستوں سے اکثر بلند ہوتا تھا۔ ان امریکیوں میں "کالے لوگوں" کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ جی تو رہے تھے جس TEXAS کی ریاست میں جگہ جگہ صرف سفید لوگوں کے لیے" کے نوٹس دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ میرا امریکی سرگرمیوں کے قانون کی آڑ لے کر ہر چھوٹے بڑے شخص کو عدالتوں میں حاضری دینا پڑ رہی تھی۔ ہاورڈ فاسٹ جیسے عظیم ترقی پسند مصنف کو سولی پر چڑھانے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ ہالی وڈ کے مشہور نغمہ نواز پال رابسن اور دنیا کو اپنی مزاحیہ اداکاری سے ہنسانے والے اداکار چارلی چپلن کو امریکہ چھوڑنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔

ایسے ماحول میں چاروں طرف گھٹن اور تاریکی کے احساس کے باوجود کبھی کبھی اس روشنی کی ہلکی سی چمک بھی نظر آ جاتی تھی جو یورپ کے فلمی اور دوسرے فن کار اپنی تخلیقات میں نمایاں کر رہے تھے۔ ان میں اٹلی کے فلم کار ڈی سیکا سب سے آگے آگے تھے۔ ان کی فلمیں "سائیکل چور" BICYCLE THIEF "جرمنی زیرو ایک" GERMANY — ZERO YEAR جنگ کے بعد زندگی کی تباہی کے ساتھ ساتھ ایک نئے مستقبل کی امید بھی دلا رہی تھیں۔ نیویارک کے سینما گھروں کے باہر لمبے لمبے کیو دیکھ کر یہ جیسے ڈھارس بندھتی تھی کہ ترقی پسند تحریک ابھی زندہ ہے اور اس میں نئے جلنے کی اہلیت بھی ہے۔

A letter from an unknown Woman

اور پھر ایک سوشل جلسے میں مجھے دو مشہور امریکی مصنفوں سے ملنے کا موقع ملا
یک تو تھیں محترمہ پرل بک PEARL BUCK جیسوں نے معروف زندگی کا بیشتر حصہ
ین میں گزارا تھا بلکہ چین کے بارے میں انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ان
ں سب سے زیادہ "نامور شاید" "اچھی زمین" GOOD EARTH ہے حالانکہ اس وقت
ین میں سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ ماؤزے تنگ اب ایک نئی جدوجہد کا
رچم لہرا رہے تھے۔ لیکن فاشزم کے خلاف اور خاص طور سے جاپان کی سامراجیت
ے خلاف پچھلی بڑی جنگ میں تیک کائی شیک نے جمہوریت کو برقرار رکھنے میں بڑی
ہمت سے کام لیا تھا اور تو ایکی لحاظ سے یہ ایک ترقی پسند قدم تھا۔

دوسرے ادیب جن سے میرا بہت مختصر سا تعارف ہوا وہ جان اشٹین بیک
تھے جن کی کتاب GRAPES OF WRATH کی دھوم دنیا کے ہر ترقی پسند
ذہن حصے تک پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح امریکہ کے
رجعت پسندانہ اقدام کا شکار تھے۔

ہندستان سے روانہ ہونے سے پہلے بمبئی کے معیاری جریدے "افکار" میں
ایک افسانہ "فرار" چھپا تھا جسے بالکھوی نے اس کی تعریف کی تھی اور مجھے اور افسانے
لکھنے کو کہا تھا۔ میں نے انھیں امریکہ سے ایک خط لکھا تھا۔ ایک طرح کا ادبی خط۔
ان امریکی حالات کے بارے میں ـــــ یہ خط انھوں نے شائع کیا اور مجھے
"افکار" کا وہ پرچہ امریکہ بھیجا۔

میں نے بلراج جی کو بھی کچھ ایسا ہی ایک خط لکھا تھا لیکن انھوں نے جواب
نہیں دیا۔

یہ تو امریکہ میں دو سال رہنے کا پروگرام تھا لیکن سال بھر کے بعد ہی مجھے
ہندستان واپس لوٹنا پڑا۔ ایک تو ہندستان میں مجھے اپنے کاروبار کی کچھ جانچ
پڑتال کرنا تھی۔ دوسرے میرے سال بھر کے پرمٹ کو امریکی حکومت نے کچھ
مدت بڑھانے سے انکار کر دیا۔

فیصلہ ہوا کہ کچھ عرصہ ہندستان رہ کر پھر امریکہ واپس آنے کی کوشش کی جائے۔

فروری ۱۹۴۹ء کے آخر میں میرا جہاز بمبئی پہنچا۔
اس عرصے میں میرے والدین کشمیر چلے گئے تھے۔ سرینگر کے دوستوں کی خط کتابت سے پتہ چلا کہ چتر جن چوہڑیا اپنے بھائی رامانند ساگر کے فلمی کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور بمبئی کے ایک علاقے ماٹنگا MATUNGA میں ساگر صاحب نے ایک بہت بڑا فلیٹ خرید لیا ہے اور وہ سب وہیں رہ رہے ہیں۔
بمبئی پہنچتے ہی میں بلراج جی اور ان دوسرے لوگوں سے ملنے کے لیے بیتاب تھا۔ دو تین ہفتے میں ہی مجھے والدین کے پاس کشمیر جانا تھا۔ اس لیے بمبئی میں میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔
باندرہ میں کچھ روز آرام کرنے کے بعد ایک اتوار کی دوپہر کو میں جوہو پہنچ ہی گیا۔ میں نے فون پر وقت مقرر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے بھانجے نے بتایا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ حسب معمول وہ اتوار کو ضرور گھر پر ہی ہوتے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ ابھی دوپہر کا "شرام" کر رہے تھے۔ نوکر نے باہر برآمدے میں بیٹھنے کے لیے کہا اور ساتھ میں چائے بھی آ گئی۔ لگتا ہے انھیں میرے آنے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آ گئے۔
"کمال ہے بھئی، تم آ گئے اور آنے کی خبر تک نہیں دی" ان کی اس شکایت میں خلوص بھی تھا اور محبت بھی۔ گلے سے لگا کر ملے۔ سمندر میں نہانے کے کاسٹیوم میں ہی تھے۔ نوکر کو اندر سے قمیض لانے کے لیے کہا۔ پتلون کی شاید انھیں اس دوپہر کو ضرورت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔
——— "آج سمندر سے نہانے کے بعد اتنی سستی غالب ہو گئی تو کھانا کھانے میں وہیں ڈائننگ روم میں ہی کوچ پر لیٹ گیا۔ وہ بولے "بھئی معذرت چاہتا ہوں کہ تمہارے خط کا جواب نہیں دیا ——— تو تمہیں وہاں زیادہ

دن رہنے کی اجازت نہیں ملی؟"

پھر انھوں نے امریکہ کے سماجی اور سیاسی حالت کے بارے میں سوالات پوچھنا شروع کر دیے۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ خود کہہ رہے تھے:

"تمہیں امریکی سرکار کی وہ سب خبریں مل رہی تھیں، خاص طور پر غیر امریکی سرگرمیاں" یعنی UN-AMERICAN ACTIVITIES کی آڑ لے کر ہر طرح کے فن کار کو پریشان کیا جا رہا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس روس نے پچھلی جنگ عظیم میں لاکھوں انسانوں کی قربانی دے کر جمہوریت، امن اور زندگی کی ترقی پسند قدروں کو برقرار رکھنے کی تنہا کوشش کی ہے۔ اب اسی روس کا ہٹلر کے جرمنی سے مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ صدر بننے پر روزویلٹ نے جس NEW DEAL کا امریکی عوام سے وعدہ کیا تھا موجودہ حکومت اس کی دھجیاں اڑا رہی ہے۔"

ان کی یہ باتیں سن کر مجھے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ یہ انسان نہ صرف ادب اور آرٹ کی نئی اور ترقی پسند قدروں کا پرستار ہے بلکہ اس کی رگوں میں ساری انسانیت سے دوستی کا خون بھی دوڑ رہا ہے۔

گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ کہنے لگے "دونوں بچے اب شملہ (سا در ہیں) ماں جی بھی چلی گئیں۔ اوشی اور پربھا دہلی میں ہیں، اوشی باندرے میں ہی رہ رہی ہے ان کے ایک بچی بھی ہوئی ہے۔ بھیشم اب امرتسر کے ایک کالج میں پڑھا رہے ہیں۔"

میں نے انھیں بتایا کہ "میں کشمیر جاتے ہوئے امرتسر ایک دو دن رکوں گا۔" وہ خوش ہو کر بولے "ارے یہ تو بڑی اچھی بات ہے، اُن سے ضرور ملنا، بس کہنا سب خیریت ہے، انھیں میری فکر ہے کہ میری زندگی اب بالکل اکیلی ہو گئی ہے۔"

اس اکیلے پن کے باوجود ان کے چہرے پر کافی رونق تھی، جسم پہلے سے کچھ بھر گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ "خواجہ احمد عباس اور دوسرے فلمی دوستوں نے فلموں میں کام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ انھوں نے رامانند ساگر کی فلم "بازو بند" کا بھی ذکر کیا۔ ان کے چھوٹے بھائی چترنجن سے وہ اسٹوڈیو میں ملے تھے۔"

میں نے کہا "کشمیر جانے سے پہلے میں چترنجن سے خود ملنا چاہتا ہوں، لیکن کچھ اتا پتہ نہیں ہے۔" انھوں نے اسٹوڈیو فون کرنے کا مشورہ دیا۔

اس روز میں وہاں زیادہ نہیں رُکا۔

دوسرے روز میں فورٹ کے دفتر سے کام ختم کرنے انڈیا کافی ہاؤس گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ چترنجن وہاں اکثر جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ کچھ دیر ہوگئی وہ یہاں سے پریسین ڈیری کے لیے روانہ ہوئے تھے وہاں کسی دوست سے ملنے کا پروگرام تھا ـــــ میں کافی ہاؤس نہیں رکا اور سیدھا چرچ گیٹ کی طرف بڑھ گیا خوش قسمتی سے چترنجن ایک صاحب کے ساتھ پریسین ڈیری میں چائے نوش فرما رہے تھے۔ جب انہوں نے مجھ سے فرصت ملی تو اپنے دوست سے تعارف کراتے ہوئے بولے "یہ مدن موہن ہیں، فلموں میں میوزک ڈائریکٹ کرتے ہیں۔ ان کی موسیقی کی جادو ہے اور آنے والے دنوں میں سنگیت کی دنیا پر چھا جائیں گے۔"

پھر میرا تعارف کرایا "بہت قریبی دوست ہیں، بڑے اچھے افسانے لکھتے ہیں، ابھی یورپ اور امریکہ کا دورہ کرکے ہندستان واپس لوٹے ہیں۔"

مدن موہن کو اسٹوڈیو جانا تھا، وہ کچھ دیر بعد چلے گئے۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ ایک صاحب نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ارے یار، امریکہ سے کب واپس آئے؟"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ پولیس کی وردی میں ملبوس، بھوشن پنڈت کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"تو جناب آپ پھر ایکٹر بن ہی گئے۔" میں نے انھیں قریب کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا "تو آپ سیدھے اسٹوڈیو سے آرہے ہیں، کسی پولیس آفیسر کا پارٹ کر رہے ہیں "راجکمار" صاحب؟"

بھوشن پنڈت نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "فلموں میں تو ابھی نہیں لیکن زندگی

کے اسٹیج پر حالات نے ایک پولیس انسپکٹر کا پارٹ ادا کرنے کو کہا ہے، دیکھیے یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے۔"

وہ چائے کے لیے نہیں رکے، ان کی جیپ کیفے کے قریب کھڑی تھی۔ ایک سپاہی نے اندر آکر کہا "جناب، آپ کو واپس جانا ہے، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

وہ جلدی میں رخصت ہوتے ہوئے بولے "کنول! تم نے ابھی تک اپنے دوست بلراج ساہنی سے نہیں ملایا۔"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ باہر جیپ میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔

امرتسر میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی مجھے ایک ہوٹل میں کمرہ مل گیا دوسرے روز صبح ہوائی جہاز سے سرینگر روانہ ہونا تھا۔ اس لیے وہ ساری دوپہر اور شام کا وقت ملنے جلنے کے لیے کافی تھا۔ ایک اور صاحب سے ملنا تھا، وہ نہیں ملے۔ دوپہر کو بلراج جی کے دیئے ہوئے پتے پر بھیشم جی سے ملنے گیا۔ ایک خاتون نے دروازہ کھول کر بتایا کہ وہ ابھی کالج سے نہیں لوٹے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ان کی عارضی رہائش ہے۔ شیلا جی ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ میں نے اپنے ہوٹل کا پتہ اور فون نمبر اس خاتون کو دیا اور گذارش کی کہ بھیشم جی کو میرا یہ پیغام ضرور پہنچا دیں۔

شام کو ۷ بجے کے وقت بھیشم جی کا فون آیا اور وہ رات کے کھانے پر میرے ہوٹل پر آنے کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ شام بڑی دلچسپ تھی۔

ڈائننگ روم کی بجائے میں نے اپنے کمرے میں ہی کھانا منگوا لیا تھا چھوٹا سا کمرہ تھا اور بجلی کے بلب کی مدھم روشنی میں کھانے کی میز پر وہسکی کے ایک دور کے درمیان میں نے آج پہلی بار بھیشم جی کو قریب سے دیکھا تھا وہ مجھے سرینگر میں بلراج ساہنی کے جلسے میں ملے تھے پھر اپٹا کے اسٹیج پر

احمد آباد کی سالانہ نمائش میں بلراج جی کے یہاں جو ہوئیں ـــــ لیکن آج تک مجھے اس بات کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا جیسے روحانی طور پر یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں۔ ویسے چہرے کے نقش و نگار میں بھی بے حد مناسبت تھی۔ ہنسنے اور بولنے کے طریقے بھی ملتے جلتے تھے اور زندگی کی جن قدروں میں ان دونوں کا اعتقاد تھا۔ ان کی باتیں سن کر ایسا لگتا تھا جیسے بلراج جی بول رہے ہیں ـــــ اور پھر ـــــ ہوا میں اُڑتا ہوا قہقہہ۔
انھیں بلراج جی کی طرف سے فکر تھی کہ آج کل وہ بہت اکیلے ہیں۔

۱۹۴۹ء یہ سارا سال میں نے کشمیر میں گزارا۔
جس انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ہم نے بلراج جی کی صدارت میں ڈالی تھی۔ اب وہ بچپنے کی منزل سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ اکثر ادیب اور شاعر ریڈیو کشمیر کے قایم ہونے پر اس میں شامل ہو گئے تھے۔ پریم ناتھ پردیسی اب ریڈیو سے باقاعدگی سے ڈرامے لکھ رہے تھے۔ دینا ناتھ نادم جو پہلے قدرے گمنامی میں ادھر ادھر اپنی شاعری پڑھا کرتے تھے اب انجمن ترقی پسند مصنفین سرگرم رکن تھے۔ مہجور کاشمیری کی طرح اب ان کی نظمیں ساری وادی میں گونج رہی تھیں۔ افسانہ نگاروں میں سوم ناتھ زتشی اور علی محمد لون کا جنم ہو رہا تھا۔
پران کشور جنھوں نے میرے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تھی اب شیربٹ اور مہندر ناتھ کول کے ساتھ ان کی آواز بھی "ریڈیائی لہروں" پر رقص کرتی تھی۔
میں نے اسپین کے بارے میں اپنا پہلا رپورتاژ ـــــ انجمن میں پڑھ کر سنایا اور اسے دہلی کے مشہور رسالے "شاہراہ" کو بھیجا۔ پرکاش پنڈت اس کے مدیر تھے۔ یہ شائع کرتے ہوئے انھوں نے کچھ اور لکھنے کے لیے کہا۔
اس گہما گہمی کے باوجود دل قدرے پریشان تھا۔ بلراج جی کی کوئی خاص

یں نہیں آرہی تھیں۔ رامانند ساگر کی "بازو بند" فلم چلی نہیں۔ اب وہ راج
ور کی فلم "برسات" کی کامیابی کے بعد ایک اور فلم "مہمان" بنا رہے تھے
ن اس میں انھوں نے سجن کو پارٹ دیا تھا۔

۱۹۵۰ء کے شروع ایک روز کافی ہاؤس میں ان کی چھوٹی بھانجی
ں گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ اپریل میں میں بمبئی جا رہا ہوں، وہاں سے پھر
ریکہ جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلراج جی نے دوبارہ شادی
رلی ہے۔ اس شادی سے گھرانے میں کافی شور برپا ہوا ہے۔ ان کی موجودہ
بوی سنتوش ان کے والد صاحب کی بہن کی دختر تھیں۔

اپنے گھرانے کی نظروں میں کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کرنا ان کا پہلا
ناہ تھا۔

یہ شاید ان کا دوسرا گناہ تھا۔

خط لکھنے کے لیے وقت کم تھا کیونکہ اب میں بمبئی جانے کے لیے تیار تھا
میرے روانہ ہونے سے پہلے ایک اور خبر ملی کہ ہندوستان کے اکثر حصوں
یں ترقی پسند تحریکوں پر جو عتاب نازل ہوا تھا۔ اس سے کمیونسٹ پارٹی اور
لوامی تھیٹر بھی نہ بچ سکے۔

بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پر سرکار کے دھاوے کے بعد
لراج ساہنی بھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔

اب وہ جیل میں تھے۔

USTAD ED ADOROBLE (نازنین تم بہت حسین ہو)

دیو آنند کی چھوٹی بہن بونی (مسز لتا سوین) جو لندن سے باہر ویسٹن ان سٹیز
رہتی ہیں، کا ابھی ابھی فون آیا ہے کہ بلراج ساہنی کا دیہانت ہو گیا ہے اور کیا مجھے
اس بارے میں کوئی خبر ملی ہے.....؟

کچھ روز ہوئے چنتو چوپڑہ (رامانند ساگر کے چھوٹے بھائی) کا بمبئی سے خط آیا تھا کہ بلراج ساہنی سے ملاقات ہوئی "تمہارا کافی ذکر رہا" وہ اب بھی شکایت کر رہے تھے کہ تم نے لکھنا کیوں بند کر دیا ہے۔ خدارا پھر سے لکھنا شروع کر دو۔

بمبئی سے آنے والے ہر دوست کے ذریعے جو انھیں بھی جانتا تھا ان کا یہ گلہ ہمیشہ مجھ تک پہنچ جاتا تھا۔ اتنے برسوں سے ایک دوسرے کو اتنے قریب سے جانتے ہوئے بھی یہ دوستی کسی خط و کتابت کی محتاج نہیں تھی۔

بوبی سے فون پر بات کرنے کے باوجود دل جیسے گواہی دے رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں، اس دنیا میں ہیں، بمبئی میں ہیں، جوہو میں ہیں، اپنے گھر کے شاید کسی کمرے میں پوشیدہ ہیں!!!

ان کی دوستی میں ہمالیہ کی سی بلندی اور عظمت تھی۔ ان کے خلوص اور محبت کی کوئی گنی چنی حد بندیاں نہیں تھیں۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں وہ زندگی کی جس لگن اور توانائی کا ذکر کر رہے تھے اس کے پیش نظر یقین نہیں آ رہا تھا کہ پنجاب کا یہ خوبصورت پھول اتنی جلدی مرجھا جائے گا۔

ان ہی دنوں بمبئی سے بی ڈی بھارگا کا خط ملا۔ وہ بلراج ساہنی کی زندگی کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں انڈین ہائی کمیشن اور بی بی سی سے کچھ معلومات کی ضرورت ہے اور پوچھا ہے کہ اس بارے میں کیا میں ان کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟

ساؤتھ ہال میں ـــــ جو اس وقت نہ صرف لندن بلکہ سارے ولایت میں دکھائی جانے والی ہندستانی فلموں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ بلراج ساہنی کی تازہ ترین فلم "ہنستے زخم" جسے جیتن آنند نے ڈائرکٹ کیا ہے، دکھائی جا رہی ہے۔ سینما کے باہر پوسٹروں میں اور ہر طرح کی پبلسٹی میں اس بات کو اہمیت دی جا رہی ہے کہ ہندستان کے اس عظیم فن کار کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔

اور تماش بین دور دور سے اپنے محبوب فن کار کی عقیدت کے لیے جمع

آرہے ہیں۔

جس لندن کو بلراج ساہنی نے بہت برس پہلے دیکھا تھا۔ وہ ان کے لیے بی بی سی کا لندن تھا۔ پچھلی بڑی لڑائی کا زمانہ تھا، پچھلی بڑی لڑائی کے آخری سالوں کا زمانہ جب لندن میں دن رات بمباری ہوتی تھی۔ وہ بی بی سی کے ہندستانی سیکشن سے براڈ کاسٹ کر رہے تھے۔ سیاسی اور سماجی لحاظ سے یہ ایک ڈراغیر یقینی اور بڑی شدید ہلچل کا زمانہ تھا۔ بی بی سی کی محدود زندگی کے باوجود انھیں لندن سے پیار ہو گیا تھا۔ اس لندن کے بارے میں وہ کئی لطیفے اور کہانیاں سناتے تھے۔

اگر آج وہ لندن آتے اور ساؤتھ ہال کے بازوں میں، دوکانوں میں اور گھروں میں، انھیں پنجاب کی جو آوازیں سننے کو ملتیں، اُن سے متاثر ہو کر بے یقیں ہے ان کا سر عقیدت سے جھک جاتا۔ اپنے پنجاب سے ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود ان لوگوں نے اپنا "پنجابی پن" نہیں چھوڑا تھا ـــــ پنجاب بلراج ساہنی کی روح تھا۔ وہ پنجاب کی زبان اور پنجاب کی ہواؤں کو سلام کرتے تھے۔ پنجاب کے دریاؤں کے ساتھ ساتھ جیسے بلراج ساہنی کی روح بہتی تھی۔

بلراج ساہنی کی زندگی کا فلسفہ اگرچہ کسی حد بندیوں کا قائل نہیں تھا لیکن ان کے ادبی تخیل کی اڑان سرزمین پنجاب سے باہر آنے کے لیے آمادہ نہیں تھی ان کی پنجاب سے اس عقیدت میں کسی تنگ نظری کا کوئی دخل تھا۔ وہ اس بات میں پورا یقین رکھتے تھے کہ ہندستان کے ہر Region کی زبان میں اتنا دم ہے کہ وہ ادبی INTELECTUAL لحاظ سے دنیا کی کسی بھی زبان سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اکثر بنگالی زبان اور آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور کی ساری دنیا میں ادبی عظمت کی مثال دیا کرتے تھے۔

اردو ادب پر بحث کرتے ہوئے وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے۔

"پنجابی میں لکھو!"

"پنجابی لکھ نہیں سکتا؟"

"پنجابی بول تو لیتے ہو؟..... قہقہہ۔

"لکھنے کی زبان اور بولنے کی زبان میں ایک Intellectual امتیاز ہے"

میں ان سے کہتا "غلط، بالکل غلط"

وہ قدرے غصے سے کہتے "تم پنجابی میں سوچتے ہو، پنجابی خیالات تمہاری ہر سانس میں رقصاں ہیں۔ پنجابی زبان تمہاری روح میں رچی ہوئی ہے، تم اس کا اظہار فارسی رسم الخط میں بھی کر سکتے ہو۔ میں بالکل تنگ نظر نہیں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم دونوں پنجاب کی پیداوار ہیں۔ تمہارا آرٹ اور فن ایک ایسا پودا ہے جو پنجابی زبان میں ہی پھل پھول سکتا ہے"

"لیکن اردو میں لکھنے میں کیا برائی ہے؟"

پنجاب کا حسن، پنجاب کی خوشبو، پنجاب کی زمین اور آسمان، پنجاب کی خوشیاں اور درد ـــــ کیا اردو زبان اتنی کمزور ہے کہ وہ خوبی سے ان تاثرات کا اظہار نہیں کر سکتی؟"

اگر کوئی اجنبی ہوتی تو ان کی یہ باتیں سن کر شاید سوچتا کہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن پنجابی زبان سے ان کی ان Convictions سے میں بخوبی واقف تھا۔ کسی بھی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے میں نے ان کے ماتھے پر کبھی تیوری چڑھتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔ ان کی تقریروں میں ایک بڑی خوبصورت سادگی تھی۔ یہ بحث گھر کے اندر ہو یا باہر، اسٹیج پر ریہرسل کرتے ہوئے، یا ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے ..... مسکراتے رہتے تھے۔

ایک روز ادبی بحث میں انھوں نے کاغذ کا ایک پرچہ جیب سے نکالا اور بولے "دیکھو آج بلونت گارگی کا یہ خط آیا ہے، سنو کیا لکھا ہے:

تیرا خط پڑھ کے ـــــ جتا مزا آگیا ہے۔

"تم بتاؤ اس کا ترجمہ کر سکتے ہو؟ اس جملے میں جو مٹھاس ہے، جو نشہ ہے اس کا

اظہار گاری صرف اپنی زبان میں ہی کر سکتا ہے۔"

خاموشی کے سوا میرا پاس اور کوئی جواب نہیں تھا۔

اکثر لوگ انھیں ایک ادیب سے زیادہ ایک ایکٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ہندستانی فلموں کا یہ ہیرو پردۂ سیمیں کے باہر اپنے آپ کو ایک معمولی انسان سمجھتا تھا۔ قیمتی اور بڑی موٹر گاڑیوں میں سوار ہونے کے بجائے ریل گاڑی یا بکسی سے سفر کرنا پسند کرتا تھا۔

"ہم لوگ" جیسی فلم کی عظیم کامیابی کے باوجود ان کا دماغ اور ان کی نظریں اس زمین کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں مزدور اور کسان کی محنت کی کوئی قدر نہیں تھی۔ "ہم لوگ" کے ہیرو کی طرح ان کو "یاروں کی یاری" سے مطلب تھا اور ان کے لیے جیسے سارا ہندستان ان کا "یار" تھا۔

اور بمبئی کی گلیوں میں موٹر سائیکل پر سوار جیسے یہ "عوامی ایکٹر" ——— اس منزل کی تلاش میں تھا جہاں کوئی بھی انسان اتنا بے بس نہ ہو کہ اسے دو وقت کا پورا کھانا بھی میسر نہ ہو سکے۔

ادب اور آرٹ چاہے وہ موسیقی ہو یا فوٹوگرافی، سنگتراشی یا فلمیں انھیں وہ ایک ایسا Vehicle سمجھتے تھے جس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنے سماج اور زمانے کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ ان کی مدد سے اسے بدلنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں۔

بمبئی کے بے چند کالج میں ایک بار تقریر کرتے کرتے انھوں نے کہا تھا:

"اسٹیج کا آرٹ جس میں ایک فن کار حصہ لیتا ہے وہ صرف مکالمے کہنے یا اداکاری کرنے یا ہدایات دینے تک ہی محدود نہیں ہوتا ہے بلکہ جو شخص اسٹیج کا پردہ اٹھاتا ہے یا گراتا ہے وہ بھی ایک فن کار ہی ہے غلط وقت پر پردہ اٹھانے یا گرانے سے ڈرامے کا سارا مزہ خراب ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی بھی کام چھوٹا یا بڑا نہیں۔ اس سماج میں ہر انسان کی اپنی اپنی ضروری جگہ ہے۔"

ایسے حالات میں ہندستانی فلم انڈسٹری میں ان کی حیثیت ایک MAN
کی سی تھی وہ کہتے تھے کہ ہمارے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ فلم کے بڑے
شاک ہیں، ہمارے یہاں بہت اسٹوڈیو ہیں، اچھے فوٹو گرافروں، ہدایت کار
دوسرے فلم بنانے والے فن کاروں کی کوئی کمی نہیں لیکن کئی برسوں سے جیسے
یہ انڈسٹری آگے بڑھنے کے لیے آمادہ نہیں۔ آج سے کئی برس پہلے ہم نے بھی اچھی
اور کامیاب فلمیں بنائی تھیں آج کل کی فلموں میں جیسے دم نہیں کہاں گئے وہ
فلم بنانے والے، آج کل جیسے اس انڈسٹری کا "خدا" باکس آفس
ہے ــــ فلم بنانے کا پہلا اور آخری مقصد جیسے صرف پیسہ کمانا ہے۔

ایک بار میں ان کے ساتھ اسٹوڈیو جا رہا تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی
کہنے لگے "کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایک لنڈرین ہے جسے کئی دنوں سے صاف
نہیں کیا گیا، اندر آکر بڑی گھٹن ہوتی ہے۔

اس کے باوجود انھیں اس بات کا اعتراف تھا کہ مالی مجبوریوں کے پیش نظر
فلموں سے رشتہ توڑنا ان کے لیے اس وقت ممکن نہیں تھا۔

بلراج ساہنی ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ لندن سے تھے بچپن کی تعلیم راول پنڈی
میں ہوئی اور پھر لاہور میں یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل کی۔ صرف نوکری کی تلاش
بلکہ ادب اور آرٹ سے نوجوانی کے زمانے میں جو رومان انھیں ہوتا ہے، وہ انھیں
پہلے شانتی نکیتن لے گیا اور پھر گاندھی جی کے سیوا گرام میں کچھ دیر دم لیا۔ اب وہ
شادی شدہ تھے۔ بی بی سی ریڈیو میں کام ملنے پر جیسے ان کے پاؤں زمین پر
نہیں پڑ رہے تھے لیکن لندن پہنچنے سے پہلے وہ باپ بن چکے تھے۔ لندن
میں جنگ کی وجہ سے غیر متعین زندگی کے پیش نظر ان کی بیوی دمینتی نے بچے
کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔

شانتی نکیتن کے ادبی ماحول اور گاندھی جی کے سیوا گرام میں سماجی قدروں سے
مایوس ہونے کے بعد لندن کی مغربی تہذیب میں جیسے ان کے نوجوانی کا رومانی

مداب ایک ہیئتی حقیقت سے روشناس ہو رہا تھا۔ یہاں انھیں جو مغربی اور
ں طور پر روسی فلمیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان سے ان کے ذہن میں جیسے نئے
ستے پیدا ہو رہے تھے۔

بی بی سی سے براڈ کاسٹ کرنا نہ صرف ان کے لیے ایک نیا اور دلچسپ تجربہ
بلکہ اس تجربے کے ذریعے انھیں اپنی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع
ں ملا۔ ذہنی طور پر یہ جیسے ان کی زندگی کا [illegible] تھا۔ جنگ میں روس
عوام جس بہادری اور قربانی کے ثبوت دے رہے تھے۔ ان کی خبریں سن کر ــــ
ں زندگی کی نئی قدروں اور ایک نئی جدوجہد کا احساس ہو رہا تھا۔

اس وقت بخاری صاحب بی بی سی میں ہندستانی سیکشن کے کرتا دھرتا
ے اور براڈ کاسٹنگ کے سلسلے میں وہ بڑی ہستی مانے جاتے تھے۔ ان کی آواز
ں جب تھا بڑے "دھڑلے" سے بولتے تھے۔ ریڈیو اور ریڈیو کے باہر بھی بلراج
ہنی کے دل میں جیسے ان کے لیے بڑی عقیدت تھی ــــ اور خود بخاری صاحب
رج ساہنی کی "ریڈیائی آواز" کے بڑے مداح تھے۔

اب دمیتی ساہنی بھی ریڈیو سے براڈ کاسٹ کرنے لگیں۔ جہاں بخاری
حب کی آواز میں طوفانوں کی گرج اور بجلی کی کڑک تھی، وہاں بلراج ساہنی کی
ز میں پہاڑی نالوں کی روانی اور جھرنوں کی مدھرتا تھی۔ بی بی سی کے اس سیکشن میں
"دونوں آوازیں" بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ لیکن ان آوازوں کے خوب صورت
تلاف کے باوجود کبھی کبھی ان دونوں میں جیسے ایک ذاتی کشیدگی سی پیدا ہو جاتی تھی۔

بلراج ساہنی کی زبان اب تک ہندی تھی۔ اردو بولنے یا براڈ کاسٹ کرنے میں
ہیں کوئی مشکل نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ اردو پر پورا قابو پانا چاہتے تھے
دت اور لکھنے میں بھی ایک طرح سے ان میں احساس کمتری سا پیدا ہو گیا تھا۔ بخاری
صاحب کو بھی اس بات کا علم تھا۔ وہ اکثر بلراج ساہنی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔
ہیں اس کے باوجود اگر بخاری صاحب کہتے کہ "بلراج یار! ذرا کیٹن سے میرے لیے چائے

کا کپ لے آنا یا بلراج بار، لپک کر ـــــ سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آنا۔ تو بخاری صاحب کے لیے شدید احترام کے باوجود وہ کہتے "کبھی کبھی تو ایسے بھی چاہتا تھا کہ سگریٹ کا پیکٹ یا چائے کا کپ ان کے سر پر پھینک دوں"۔

بلراج ساہنی نے زندگی کے جس فلسفے کو اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر ذاتی قربانی کے ساتھ ساتھ حلیمی بھی ان کے کردار کا ایک اہم جز تھی۔ اردو زبان پر قابو پانے کی انھیں ذاتی لڑائی کے ساتھ ساتھ جیسے وہ ساری دنیا کی فاشزم کے خلاف جنگ میں بھی وہ اپنی آواز کو پوری طرح شامل کرنا چاہتے تھے ـــــ اور اس سلسلے میں انھیں بخاری صاحب کو اپنا "گورو" ماننے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

جو ہو آرٹ تھیٹر کی ریہرسلوں میں اپنے بی بی سی کے دنوں کی شروع شروع کی مشکلوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ہم اداکاروں کو بار بار اس بات کا احساس دلاتے کہ زندگی میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اور ایک فن کار کے لیے اس قربانی کے دوسرے نام بھی ہیں ـــــ گیان! تپسیا!! ریاض!!!

"آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ ریس کے میدان میں "دوڑنے والا" دوڑ سے پہلے کس طرح اوپر نیچے کودتا ہے یا بار بار اپنی ٹانگوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ اسی طرح اسٹیج پر جانے سے پہلے ہر اداکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مکالموں کی ادائیگی میں اپنی آواز کے ہر طرح کے اُتار چڑھاؤ سے پوری طرح روشناس ہو"۔

جو ہو آرٹ تھیٹر کی دوسری پیشکش "شاہ بادشاہ" (گوگول کے مشہور کھیل "انسپکٹر جنرل") جس کا ترجمہ سنتوش بی نے کیا تھا اور بلراج ساہنی کے ساتھ وہ اس کی ہدایت کار بھی تھیں، کا ایک قصہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔

میں اس کھیل میں میئر (Mayor) کا پارٹ ادا کر رہا تھا اور سنتوش جی ڈرامے میں میری بیوی تھیں۔ اس کھیل کی ریہرسل بڑے زوروں شوروں سے ہو رہی تھی، اور ایک ہفتے میں اس کا پہلا شو تھا۔

ایک منظر کے دوران میں سنتوش جی بار بار غلط لائن بول رہی تھیں اور بلراج ساہنی بار بار کہتے "توشی (سنتوش جی) اسے یوں بولو ـــــ اسے پھر سے پڑھو ـــــ اسے یوں پھر سے بولو"

لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سنتوش جی نے پھر اپنا پارٹ شروع کیا لیکن اس خاص لائن پر پہنچ کر وہ پھر رک جاتیں۔ تو بلراج ساہنی پھر کہتے ـــــ "نہیں، نہیں، نہیں"

ڈائریکٹر کی حیثیت سے بلراج ساہنی بے حد صبر سے کام لے رہے تھے۔ بڑی شفقت اور پیار کے ساتھ غلطی کرنے پر وہ اداکار کو سمجھاتے کہ کچھ دیر آرام کرو ـــــ آنکھیں بند کر کے سوچو، اور پھر اپنا پارٹ بولو۔

لیکن سنتوش جی کو ڈائریکٹ کرتے ہوئے وہ شاید بھولے نہیں تھے کہ وہ ڈائریکٹر کے ساتھ ساتھ ان کے شوہر بھی ہیں۔

اس ڈرامے کے مردانہ کاسٹوم Costume اس وقت کے روسی زمانے کے تھے لیکن خواتین کو ہم نے ساڑھیاں پہنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت سنتوش جی پتلون Trousar پہنے ہوئے تھیں اور ہم لوگوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بلراج ساہنی کو سنتوش جی کو اس لباس میں دیکھ کر جیسے چڑھ سی ہو رہی تھی۔

آخری بار ریہرسل شروع ہونے پر بھی بات نہیں بنی تو بلراج ساہنی جیسے گرج پڑے "تم اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتی ہو، تمہارا پارٹ ایک ہندستانی عورت کی روح کے لیے پکار رہا ہے اور دیکھو تم نے یہ لباس کیا پہن رکھا ہے"

اس جملے کے ختم ہونے سے پہلے ہی سنتوش جی کی آنکھوں میں جو طوفان کب سے تھما بیٹھا تھا وہ اب برس پڑا۔ ان کی ہچکی سی بندھ گئی۔ ڈرامے کا سارا گروپ ان کے پاس جمع ہو گیا، اس ڈر کے خیال سے کہ بلراج ساہنی کے غصے کی بجلی پھر نہ گرج پڑے۔

بلراج ساہنی ہال کے ایک کونے میں کھڑے ہم لوگوں کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کلاس روم میں ماسٹر جی نے انہیں ڈانٹ دیا ہو۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب شرمندگی کا اظہار تھا۔

نصیر حیدر

نصیر حیدر

اُن دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا

یہ تو آپ [illegible] سے یہ سوال [illegible] کہاں سے کیا ہے [illegible]
اور بعد میں [illegible] محاذ کی ان تین معرکہ آرا نظموں سے جو اسے
[illegible] صف [illegible] کر [illegible] کے زمرے میں داخل کر دیتی
[illegible] اور یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں، مجاز کے دوست یا طرفدار
کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض فہم کی حیثیت سے۔ اس کے باوجود میں خود آپ
کے سامنے یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ ان دنوں، کے الف پر پیش میری اپنی
اپج یا بدعت ہے۔ مجاز اس الف کو زیر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ان دنوں۔
بلہا میں نے اس فرق پر ان سے بات کرنا چاہا تو وہ کچھ جز بز ہوئے تھے
کہ بات آئی گئی ہو گئی آج مجاز کو مرے پورے تیس برس ہونے کو ہیں۔ ۱۷ جنوری
۱۹۵۲ء کو ہوا، کیا دوا کے بے صحت پائی تھی۔ مگر بہر حال، مرتے جیتے تو لوگ
رہتے ہی ہیں اور ان میں مجاز کے ایسے لوگ اور مجاز کی ایسی موتیں شامل ہیں۔
اس بارے میں میرا اپنا ایک شعر بھی ہے، ابھی حال کا۔

تڑپے بھی بہت مر بھی گئے درد کے مارے
کچھ بھی نہ ہوا، اور جو ہونا تھا ہوا بھی

ان دنوں اور اُن دنوں کا فرق جس پر اب میں آپ سے بات کرنا چاہتا
ں مجاز کے مرنے پر منحصر نہیں۔ اگر کاش خدا کرتا وہ زندہ بھی رہتے تو اس
لم پر تو بہر حال یہ تیس برس بیت ہی جاتے اور اسے لپک لپک کر پڑھنے
لے شاید تعداد میں اب سے زیادہ ہوتے۔ اصل مسئلہ ان پڑھنے والوں کا
ہے۔ مجاز کا نہیں۔ اُن دنوں کا اشارہ ماضی قریب کی طرف ہوتا ہے، اتنا قریب
ی وحال میں تمیز دشوار ہو جائے یا ماضی حال میں در آئے۔ جن دنوں میں،
س زمانے میں، تاریخ کے جس دور میں یہ نظم اور اس میں مرقوم تجربات و تاثرات
ہا پر وارد ہوئے تھے۔ اُن دنوں، مخاطب بالکل درست تھا۔ مگر بہت عارضی
ر پر۔ ان تیس برسوں میں صرف یہی نہیں ہوا کہ مجاز ہم میں نہیں رہے۔ ہوا یہ کہ
ودہ قیامت کا جنوں، جس کی حکایت خونچکاں سے نظم عبارت ہے، وہ بھی
جاز کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گیا۔ اب وہ چلتے پھرتے آجکل یلا ندوں
ذات ہیں۔ قرنوں پہلے، کسی دوسری دنیا کی چیز ہو کر رہ گیا ہے جن کا تصور میرے
یے آسان ہے مگر آپ کے لیے، یا آپ میں بہتوں کے لیے بہت دشوار ہے
قریباً ناممکن۔ وہ زمانہ واقعی بڑا جنوں پرور تھا۔ بے تحاشہ نئی نئی امیدیں، آرزوئیں،
نئے تصورات ایک طوفان کی طرح امڈ آتے تھے اور وہ ایسا معلوم ہوتا تھا
ل کا سورج ہم پر ایک نئی دنیا میں نکلے گا جہاں نئے سبزہ زار ہوں گے، نئے
ثمر دار شجر، نئے برگ و بار، نئے لیل و نہار، مگر نہ وہ پرستان کا اڑن کھٹولا آیا،
ہم اس میں اڑ کر کہیں پہنچے۔ وہی دنیا ہے وہی اس کی کاہشیں اور آلائشیں۔ جہاں
ہاں کچھ فرق ہمارے ہاتھوں یا ہمارے دیکھتے دیکھتے ہوا ہے اس نے اسے
پہلے سے بدتر ہی بنایا ہے، بہتر نہیں۔ مگر یہ اور بات ہے۔

اس نظم کے آخری شعر میں خود مجاز نے اس شکست جنوں، اس طوفان کے

ٹوٹنے اور ختم جانے کی بشارت دی ہے جسے اس نے خود پہلے ہی ایک ذاتی تجربہ بنا کر اپنے اندر سمو لیا تھا، حل کر لیا تھا۔ ؎

وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

آج اس جذبۂ معصوم کا فقدان اس عہد، اس صدی کے نصف آخر کا جو بھی ہو، تاریخ انسانیت کی آخری صدی ہو، سب سے بڑی، سب سے گمبھیر اور سب سے زیادہ حالکا مسئلہ بن گیا ہے اور یہی مسئلہ آج آپ کا رشتہ مجاز کے ساتھ جوڑتا ہے۔ طوفان تھی، امڈتی ہوئی مستی نے آسمانوں پر لوٹتی ہوئی گھٹائیں چھینٹیں تو معلوم ہوا۔ مطلع صاف، میدان خالی سب اوندھے پڑے ہیں فرش پر خالی پیالے ہیں۔ دھوپ کی تمازت سے کھوپڑیاں بھنچی جاتی ہیں۔ ایک ایسا میس، ایسی رس کا بوس کی طرح ہر طرف مستولی ہے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے مجاز نے اپنے آغاز شاعری میں آل انڈیا ریڈیو کے لیے کہے گئے ایک مطلع فرمائشی مطلع میں یہ شعر کہہ دیا تھا ؎

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آواز شکست ساز ہے

مجاز کی زندگی، اس کی محنت اور اس کی شاعری، اس کے لطیفے سب کے سب اس کی شکست ساز، شکست نغمہ، خود جنون زندگی کی شکست کی فنکار ہیں جیسے بلبلوں کی آخری تھی جس کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے اور یہ حقیقت اپنی پوری تابناکی اور تابکاری کے ساتھ دل پر منکشف ہوتی ہے کہ ؎

ہر چند کہ وہ دن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آ ہی پہنچا ہے یا آیا ہی چاہتا ہے اگر یہ قصہ کسی دوسرے دن پر اٹھا رکھیے۔ میں بھی اس کی زندگی اور اس کی شاعری

کے جھنا کے کی بات کر رہا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ شکست ساز کی آواز
قیامت کا جنوں، دل مرحوم کا ماتم، گود پھیلائے ہوئے بڑھتی ہوئی رسوائیاں،
اور اسی طرح کے بے شمار ٹکڑے ترکیبیں اور تعبیریں جو بیک آہنگ پیہم آگے
بڑھتی ہوئی ناگزیر خرابی، بربادی اور تباہی کی پیشین گوئی کرتی ہیں، مجاز پر کیوں
چھا گئی تھیں۔ اور اس چھا جانے میں اتنا رچاؤ، اتنی دلدوزی، اتنی تاثیر اور اتنی
اپیل کہاں سے آگئی تھی۔ ہم آپ آج بھی اسی آواز شکست ساز، اسی ٹوٹے
ہوئے ستار کی جھنکار پر جھوم جھوم جاتے اور سر دھنتے ہیں اور مجاز کی زندگی میں
تو یہ حال تھا کہ کم از کم شمالی ہندوستان میں کشمیر اور پشاور سے لیکر نیچے بمبئی بھوپال
اور حیدرآباد دکن تک کوئی کونہ کوئی قریہ ایسا نہ تھا کہ اگر مجاز صاحب محض
اتفاقاً اپنے من کی موج میں ریل سے سٹیشن پر اتر جائیں اور پھر گاڑی میں نہ چڑھ
پائیں تو ناممکن تھا کہ وہاں ان کو دور سے دیکھ کر پہچان لینے والے، دس بیس آدمی انھیں
کے اشعار پڑھتے ہوئے انھیں لبیک کہنے اور سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے
ان کے گرد جمع نہ ہو جائیں۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب مجاز پر اور ہم سب
پر قیامت کا جنوں طاری تھا۔ مجاز پر بذاتہ پیچ پیچ کے جنون کے دورے پڑ
پڑ پڑے اور ہر چند یہ دورے بھی بڑی حد تک اس محیط دوراں جنون کا
شاخسانہ تھے جس کی پرچھائیاں مجاز کے دل و دماغ میں مسلسل ایک دوسرے
سے دست و گریباں رہتی تھیں، مگر نظم میں جس قیامت کے جنون کی داستان
بیان ہوئی ہے وہ مجاز صاحب کے رانچی کے تجربات کا قصہ نہیں۔ یہ جنون ایک
مجاز پر موقوف نہ تھا۔ یہ اس زمانے میں پورے ہندستان پر طاری تھا۔ اعتراف
مجاز کا اپنا اعتراف شکست نہیں ہے۔ اس میں مجاز کے ہماری آپ کی شکست
و ناکامی کا رونا رویا ہے جو ہمارے لیے مقسوم ہو چکی تھی اور یہ مجاز نے اپنے

[illegible] POETIC INVENTION سے موسوم کیا تھا۔ نظم کے اس بند کے باقی دو مصرعوں
میں [illegible] کی تخلیص ملتی ہے جو بڑی اہم ہے۔ سلطنتوں سے محبت کا جنون [illegible]
[illegible] سے مقابلہ کا جنون [illegible] زیادہ [illegible] کا ہو تو اس میں [illegible]
سے [illegible] کا جنون [illegible] مگر سلطنتوں سے محبت اور شہریاروں سے مقابلہ میں سب کچھ کھلتا ہے
[illegible] ہے۔ [illegible] آسودہ زندگی کے پورے تصور کی طرف جس کی جامعیت پر
مقابلہ اور اس کی وساطت سے پورے یورپی مغربی تہذیب کے ساتھ ہمارے تاریخی رشتے
[illegible] میں پہلی تھی اور جس کے خلاف آزادی کی لگن کا اسلوب و ملا اس کی روح رواں تھے۔

آزادی کا یہ تصور خالصتہً اور کلیتہً مغربی ہے جسے ہم نے انگریزوں کی وساطت سے مستعار لیا تھا اور ان سے آزادی حاصل کر کے گنوا دیا۔ اب صرف شہریاروں کی آپس کی رقابت رہ گئی ہے۔ مگر آزادی کی لگن میں آزادی کا مغربی تصور ایک مرکزی اور کلیدی نکتہ تھا۔ اس زمانے کے ادب شاعری فلمی گانوں اور مکالموں میں اس تصور زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ اسی سے اس میں وہ ٹیس وہ تڑپ، صبح بہار کا سا وہ تڑکا آج اس کی روح رواں تھا۔ دوستی اور محبت میں اظہار مدعا کی آزادی، آزادی اظہار اور آزادی کے تمام دوسرے مظاہر اور ابواب کا دیباچہ اول ہے۔ جو صرف اپنے ٹھسکے اپنی قدرت کلام اپنے رواتی پس منظر BACKGROUND کے برتے پر اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے اشعار کہتے اور کہتے چلے جانے کا یارا رکھتے تھے، مگر ان کے بعد یہی دونوں آدمی تھے جنہوں نے اس نکتے کو پا لیا تھا کہ اظہار مدعا کی آزادی آزادی اظہار اور سیاسی و سماجی آزادی کا دیباچہ اول ہے۔

عصری ادب کے ناقدین اور عصری رواں تاریخ CONTEMPORARY HISTORY کے مورخین دونوں کے اس باریک مگر بنیادی نکتے سے

اظہار ہوتا ہے جو تنقید اور تاریخ دونوں کی بڑی کوتاہی ہے۔ مجاز کی رنگ پسندی اور شاعر محفل وفا و طرب بزم دلبراں کے رول پر اصرار پر ایک زمانے میں خاصی بھنویں چڑھائی گئی تھیں۔ مگر ہندوستان کی تحریک آزادی جس کے سائے میں ہم سب پروان چڑھے جلال و جمال کا بڑا جان لیوا مرکب تھی اور سیاسی محرکات کے ساتھ اس میں جمالیاتی محرکات برابر بلکہ شاید برابر سے زیادہ شریک تھے۔ فراق صاحب نے یہ پوری بات اپنی مخصوص چابکدستی سے ایک شعر میں کہہ دی تھی ؎

تاریخ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات　　مجبور ایسی عشق کی بے چارگی نہیں

جلال و جمال کا یہی امتزاج تھا جس نے اس تحریک کو اتنا رسا پرور، اس قدر دلدوز بنا دیا تھا۔ حسرت موہانی کے الفاظ میں تہذیب رسم عاشقی اس تحریک کی پوری فضا میں رس بس گئی تھی۔ میں جب ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو ایک خواب سماں ذہن پر چھا جاتا ہے۔ اور اس خواب، اس فضا، اس سماں پر سب سے بڑی اور سب سے دل آویز چھاپ شاعر محفل وفا مجاز کی ہوتی ہے۔

ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک بڑی نتھری ستھری سڑک بادشاہ باغ کے یونیورسٹی ایریا سے نکل کر گومتی کو بارڈنگ برج سے پار کر کے قیصر باغ کے عین بیچ ایچ سال روڈ سے مل جاتی تھی۔ اس تراہے کے ایک جانب چھتر منزل تھی جو کبھی واجد علی شاہ کی آماجگاہ ہوا کرتی تھی۔ سامنے نواب نصیر الدین حیدر اور ان کی بیگم کے مقبرے تھے اور ان کے چاروں طرف قیصر باغ کے محلات اور چمن زار پھیلے ہوئے تھے جن کے حوضوں اور نہروں میں آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے پریاں ناچتی اور تھرکتی نظر آتی تھیں۔ آگے بڑھ کر یہ سڑک حضرت گنج کے نئے وضع کے بازار داخل ہو جاتی تھی اور اس کی دوسری شاخ گومتی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی شاہ نجف

سے نکل کر سکندر باغ تک چلی جاتی تھی۔ دو رویہ ببول، املتاس، مولسری اور شیشم کے قد آور درخت تھے۔ جن کی گھنیری مگر پتلی پتلی شاخوں اور پتیوں سے طرح طرح کی روشنیاں چھنتی تھیں اور سایوں پر چھائیوں کا ایک جال سا بن جاتا تھا جس میں گھر کر فراق کا یہ شعر ذہن میں چمک اٹھتا تھا ؎

ان دھبک ملد سے ہیں کاٹتی ہیں پے بہ پے پاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیں

موسم کے مطابق ببول کے خاردار درختوں میں بھی پھول کھلتے تھے اور ایسی فراوانی سے کہ راہ چلتوں پر پیلی پیلی پنکھڑیوں کی بوچھار سی پڑتی تھی۔ شاید اسی منظر میں استاد ناسخ نے اپنا وہ مشہور و معروف شعر کہا تھا ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

اس جنوں پسند کی ترکیب کا مطلب آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک اس سڑک سے عادتاً بار بار گزر نہ ہو۔ مجاز کا گھر دریا کے اس پار تھا اور وہ ادھر ہی سے آتے جاتے تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ کلکتہ بمبئی کی تو خیر بات الگ ہے مگر شمالی ہند میں نئی تہذیب اور نئی روشنی اسی سڑک سے گزر کر پہنچی۔ سرِشام اور کبھی کبھی صبحدم، یا بیچ دوپہر یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں کیننگ کالج، کیلاش ہوسٹل اور اے ٹی کالج نکل کر اس سڑک پر آتے اور سبک خرام ٹہلتے ہوئے کافی ہاؤس کی طرف چلے جاتے چاروں طرف نقرئی قہقہوں کی کھنک اور بانسری جیسی آوازوں کا رچاؤ بکھر جاتا۔ لکھنؤ یوں تو مرزا شوق سندیلوی اور خود واجد علی شاہ کی مثنویوں کا افسانوی شہر ہے مگر اس آزادی اور بے باکی سے اس قدر برملا اور نئی لطافت کے ساتھ لڑکے لڑکیوں کی ہم خرامی اس کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا۔ قیصر باغ کے چمن در چمن قطعوں اور تختوں

میں دوب کی ملائم نازک گھاس سمانے کتنی داستانیں رکھتے دلوں کے دھڑکتے ہوئے راز اپنے سینے میں چھپائے ہے۔

اور اسی سڑک پر کانگرس اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلوس بھی نکلتے تھے جن میں انقلابی گیت گائے جاتے تھے اور انقلابی نعرے لگائے جاتے تھے۔ آپس کی سرگوشیوں میں آئندہ زندگی کے نقشے بنانے والے جوڑے یک نئی زندگی، ایک نئی آزاد فضا کا بلند آہنگ مطالبہ کرتے تھے یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ اور اسی گٹھ جوڑ میں ایک طرف تحریک آزادی کے معانی پنہاں ہیں تو دوسری طرف مجاز اور ان کے ساتھی شعراء کی شاعری کے راز، اور اعتراف جیسی نظموں کی تعبیریں اور تفسیریں۔

مگر جلال و جمال کی یہ آمیزش جس میں آویزش کے تیور بھی تھے۔ بڑی جان لیوا ثابت ہوئی۔ صرف مجاز کے لیے نہیں بلکہ اس پوری نسل کے لیے جس کی ترجمانی مجاز نے کی ہے۔ اور خود اس تحریک آزادی کے لیے جو اس نسل کے ہاتھوں انجام کار تک پہنچی، یا شاید نہیں پہنچ پائی۔ اعتراف کو صرف مجاز کا اپنا اعتراف شکست سمجھ کر پڑھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نہ قیامت کا جنوں اس کا اپنا تھا نہ اس جنوں کی شکست اس کی شکست تھی، مجاز شکست خوردہ آدمی نہیں تھا۔ اس کی موت ایک سپاہی کی موت تھی، بستر اطلس و کمخواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے والے کی نہیں بستر اطلس و کمخواب کا ذکر اس نے اس نظم میں ضرور کیا ہے مگر یہ صرف شاعری ہے حقیقت نہیں ایسے بستر یقیناً مجاز کو میسر آسکتے تھے اور بارہا اسے پیش کیے گئے۔ اس نے ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور آگے بڑھ گیا اور پھر بڑھتا چلا گیا۔ نہ مجاز کی طرح جینا بلکہ زندگی کرنا ہر شخص کے بس کی بات ہے۔ نہ

جنوری کی ٹھٹھرتی رات میں دیسی شراب خانے کی کچی کھلی ہوئی چھت پر تحفہ لاؤ میر
جلسا کر مرجانا ایسا ہی تھا۔ جس محفل وفا کا ذکر اس نے اپنے اس شعر کیا۔
جو خود اس آج کی محفل کے اعلان نامے میں شامل ہے، اس میں محفل آرائی،
شعر پڑھنے اور سننے کی حد تک ہوتی تھی۔ اسی کے بعد مجاز اپنی ہزاروں باہمہ گر
آویز وفاداریوں کو سینے میں سمیٹے یکہ و تنہا رہ جاتا تھا۔ البتہ یہ جو شعر دروازے
پر طغرا بنا کر لٹکایا گیا ہے۔ وہ مجاز کی اپنی حقیقت کا مرقع رہے۔ دفتر شہریار
میں اس کے جنوں کی کارفرمائیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ وہ اس
کینڈے کا آدمی تھا جس کا ذکر حسرت موہانی نے اس شعر میں کیا ہے ؎

کسی پر لٹ کے رہ جاتا ہے حسرت
ہمیں کیا کام عمر جاودانی سے

سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ پوری نسل جس کی نمائندگی مجاز کے
اپنی شاعری میں کی بڑی ذہین بڑی طباع لوگوں پر مشتمل تھی مگر ساتھ ہی بڑی
بدبخت، بڑی ناہنجار، بڑی نکمی نسل تھی۔ شاید پوری تاریخ کی سب سے زیادہ
ناکام نسل۔ اس نے سوچا بہت کچھ کر کچھ نہ پائی۔ اور جو کیا وہ غلط۔ اس کے
خواب کی تعبیر الٹی نکلی۔ یہ ایک عالمگیر تاریخی حقیقت ہے۔ جس کا احساس
مجاز کو روز اول سے تھا۔ آوارہ، اعتراف اور آخر میں فکر سب اسی کی
شہادت دیتے ہیں۔ جوش صاحب نے نہ جانے کیوں شاید اپنے فرط محبت
میں ان جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو شاہزادہ کہکر پکارتے ہیں عین اسی طرح مجاز کو
پیغمبر بہار کا لقب دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجاز خزاں کا پیامبر تھا، یہ اور بات کہ
اس نے خزاں کی کانٹوں بھری خشکی کو اپنی زبان کی حلاوت سے نرم اور
گوارا بنا دیا، تقریباً بہار ہی کی طرح رنگین۔ مگر اس نے نسیم بہار کی چٹختی کلیوں

کے پیچھے خیال کے جھلکوں کا شور سن لیا تھا۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

سن سکا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

شاعری کی ابتدا ہی سے مجاز کے ہاں اس طرح کے اشعار ملتے ہیں ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

روئیں نہ ابھی اہل نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

بعد میں آوارہ کے ہر بند کا ٹیپ کا مصرعہ ایک TRACK NOTE لیے ہوئے ہے۔ بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں، ہوک سی سینے سے اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی، اور آخر میں پوری نظم اس جھنجھلاہٹ کی للکار پر ختم ہوتی ہے

؎ جی میں آتا ہے یہ سارے چلمن تارے نوچ لوں

یہ سب آخر کیا تھا، یہ کسی ایک آدمی کا تجربہ اتنی کسمپرسی میں نہیں ہو سکتا۔ نہ اعتراف میں مذکور گناہوں کی فہرست مجاز جیسے شریف النفس، ذکی الحس بے ضرر آدمی پر عائد کی جا سکتی ہے۔

سنگ کو گوہر نایاب و گراں جانا تھا
ریگ کو سلسلہ آب رواں جانا تھا
دشت پر خار کو فردوس جواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے راز غم و حسرت پنہاں

مجازی ذات کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو یہ سب باتیں جھوٹی ہیں۔ مگر پاکستان کو زندگی میں جنت، فردوس جواں سمجھ کر یہاں آنے والوں سے پوچھئے تو اس کا حرف حرف سچا ہے مقصد وہی پوری نسل، پوری قوم کا ہے۔ جس نے عالمی تعبیروں والے جھوٹے خواب دیکھے اور انھیں سچا سمجھ لیا۔ آخر میں خدا خدا کر کے یار لوگوں نے ایک ملک بنایا۔ وہ ایک مستقل مخمصہ بن کر رہ گیا سمجھ میں نہیں آتا کہ درد کی دوا پائی یا درد لادوا پایا۔ اس کا دستور لکھنے پر آئے تو گویا امتیاز علی تاج کے چچا چھکن خط لکھنے بیٹھے ردی کی ٹوکریاں اور کمرے کا فرش بچے کچھے کاغذ کے پلندوں اور مڑی تڑی کاغذ کی پرزیوں سے اٹ گیا۔ دستور آج بھی جو ہے وہ معطل ہے، دوسرا لکھا جا رہا ہے۔ اور تو اور اب پینے کا پانی بھی سونے نہیں تو چاندی کے بھاؤ بکتا ہے۔ روشنی کا کال ہے۔ کراچی اور لاہور روشنیوں اور رت جگوں کے شہر ہوتے تھے۔ آج یہاں اور وہاں اور ہر شہر کے چراغ شام ہی سے بجھے سے رہتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ، مگر چراغوں کی بے نوری پر ایک شعر بھی یاد آ رہا ہے جو پڑھے بغیر رہا نہیں جاتا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو سب نے دیکھا تھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اور ساحر لدھیانوی نے کہا ہے کہ

ایسا لگتا ہے کہ کچھ دیر میں اب
اس بھرے شہر میں ہو بولے گا

دیکھا آپ نے میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں، یہ بات کہاں کہاں پہنچتی ہے۔ فکر میں مجاز نے اپنی ساری عمر کے ان عالم آرا، تاریخی تجربات کو یکجا کرنے چھاننے بیننے، چھانٹنے پرکھنے اور انھیں کسی روایت کی لڑی، کسی معنی کے رشتہ میں پرونے کی آخری کوشش کی تھی جو اس طرح ختم ہوئی

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل، آگ گلستاں نہ بنی
توڑ دینا در زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیق مہ کنعاں نہ بنی

اور پھر۔

بایں انعام وفا اف یہ تقاضائے حیات
زندگی نذر غم خاک نشیناں کر دے
خون دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خون دل صرف چمن بندی دوراں کر دے

انعام وفا! خون دل کی قیمت! غالب نے پوچھا تھا ایسے قاتل کا خون بہا کیا ہے؟ اور اقبال نے جواب دیا تھا صلۂ شہید کیا ہے، تب و تاب جاودانی آگے آپ خود سمجھئے۔ اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ داستان ختم۔

(کراچی میں یوم مجاز کی تقریب میں پڑھا گیا)

اعلان

تذکرہ شعرائے ہند

شامل ہونے والے شاعروں کی پہلی فہرست

(مختصر حالات زندگی مع تخلص)

[illegible] علی سرور جعفری، [illegible] سلطان پوری، کیفی اعظمی، [illegible] نوشاد نوشاد لکھنوی، واصف، وحید اختر، شہریار، [illegible] آزاد، شہاب جعفری، [illegible] علی، معصوم خاندیسی، یعقوب راہی، کوثر بیاوری دہلی، افتخار اعظمی، [illegible] عرفان صدیقی، کمال احمد صدیقی، منظر سلیم، پرکاش فکری، ہادی منصوری، محمد علوی، بشر نواز، بشیر بدر، وسیم بریلوی، فضا ابن فیضی، بیکل اتساہی، ناجد زیدی، غلام ربانی تاباں، سید محمد صدی، ساجد زیدی، ممتاز مرزا، فیض عالم شعری، [illegible] صدیقی، کاوش بدری، عبدالعباس، رحیم شمیم، حشرت آفریں، عبدالستار کمال، اقتدار امام، عزیز قیسی، منظر شہاب، مصباح [illegible]، منظر امام، ممتاز راشد، راشد آذر، راحت اندوری، اعزاز افضل، منور شبلی، منور رانا، کشن تلوار، رونق نسیم، قیصر نسیم، [illegible]، راج نرائن راز، کمار پاشی، کرشن موہن، کیلاش ماہر، رفاقت علی خاں، مجیب علی خاں، جلیس [illegible]، نشتر خانقاہی، رؤف عاوید، علی ظہیر علی، ملک زادہ منظور احمد، ملک زادہ عاوید، اختر لکھنوی، دیپک قمر، اختر نظمی، شجاع عاوید، گنیش بہاری، طرز، صابرت علی جوہر زیدی، محمد سعید، [illegible]، احمد کمال پرواز، اختر سعید خاں، امین اشرف، بھگوان داس اعجاز، چندر بھان خیال، پرکاش تیواری، بدام [illegible]، احمد سوداں، انجم عرفانی، قاضی سلیم، عزیز قیسی، حسن [illegible]، باقر مہدی، [illegible]، سالم علی، [illegible]، عزیز اندوری، انور کیفی، [illegible]، کمود سنگھ بیدی، [illegible]، انیس انصاری، احمد سوپ، تاباں، حامد الہ آبادی، آل احمد سرور، محمد رشید الاسلام عرفی، احتشام اختر، سلطان اختر، [illegible]، ساحر ہوشیارپوری، قیصر قلندر، طفیل جعفری، فیروز فقر، عالم خورشید، وقار جلیل، واحد بریلوی، وفا صدیقی، علی باقر مدی، عدم گونڈوی، ادبی سری واستو، عابد عالمی، عاوید، [illegible]، غلام ثقلین، عطیت الدین فریدی، والی آسی، مسعود حیات، کامل قریشی، یعقوب عامر، [illegible]، شمیم حنفی، مظفر، اجمل اجملی، محمود ایاز، گلزار دہلوی، عارف دہلوی، تنویر احمد علوی، مظفر حنفی، [illegible]، کیف بھوپالی، وارث کرمانی، سرسوتی سرن کیف، ظفر گورکھپوری، انیس جہاں، وہاب دانش، [illegible]، لطف الرحمن، ..... شاہد احمد شعیب، حامد کاشمیری، حکیم منظور، انور عثمانی، سلام سندیلوی، [illegible]، رضوی، محمد علی موج، وجاہت سندیلوی، شاہد احسن مرادآبادی، آشفتہ چنگیزی، باقر مہدی، حسرت [illegible]، حسن زیدی، کاوش پرتاب گڑھی، احسن رضوی، صلاح الدین پرویز، مناظر عاشق ہرگانوی، شمس الرحمن فاروقی، جینت پرمار، شہپر رسول، شمیم فاروقی، رؤف خیر، سیدہ احتشام، ساجد [illegible]، [illegible] ضیا، سیفی سرونجی۔

یہ نام بغیر کسی ترتیب کے لکھ دیے گئے ہیں

اپنا منتخب کلام اپنی تصویر اور مختصر حالات زندگی کے ساتھ بھجوائیے

تذکرہ جلد ہی شائع ہوگا

ادارہ

بیکل اتساہی

محمود درویش

(فلسطینی انقلابی شاعر)

ایسا ہونے دے اے میرے نغموں کی جاں
یہ جو شاداب زیتون کے پیڑ ہیں
ان کی شاخیں جو الجھی ہیں
سب چھانٹ کر
درد کے گیت
یا غم کے نغمے ہیں جو
ان کی دہکی ہوئی آگ میں پھینک کر
مجھ کو کرنا ہے اب موت کا سامنا
ایسا ہونے دے اے میرے نغموں کی جاں

بیکل اتساہی

مشاہدہ واستعجاب

اونچے، اونچے محل
سُونے سُونے سے دیوار و در،
کتنے کچے مکانوں کو توڑا گیا ؟
ایک سناٹا چھایا ہوا
ایک جہاں سانس روکے ہوئے رات بھر
کتنے گیتوں کا لہجہ مروڑا گیا ؟
صاف ستھری سڑک
سہما سہما ہوا موٹروں کا سفر
کتنی پگڈنڈیوں کو نچوڑا گیا ؟

بیکل اتساہی

بدلتے سائے

فن کا اک اندھا کنوئیں میں
لیکے پیمائش کا تنکا بادلوں کے پاس
پہنچا ہے ابھی
گھونسلا اپنا بنانے کی ہے فکر
بجلیوں کے درمیاں
دیکھنا مقصود ہے
فکر کی کتنی بلندی تک پہنچتا ہے کوئی
کس قدر سرمست ہے پرواز میں

۲

لکھ رہا ہوں تازگی کی داستاں
محو حیرت ہے زمانہ دیکھ کر

فکر کا انداز بدلا ہے میرا
اک نیا احساس اپنے ساتھ ہے
رنج و غم کو دے رہا ہوں میں مسرت کا خطاب
چل رہی ہے گرم لو
اک اداسی کا سماں ہے جا بجا
گرچہ سوکھے ہیں چمن میں سارے پھول
لکھ رہا ہوں تازگی کی داستاں

۳

خود غرض ہے کس قدر یہ آدمی
اپنی شہرت کے جنوں میں بے قرار
کیا اثر پڑتا ہے نوکِ خامہ سے دل کا
تارِ نبضِ وقت پر
کچھ بھی تو احساس ہو
پھر بھی لکھ ڈالا ہے قتل و خوں کا قصہ کھول کر
ہے ثمر اخبار میں
آگ کی مانند پھیلی ہے خبر
آدمی ہے خود غرض شہر میں

بیکل اتساہی

گیت

دن بھر اپنے انگ انگ میں رچی مدھر رچنا
رات میں بکھر گیا سپنا
میں الھڑ اپنے درپن میں بے سدھ کھوئی کھوئی
کوری آشاؤں کی سیج پر کب جاگی کب سوئی
آنکھ کھلی تو دیکھ رہا تھا مجھ کو میرا انگنا
رات میں بکھر گیا سپنا
بدمل کے پور پور میں چھلکی پھرے گلابی
پھولوں سے کومل گالوں پر تتلی کی بے تابی
گدرائے ہونٹوں کو چھو گیا گیتوں کا سگنا
رات میں بکھر گیا سپنا

بیکل اتساہی

غزل

برکھا بارہ ماسی — پھر بھی دھرتی پیاسی
تازہ تازہ چہرے — رنگت باسی باسی
لفظ لفظ بنجارے — گیت گیت سنیاسی
سڑکوں پر ہنگامے — گھر کی لاج اداسی
قتل کریں پھر روئیں — آنکھیں بڑی سیاسی
کوڑی کے سب سودے — بھاؤ مگر الماسی
گاؤں ہے ننگا بھوکا — کھیتی اچھی خاصی
لکھ لے موت یقینی — جیون مان قیاسی

بیکلؔ جھوٹ کا عادی
سچ بولے تو عاصی

بیکل اتساہی

غزل

کھنڈر بنے ہوئے جنگل رہائشی نکلا
نگر نگر کا لٹیرا مہارشی نکلا

جلایا شہر کبھی کھیتوں کو پھونک چلا
یہ آدمی جو تھا خاکی وہ آتشی نکلا

بہت حسین تھا مفہوم داستانِ حیات
ہجوم لفظ و بیاں بھی نمائشی نکلا

ہوا کچھ اب کے تیرے شہر کی ہے ایسی
کہ جس سے ہاتھ ملایا وہ سازشی نکلا

چلا میں چھوڑ کے گھر بار متاعِ رنج و الم
مگر خیالِ سفر آزمائشی نکلا

بڑا ہی نام تھا بیکل کا پارسائی میں
مگر وہ فردِ عمل سے سفارشی نکلا

خورشید طالب

غزل

جب تک وہ پیڑ سبز رہا بے ہنر لگا!
جب سوکھنے لگا تو ہمیں معتبر لگا!

باطن میں قصرِ شاہ بظاہر کھنڈر لگا
بستی کا ہر مکان مجھے اپنا گھر لگا

پچھلے پہر میں مانگ رہا تھا دعائے امن!
پھر آ کے ایک تیر مرے ہاتھ پر لگا

توڑا تو تھا گھروندہ مرے اپنے ہاتھ نے
الزام بے گناہ ہواؤں کے سر لگا

دیوار و در کو اپنا لہو تک پلا دیا
پھر بھی یہ گھر ہمیشہ کرائے کا گھر رہا

اپنی زمیں تو خانماں برباد تھی مگر
اس کی طلب کا چاند نگر بھی کھنڈر لگا

خورشید طالب

غزل

ہے صداؤں سے بھی شہر سماعت ان دنوں
ہو گیا ہے ہر کوئی خاموش فطرت ان دنوں

نیوے سانپوں کے گھر میں پی رہے ہیں دھمکیاں
ہے بہت ہی غیر اس جنگل کی حالت ان دنوں

دور رفاقت کی نہیں دیوار سمجھوتے کی ہے
جس پہ قائم ہے تعلق کی عمارت ان دنوں

جس نے بے سایہ سمجھ کر کاٹ ڈالا تھا مجھے
خوب رلاتی ہے اسے میری ضرورت ان دنوں

رائیگاں دھڑکن دلوں کی اور سانسوں کی دلیل
ہر جگہ مشکوک ہے اپنی حقیقت ان دنوں

ان جلے فقروں کو مت دل سے لگائے زندگی
ہے ذرا ناساز یاروں کی طبیعت ان دنوں

سب کے آگے خود نمائی کے مصلے ہیں بچھے
ہے صحیفوں کی جگہ جھوٹی حکایت ان دنوں

راستوں کے پیڑ پر ہوتا ہے رہزن کا گماں
ہم کہاں جھاڑیں طالب گرد مسافت ان دنوں

عبدالمتین ساقی

غزل

واسناؤں کا مقدر ہو گئی ہیں بجلیاں
در و کے ٹوٹے مکانوں کو گئی ہیں بجلیاں

کس قدر سرعت سے کر کے جسم کو بے آبرو
ذہن کے تاریکیوں میں کھو گئی ہیں بجلیاں

میں چراغِ جستجو لے کر کھڑا ہوں راہ پر
پتھروں کے گنبدوں پر سو گئی ہیں بجلیاں

روح کی چادر پہ باقی رہ گئے گرد و غبار
جسم کی آلائشوں کو دھو گئی ہیں بجلیاں

سامنے اپنے کھڑا ہے خواب کا اونچا محل
سیر طبیعوں کے پیچ و خم میں کھو گئی ہیں بجلیاں

حسرتیں پودوں کی صورت میں اگیں ذہن میں
واہموں کے تخم جاتی بو گئی ہیں بجلیاں

رضا امام

العطش! العطش!

نام تھا مدد گار حسین۔ پکارے جاتے تھے مدو میاں۔ رنگ صاف ستھرا، دھلا ہوا سا۔ آنکھیں کھلی کھلی، چہرا کیپسول جیسا، اور جتنا ناک سے اوپر اتنا ہی ناک سے نیچے اوپر کا ہونٹ نچلے ہونٹ سے دبا ہوا۔ ہاتھ لمبے، کندھے ڈھلکے ہوئے اور پاؤں بڑی پنی تلی مگر کچھ ڈھیلی ڈھالی۔

کئی مرتبہ نوکری کی لیکن ہر بار چھوڑ دی۔ گھر میں میاں بیوی کل دو نفر تھے، گزارے کے لیے دو پشتینی مکانوں اور کچھ دکانوں کی آمدنی کافی تھی، پھر کیوں کسی کی غلامی کی جائے۔ ویسے بھی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ دن بھر فرصت سے لیٹے پڑھتے رہتے تھے۔

مذہب کے بہت پکے تھے، مگر گھر سے باہر جا کر نماز پڑھنا پسند نہیں تھا۔ مجلسوں میں بھی بس کبھی کبھار ہی جاتے تھے حالانکہ مرثیہ بڑی درد بھری آواز میں پڑھتے تھے۔ محرم میں اکثر گھر بیٹھے، آنکھیں بند کیے مرثیہ گنگناتے رہتے تھے۔ اگر کسی نے لبیں چلنے کو کہا تو تنک کر کہتے۔

بھئی، ہم کربلا سننا نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں میر صاحب کا مرثیہ محسوس کرنے دو۔

انہیں بتا دیجئے کہ پھر کوئی کچھ نہیں کہتا کیونکہ سب جانتے تھے کہ اگر نہیں چھوڑ گئی تو پھر وہ اپنی غیرت دیکھیں گے نہ دوسرے کی۔

جب طالب علم تھے تو ایک مرتبہ اپنی انتہی ہٹ کی وجہ سے کالج سے بس نکالے جاتے جاتے رہ گئے۔ امتحان میں ان کے آس پاس کا کوئی لڑکا بول رہا تھا۔ نگراں کو ان پر شک ہوا۔ مدومیاں یہ کہاں برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان پر بے ایمانی کا شبہ کرے۔ پھر ہی تو گئے بولے۔

"جب آپ لوگ ٹھیک سے پڑھاتے نہیں تو ہم تو نقل کریں گے ہی آپ سے پکڑتے بنے تو پکڑ لیجئے۔"

نگراں بھی کوئی بگڑے دل تھا۔ اس نے ان کے خلاف رپورٹ کر دی۔ بڑی مشکل سے دوسرے استادوں کی سفارش پر، جو ان کی عادت اور مزاج سے واقف تھے، معاملہ رفع دفع ہوا۔

ان کی شادی بھی بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ ان کے ایک عزیز دوسری شادی اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ ان کی پہلی بیوی بانجھ تھی۔ بیوی بھی رشتہ داروں ہی میں سے تھی۔ اس لیے کچھ لوگوں کے کہنے پر مدومیاں بیچ میں پڑے اور اپنے ان عزیز کو، جو دوست بھی تھے، سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بیوی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مگر وہ عزیز نہیں مانے اور بات بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ عزیز جھنجھلا کر بولے۔

"اگر اس بانجھ سے ایسی ہی ہمدردی ہے، تو میں طلاق دیے دیتا ہوں تم شادی کر لو۔"

مدومیاں ایک لمحے کے لیے تو ٹھٹھکے اور پھر ہاں کر دی۔

اپنے مزاج کی اس ٹیڑھ سے مدومیاں اچھی طرح واقف تھے۔ اس

لیے خود ان کی کوشش زیادہ تر یہی ہوتی تھی کہ کسی معاملے میں پیر نہ اٹھائیں۔ لیکن پھر بھی کہیں پھنس جاتے تھے۔ اور یہی ایک مرتبہ پھر ان کے ساتھ ہوا۔

رمضان کا مہینہ تھا، اور وہ بھی گرمیوں کے رمضان کا۔ بازار میں سناٹا سا تھا۔ کچھ دکانیں تو دھوپ کی وجہ سے بند تھیں اور کچھ رمضان کی بنا پر۔ ویسے تو رمضان میں مسلم آبادی والے علاقوں ہمیشہ ہی احتراماً ہوٹلوں اور چائے خانوں پر پردے پڑے رہا کرتے تھے، لیکن اس سال تمام کھانے پینے کی، یہاں تک کہ پان سگرٹ کی بھی دکانیں بند کرا دی گئی تھیں۔ پچھلے سال کے ہندو مسلم فساد کے بعد سے الگ الگ مذہبی پہچانوں کو نمایاں کرنے کی خواہش لوگوں میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ محلے کے بے فکروں کو نہ صرف ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا بلکہ اپنی اہمیت جتانے کا ایک ذریعہ بھی۔ روز نئی نئی تجویزیں سوچی جاتی تھیں۔ اور انہی میں سے ایک یہ تھی کہ رمضان کے مبارک مہینے میں کسی ایسے غیرے کو بھی اس بات کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ سر بازار روزہ نہ رکھنے کا اظہار کرتا پھرے۔

مدو میاں روزے سے تھے۔ مگر چونکہ وہ اس میں یقین رکھتے تھے کہ روزہ کامیاب جب ہی ہوتا ہے جب آدمی روزمرہ کے کاموں میں فرق نہیں آنے دیتا، اس لیے آج وہ ٹھیک ٹھیک دوپہر میں کہیں سے چلے آرہے تھے۔ کھانے پینے اور پان سگرٹ کی دکانوں کو بند دیکھ کر انہیں بھی بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ پیاس چمکی ہوئی تھی اور تھکاوٹ طاری تھی۔ ایسے میں اگر بازار میں برف لگی ٹھنڈی بوتلیں نظر آئیں اور زردہ کی مہک ناک میں پہنچتی تو بھلا دل پر کیا نہ گزرتی۔

تبھی اچانک ان کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو بے چینی سے کبھی ادھر کو

دکانوں کی طرف بڑھتے تھے اور کبھی ادھر کی۔ مدو میاں انہیں پریشان دیکھ کر رک گئے اور ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔

بھائی صاحب، ان میں سے ایک بولا: ہم ادھر ایک صاحب سے ملنے آئے تھے لیکن وہ شاید یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ اب ہم کچھ کھانے پینے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر یہاں تو کھانے پینے کی سب دکانیں بند ہیں۔ پیاس کے مارے اس گرمی میں جان نکل جا رہی ہے۔

مدو میاں نے انہیں دلاسہ دیا اور سوچا کہ کسی نہ کسی دکاندار کے پاس تو پانی ہوگا ہی ان کو پلوا دیں گے۔ مگر جس دکاندار سے بھی انہوں نے پانی کے لیے کہا اس ہی نے انکار کر دیا۔ دراصل پہلے دن کچھ پان سگرٹ اور چائے خانے والوں نے چپکے چپکے کچھ بکری کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب چند جوشیلے نوجوانوں کو اس کا پتہ لگا تو انہوں نے طے کر لیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے ان پہ اپنا خوف بٹھائیں گے۔ نتیجہ میں بازار میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بوتلیں ٹوٹ گئیں، کتنے سگرٹ کے پیکٹ غائب ہو گئے، اور ایک دو روزہ چوروں کے تو ٹھنڈے پانی کے کیتلر بھی غائب ہو گئے۔ اس لیے اب کسی دکاندار کی ہمت نہیں تھی کہ کھلے عام یہ ظاہر کرے کہ وہ روزہ سے نہیں ہے۔

مدو میاں اپنی ناکامیابی پر کچھ کھسیانے سے گئے۔ ان دونوں کو تو اپنے گھر لے جا کر پانی پلوایا اور جو کچھ موجود تھا کھلوایا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جی میں ٹھان لی کہ اس جبر کے خلاف آواز ضرور اٹھائیں گے۔

اسی ارادے سے شام کو، روزہ کھولنے کے بعد، چوراہے پر بنو پان والے کی دکان پر پہنچ گئے۔ بنو کی دکان اس علاقہ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی کبھی صرف پان سگرٹ کی دکان تھی۔ مگر اب یہاں چائے اور لسی وغیرہ بھی ملنے لگی

تھی۔ مسجد پاس ہی تھی۔ اس لئے مغرب کی نماز کے بعد اس دکان پر اچھی خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ سٹیریو کی جھنجھناتی آواز کے سایہ میں لوگ چائے اور لسی کی چسکیاں لیتے رہتے تھے، لکا، تھمس اپ اور ڈبل سیون کے کاک کے بے جھاگ اڑتے، اور زردوں کی مہک سگرٹوں کے دھوئیں اور پاس کے کباڑی کی دکان سے اٹھنے والی خوشبو میں مل جل کر فضا میں گھلتی رہتی۔ یہاں تہمد اور داڑھی والے بزرگ بھی نظر آتے تھے اور رنگ برنگی ٹی شرٹیں اور جینز یا طرحدار کرتے پہنے نوجوان بھی۔ یہ لوگ گھنٹوں بیٹھے کھڑے ادھر ادھر کی باتیں یا کسی مسئلہ پر بحث کرتے رہتے یا پان چباتے، دھواں اڑاتے، دکان کے تختے کے سہارے ٹیڑھے کھڑے سامنے گھورتے رہتے تھے۔ اسی دکان پر اس علاقہ کی ظاہری زندگی سے متعلق اہم فیصلے ہوا کرتے تھے۔

مدو میاں کی باتیں سن کر کئی لوگ ان کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ مگر کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ دکانیں بند کرانا کوئی غلط کام ہے۔ آخر مسلمان ہی مسلم علاقہ میں اپنے کلچر کا خیال نہیں رکھیں گے تو پھر اور کون رکھے گا۔ اور پھر ایسی باتوں کا اثر دوسروں پر کتنا اچھا پڑتا ہے۔ سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان اپنے عقیدہ میں کتنے پکے ہیں۔ یہ تو اسلامی ڈسپلن کا بہترین اظہار ہے۔ ایک دو لوگوں نے کچھ دبی دبی آواز میں مدو میاں کی طرفداری بھی کرنا چاہی مگر عام موڈ دیکھ کر چپ ہو گئے۔ اپنے کو اکیلا پاکر مدو میاں کا پارا اور چڑھ گیا۔ اپنے دونوں بازو اٹھاتے ہوئے گرج کر بولے:

"تم نہیں مانتے تو مت مانو۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ان بازوؤں میں ابھی اتنا دم ہے کہ اپنے ارادے کو خود پورا کر سکوں۔ کل سے میں سبیل لگاؤں گا۔ دیکھوں کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔"

لوگوں نے مدو میاں کے اس دعوے کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مجمع میں پیچھے سے کسی نے پھبتی بھی کسی۔ چلو مدو میاں اسی بہانے کوئی مفید کام تو کرو گے۔ مگر یہ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ واقعی مدو میاں اپنی دھمکی پر عمل کر بیٹھیں گے۔ اس لیے اس وقت سب حیران رہ گئے۔ جب دوسرے دن دوپہر کو انہوں نے دیکھا کہ بازار کے آخری کونے پر، جدھر سائیکل کی مرمت کرنے والے اور موچی وغیرہ بیٹھتے تھے، مدو میاں شامیانہ اور قنات لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک بڑا سا بینر ٹنگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے: پانی پیو تو یاد کرو پیاس حسین کی۔ اور ایک تخت پر دو بڑے بڑے پانی بھرے مٹکے اور کچھ آبخورے اور گلاس رکھے ہوئے ہیں۔

پہلے دن تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جو بھی دیکھتا مسکرا کر گزر جاتا۔ لیکن جب دوسرے دن بھی مدو میاں نے سبیل لگائی اور ان کی نگرانی پر نفیات نوجوانوں نے دیکھا کہ سبیل پر راہ گیروں کی، خاص طور پر گاؤں والوں، کھیت والوں اور مزدوری کرنے والوں کی، تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو یہ سوچنا پڑا کہ ان کے خلاف کچھ نہ کچھ کارروائی کرنا ضروری ہے۔ ورنہ اوروں پر بھی ان کا برا اثر پڑے گا۔

تیسرے دن، جب مدو میاں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے، تو اچانک ایک غلہ آکر ایک مٹکے میں لگا۔ اور پھر ایک اور دوسرے مٹکے میں۔ اور اس سے پہلے کہ مدو میاں سلام پھیر کر نماز سے اٹھیں کئی غلے آئے اور دونوں مٹکوں کا پیندہ نکلا۔ مدو میاں بہت گرجے برسے، ادھر ادھر دیکھا، لوگوں سے پوچھا، مگر نہ انہیں کوئی غلیل والا نظر آیا، نہ ہی کسی نے ہامی بھری کہ اس نے کسی کو غلیل چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

عام خیال یہ تھا کہ اس واقعہ کے بعد مدو میاں کی ہمت پست ہو جائے گی مگر اس کے اگلے دن دیکھا تو مدو میاں لکڑی کے ایک بنے بنائے لمبے سے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے ان کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے آئس بکس رکھے تھے۔ اور کاؤنٹر کے نیچے کئی کریٹ مختلف قسم کے کولڈ ڈرنکس کی بوتلوں سے رکھے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے قناتیں اور شامیانہ کی جگہ باقاعدہ لکڑی کا ایک کیبن بھی بنوانا شروع کر دیا تھا۔

مدو میاں کی اس حرکت سے نوجوانوں میں سخت غصہ پھیل گیا۔ آخر یہ نسلی اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ اس غصہ میں ان کولڈ ڈرنکس کے دکانداروں کا غصہ بھی شامل تھا جن کی دکانیں دن بھر بند پڑی رہتی تھیں اور جن کے گاہک مدو میاں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

بات بگڑتی دیکھ کر کچھ بزرگوں نے مدو میاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ مدو میاں خوامخواہ ہی لڑکوں سے الجھ رہے تھے۔ آخر یہ بچے کوئی برا کام تو کر نہیں رہے تھے۔ جو کچھ کر رہے تھے۔ اپنے مذہب ہی کے لیے تو کر رہے تھے۔ رہی شدت پسندی تو یہ تو صرف عمر کا تقاضہ تھا۔ اب شدت نوجوانوں میں نہیں ہوگی تو کیا بوڑھوں میں ہوگی۔

مگر مدو میاں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ الٹے بگڑ کر بولے "یہ مذہب میں مذہب کے نام پر کلنک ہے۔"

مدو میاں کے اس اڑیل پن پر جن کو ان سے کچھ ہمدردی تھی وہ بھی جھنجھلا گئے اور ان سے بالکل بے تعلق ہو گئے۔ اگر کسی کی شامت ہی آگئی ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اور شامت کو آنے میں دیر نہیں لگی۔

[illegible] دن [illegible] ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بازار [illegible] مالکا [illegible] سناٹا تھا۔

مدومیاں عادت کے مطابق بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک پتھر آکر ان کے تسبیح والے ہاتھ میں لگا۔ اور تسبیح ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ درد کے باوجود مدومیاں نے جلدی سے تسبیح کو اٹھایا، چوم کر کاؤنٹر پر رکھا اور تلملاتے ہوئے باہر آئے۔ گرج کر بولے۔

"کون حرامزادہ ہے! ذرا سامنے آئے!"

ان کا یہ کہنا تھا کہ ایک دم چاروں طرف سے کئی اجنبی مشٹنڈے نکل آئے اور مدومیاں کی جانب دھمکی بھرے انداز میں بڑھنے لگے۔

"کون بے! گالیاں کیوں بک رہا ہے بے فضول میں؟"

ایک نے کہا۔

"ابے ایک تو خود رمضان میں حرام کام کرتا ہے۔ ٹھنڈا بیچ کر اور اوپر سے دوسروں کو برا بھلا کہتا ہے۔" دوسرا بولا۔

"ٹانگیں توڑ دو اس کی۔" کسی نے کہا۔

"ذبح کر دو سالے کو۔" کوئی غرایا

مدومیاں سناٹے میں آگئے۔ غصہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اور اس کی جگہ سارے جسم میں برف سی تیر گئی۔ پتھر جیسے قدموں سے چلتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ہاتھ میں ایک ننھی سی ہتھوڑی کس کر پکڑ لی اور دوسرے سے کاؤنٹر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ ان لوگوں کے پاس آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر انہیں بالکل پتہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے پاس آنے پر کریں گے کیا۔ بس خواب کے سے عالم میں انہیں آگے بڑھتا ہوا دیکھ جا رہے تھے۔

کاؤنٹر کے پاس آکر وہ لوگ گئے اور مدومیاں کو گھورنے لگے۔

جلے سی دیوان کی سلوٹی ہوئی، چمکتی آنکھیں مدو میاں پر جمی رہیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک ٹیڑھی سی مسکراہٹ تھی۔ اور ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک آگے جھکتا ہوا بولا۔

"لا ہمیں نہیں پلائے گا بوتل؟"

دوسرے نے آگے بڑھ کر ایک بوتل اٹھائی، مدو میاں کی طرف دیکھتے ہوئے باچھیں پھیلا کر ہنسا، اور بوتل سڑک پر دے ماری۔ ایک جھٹکے کے ساتھ بوتل پھٹ کر بکھر گئی اور ان سب نے بڑے زور کا ٹھاکہ مارا۔ اور پھر وہ خاموشی سے کھڑے ہو کر مدو میاں کو گھورنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کاؤنٹر پہ پڑا ہوا ایک تنکا اٹھایا اور کاؤنٹر کے سہارے کھڑا ہو کر دانتوں میں خلال کرنے لگا۔

مدو میاں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بس انہیں تکے جا رہے تھے اور ان کے آگے کچھ کرنے کا انتظار کیے جا رہے تھے۔ اتنے میں مسجد کی جانب سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر مدو میاں کی جان میں جان آئی لیکن اچانک وہ مسٹنڈے بھی چست ہو گئے۔

"کیوں بے تو جائے گا یہاں سے یا ہم تجھے کچھ توڑیں پھوڑیں۔ تیری یہ دادا گیری نہیں چلے گی۔ بند کر دکان کو۔"

مگر مدو میاں کو اب مدد کی امید تھی۔ انہیں یقین تھا کہ جیسے ہی محلہ والے نزدیک آئیں گے یہ غنڈے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ منہ سے تو کچھ نہ بولے لیکن کاؤنٹر کے پیچھے ذرا تن کر کھڑے ہو گئے۔ اتنی دیر میں نمازی پاس آگئے ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کیا بات ہے مدو میاں؟"

مگر اس سے پہلے کہ مدو میاں اپنی آواز پائیں ان غنڈوں میں سے ایک بول اٹھا۔

"بات کیا ہے جناب۔ سمجھا رہے ہیں کہ بھیا رمضان کی توہین نہ کرو تو گالیاں دیتا ہے۔"

مجمع میں سے کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں

"چچ۔ چچ! مدو میاں کتنی بری بات ہے!"

مدو میاں کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنے میں ایک آواز آئی۔

"ارے یہ ایسے نہیں مانے گا۔ پھینک دو اٹھا کے سالے کو اور اس کے سامان کو۔"

اور پھر چاروں طرف سے چیزوں کے ٹوٹنے پھوٹنے اور بوتلوں کے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مدو میاں کو اب احساس ہوا کہ اس وقت ان کا کوئی دوست نہیں ہے۔ وہ صرف دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

وہ دوڑ دوڑ کر ایک ایک کی خوشامد کرنے لگے۔

"بھیا! ارے بھیا! سنو تو۔۔۔"

"دیکھو میں مذہب کا مخالف نہیں ہوں۔"

"ارے میں تو خود روزے سے ہوں۔"

"ارے بھئی! میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔"

مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر محلہ کے لوگ تھے۔ مگر وہ تماش بینوں کی طرح الگ کھڑے ہوئے تھے۔ مدو میاں کو گڑگڑاتا دیکھ کر ان میں ایک کھسیاہٹ کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ جیسے جیسے مدو میاں کی گڑگڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی ویسے ہی ویسے ان میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی

مدو میاں چلا رہے تھے۔
"ارے ظلم نہ کرو!"
"تمہیں خدا کا واسطہ!"
"تمہیں رسول خدا کا واسطہ!"
"تمہیں حسین کا واسطہ!"

اچانک تماشبینوں میں سے ایک شخص تڑپ کر باہر نکلا اور اس نے مدو میاں کے سر پر ایک بوتل کھینچ ماری۔ مدو میاں تیورائے اور کاؤنٹر کے پیچھے گر پڑے۔ ایک پل کے لیے سب کچھ تھم گیا اور پھر ایک دم سے بھونچال سا آگیا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کرنا چاہ رہا تھا۔ بوتلیں پھٹ رہی تھیں۔ ان کے ٹکڑے اڑ اڑ کر لوگوں کو لگ رہے تھے۔ مگر کسی کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جس کے جو ہاتھ لگ رہا تھا توڑ رہا تھا۔ جس کو کچھ نہیں مل رہا تھا بھنائے ہوئے تیتے کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔ شامیانہ گر پڑا۔ کاؤنٹر اور لکڑی کے تختوں کے پرانچے اڑ گئے۔ کسی نے دیا سلائی جس کی تیلی جلا کر کپڑے اور تختوں کے ٹکڑوں پر پھینک دی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں آگ چاروں طرف بھڑک اٹھی۔

اچانک کوئی چلایا "پولیس!" اور منٹوں میں سارا مجمع پگھل کر غائب ہو گیا۔

جب پولیس وہاں پہنچی تو کوئی عصر کا وقت ہو گا۔ چاروں طرف ملبے کا ڈھیر پڑا تھا۔ بہتے ہوئے سیال میں یہ بتانا مشکل تھا کہ کہاں پانی ہے اور کہاں خون۔ ادھ جلے ملبے میں سے دو بازو باہر نکلے ہوئے تھے۔ بینر کا جو حصہ جلنے سے رہ گیا تھا اس

پہ پیاس حسین کی ہونٹ چمک رہے تھے اور ایک کونے
میں کسی چیز سے دبا ہوا کسی اسلامی کیلنڈر کا ایک صفحہ
پھڑپھڑا رہا تھا۔ جس پر سبز جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "رمضان
کا مہینہ برکتوں اور نیکیوں کا مہینہ ہے!"

ایک بنگلہ افسانہ

سنیل گنگوپادھیائے

مترجم شاہد حسین بخشاپوری

دور اُداس

"ابے ڈبو، بڈھو کو بلا"

"بلایا، استاد"

"لپک کر جا، اور دوڑ کر آ۔ کتے کی چال، بلی کی چال نہیں، سمجھا؟"

"سمجھ گیا استاد، حلق سے چائے اتار لوں"

"جاتے جاتے پتہ لگانا، نو بجے کا رانا گھاٹ لوکل، لیٹ ہے یا نہیں"

"اسٹیشن جاؤں؟"

"ہاں جا۔ اور بڈھو کو بول، فوراً آئے"

چائے خانہ سے اٹھ کر ڈبو چلا گیا۔ اس کی چال نرالی ہے۔ دیکھنے پر ایسا لگتا ہے کہ اس کے جسم کے کسی حصے میں کوئی مرض ہے۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ کر چلنا نہیں جانتا۔ دائیں بائیں یا پیچھے سر گھماتا رہتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ کبھی بھی بیک ساتھ باہر نہیں رہتے۔ ایک ہاتھ پاکٹ میں ضرور رہے گا۔ چلتے چلتے وہ بار بار ٹرک پار کر کے ادھر سے ادھر فٹ پاتھ بدلتا رہتا ہے۔ کسی خاتون کو دیکھتے ہی

اس کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ تب وہ مسکراتا ہے۔ وہ ہونٹ بھینچ لیتا ہے۔ آنکھیں پھر جھکتا ہے۔ نظریں جھکا کر صحت مند ہو گی اس کی یہ حرکتیں اتنی ہی بڑھیں گی۔

"اے پری، ادھر آ!"

"کیا استاد!"

"دیکھ تو اس پتھر کو کیا ہوا؟ سالا جلتا نہیں ہے۔ کل سارے میں تیل بھرا!"

"پتھر ختم ہو گیا ہو گا!"

"دھت تیری کا!"

"یہ کیا استاد، پھینک دیا، استاد امی!"

"چم..... مار..... اور آئے گا!"

پری چپ ہو گئی۔ استاد یعنی پلٹو کی عادت سے وہ آگاہ ہے۔ ایک ایک دن پلٹو کو ایسا ہوتا ہے۔ اس دن وہ چیزوں کو برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ ابھی جو قیمتی لائٹر پھینک دیا، اگر اب پری اسے اٹھا لے، تو خوب گالیاں کھائے گا۔ ذرا دیر پہلے سگریٹ خرید کر روپیہ تڑاتے وقت پلٹو کے ہاتھ سے ایک روپیہ زمین پر نیچے گر پڑا تھا۔ پلٹو نے اسے نہیں اٹھایا۔ قریب ہی ایک بھکاری بچہ، ایک اور آدمی کے سامنے کھڑا اپنی رٹ لگا رہا تھا۔ پلٹو نے اس کو بلا کر روپیہ دکھا کر بولا۔

"ابے، لے لے۔ یہ لے!"

آ پلٹو اور بھی بہت کچھ پھینک دے گا یا خراب کرے گا۔

پلٹو، پری، ڈبو، بڈھو ـــــ ان میں سے ہر ایک کا ایک اچھا نام بھی ہے۔ لیکن طویل عرصہ تک ان ناموں کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ کسی نے ان اچھے ناموں سے نہیں بلایا۔

وہ سب چائے خانہ کے ایک کیبن میں بیٹھے ہیں۔ پردہ گرا ہوا نہیں ہے۔

ہے کہ یہاں کوئی نہیں جائے گا۔ نہ جانے پر ہوٹل کا بیرا بھی ادھر جھانک کر نہیں دیکھے گا۔

اپنے کپ میں بچی چائے تھی پلٹو نے وہ کیس ٹرے میں ڈال دیا۔ اس کے ذرا جھانک کر احتیاط سے نیچے فرش پر رکھے ہوئے جھولے سے ایک شراب کی بوتل نکالی۔ اپنے آپ کو پورا بھرنے کے بعد پری سے بولا "دے، کپ دے۔ کے سامنے نہیں نکالا۔ وہ ذرا سی میں بہک جاتا ہے۔ دیکھتی ہو کیا مال ہے؟"

پری بوتل کا لیبل پڑھ کر بولی ——— ارے بس، بہت خوب!

پلٹو کپ اٹھا کر ایک گھونٹ میں تمام پی گیا چہرے پر ہلکی لکیر تک نہیں ابھری۔ ہلکی نہیں آئی۔ پری ایسی نظروں سے اس کو تکتی رہی جیسے شاباشی دے رہی ہو، رہی ہو ——— یوں نہ ہو تو پھر استاد کیا معنی ———!

وہ تلخ عرق پینے کا ردعمل صرف پلٹو کی آنکھوں ہی میں دیکھا گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

کپ پھر سے بھر کر پلٹو بولا ——— ایسے میں کون سب سے زیادہ یاد آتا ہے۔ جانتے ہو؟ پگلا ——— پگلا چلا گیا اور میرا دایاں ہاتھ ہی کٹ گیا۔"

پری بولی ——— "سالا پگلا کیوں پالیٹکس والے ایک ایک دن ایک ایک طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

پلٹو سنجیدہ ہو گیا۔ اپنے آپ کہنے لگا ——— پگلا کی وہ رانڈ بھی جھنجھٹ تھی۔

ڈبو آکر بولا ——— "بڈھو نہیں آسکے گا۔ وہ بولا اسے بخار ہے۔"

پلٹو غصہ سے بولا ——— "وہ بولا یا تو نے دیکھا"؟

"دیکھا، بڈھو سویا ہوا ہے، صاحبی مجھ سے بولی"

پلٹو اٹھ کھڑا ہوا "چل، دیکھ آؤں ٹرین لیٹ ہے" ———؟

"بیس منٹ"

راستے میں وہ تینوں ساتھ ساتھ نہیں چلتے، بکھرے رہتے ہیں، آگے پیچھے۔ یہاں کے راستے، مکان، دکان اور عام زندگی کا جو اصل ہے، یہ لوگ اس اصول سے کچھ ہٹ کر ہیں، الگ تھلگ ہی ہیں۔ یہ لوگ مروت کے وقت احتیاط برتتے ہیں اور جلد بازی بھی ہو جاتے ہیں۔

انسان شکاری ہے۔ ایک زمانے میں جانوروں کے شکار پر جس انسانی تہذیب کی بنیاد پڑی تھی۔ وہ تہذیب، ایک طویل عرصہ گزر بیت گیا ہے۔ اب اس کرۂ ارض پر قوی ہیکل دیو پیکر بڑے بڑے جانور تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اب ایسے جانوروں کی پرورش کی جاتی ہے جو انسان کے کھانے میں آتے ہیں یعنی جو انسانی غذا میں شامل ہیں۔ پھر بھی انسان کا ہاتھ کھجاتا ہی رہتا ہے۔ انسان اب انسان ہی کا شکار کرتا ہے بلند عمارتوں میں تہذیب یافتہ انسان بھی انسانوں کا شکاری ہے ——— اور یہ لوگ ان شکاریوں کا ایک اور رخ ہیں، الٹا رخ ——— !

سامنے سے چار پانچ کا ایک اور ٹولی آ رہی ہے۔ یہاں کے تمام راستے تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح، دو ٹولیوں کا ایک ہی وقت میں ایک ہی راستے سے چلنے کا قانون نہیں ہے۔ جنگل کا قانون بھی ایسا ہی ہے۔

لیکن پلٹو موجود ہو، تو عموماً اس کی ٹولی کو کوئی چھیڑتا نہیں ہے۔ لیکن اب خود پلٹو ہی نے ان کو کسی رکاوٹ کے بغیر جانے دیا۔ اپنی ٹولی کو لے کر وہ دیوار سے لگ کر کھڑا رہا۔ ہاتھ کا سگریٹ آدھا بھی نہیں جلا تھا کہ اسے پھینک کر اس نے دل لگا کر ایک اور سلگایا۔

ریل لائن پار کرنے پر بستی کا علاقہ ——— بستی کے ایک کونے میں بدھو کا گھر۔ بدھو کوئی تیس سال کا ہو گا۔ وہ چادر اوڑھ کر سویا ہوا ہے۔ کھٹیا کے قریب

ایک دبلی پتلی چھوکری کھڑی ہے۔

پلٹو کمرے میں داخل ہو کر بڈھو نے چاند کو ایک جھٹکے سے کھینچ پھینک کر بولا ——"او —— سالے ——"

"سچ یار، مجھے بخار ہے۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔"

"الو... سالا کہیں کا... تیرے بخار کی....."

پری ہنس رہی تھی۔ پلٹو کو جس طرح چیزیں خراب کرنے کی عادت ہے، اسی طرح بڈھو کو بخار کی ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے

پلٹو شراب کی بوتل نکال کر بڈھو کے منہ میں ٹھونستے ہوئے بولا ——"پی سالے، تیرے بخار کا باپ بھاگے گا۔"

دبلی پتلی چھوکری تیز لہجے میں پلٹو سے بولی: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ آج نہیں جائے گا۔ میں کہتی ہوں، نہیں جائے گا۔"!

پلٹو ہنسا۔ اتنے بھیانک طور پر ہنسنے کی، اس نے مشق کی ہے یا یہ ہنسی اس کی فطرت ہے؟ جو بھی ہو اس کی ہنسی سے بدن میں کپکپی ہونے لگتی ہے۔

جھٹ سے، وہ لڑکی کا ایک ہاتھ پکڑ کر مروڑتے ہوئے بولا —— "دوں، توڑ دوں؟" تکلیف سے چیخ کر لڑکی بولی —— اف، لگتا ہے۔"

پلٹو ہنستے ہوئے اور بھی مروڑنے لگا۔ بڈھو فوراً اٹھ بیٹھا۔ التجا اور غصہ بھرے ملے جلے لہجہ میں بولا —— "کیا کرتے ہو استاد —— تم —— عورتوں کو ہاتھ کیوں لگاتے ہو ——؟"

پلٹو ان الفاظ کی پروا نہ کرتے ہوئے اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے گال پر ایک چپت جمایا —— بولا —— "جنتر لے لے —— چل۔"!

لڑکی اپنے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولی —— مرو —— آج تم سب

مرد۔ میں ہری کے نام پر خیرات دوں گی۔ شیو جی کی پوجا کروں گی۔ تم لوگوں کے چرنوں پر بیٹھ کر کیرتن کروں گی۔

دس کا ایک نوٹ فرش پر پھینکتے ہوئے پلٹو بولا ——— چلا جا تیرے بڈھو کو ٹھیک واپس لا دوں گا۔ میں مروں یا جیوں تیرے بڈھو کو ٹھیک لوٹا دوں گا۔ گوشت حلوا کر رکھے گی کبھی ——— !

اس کے بعد بستی کے پیچھے رکھے ہوئے ایک جیپ کار میں سوار ہو کر بے مقصد ہی وہ لوگ کوئی پندرہ منٹ تک گھومتے پھرے۔ بے مقصد، بے مطلب ——— جیپ میں چکر کھاتے کھاتے ہی بوتل خالی ہو گئی۔ پلٹو بوتل کو راستے پر دے مارا اور چھن چھن آواز کے ساتھ اس کے ٹکڑے بکھر گئے۔ جیپ ریلوے اسٹیشن کے سامنے آکر رکی۔ تینوں اترے اور پری جیپ ڈرائیو کرتی ہوئی کہیں اور چلی گئی۔

پلاٹ فارم پر بھی وہ لوگ ایک ساتھ کھڑے نہیں ہیں۔ بکھرے ہوئے ہیں۔ ٹرین آتے ہی تینوں مختلف ڈبوں میں گھس گئے جیسے کوئی کسی کو جانتا تک نہ ہو۔ کوئی پندرہ منٹ دوڑنے کے بعد ٹرین دو طویل اور ایک مختصر سیٹی بجاتی بجاتی، رفتار دھیمی کر کے رک گئی ——— اندھیرے میں، میدان میں ——— کیوں رکی۔؟ کوئی نہیں جانتا ——— !

تین ڈبوں سے ٹپاٹپ وہ تینوں اترے۔ ایک دو لمحہ کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد تینوں مل کر ایک ہی ڈبے میں داخل ہو گئے ——— ٹرین پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

پلٹو کے ہاتھ میں پستول، ڈبو اور بڈھو کے ہاتھوں میں چھرے ——— کمپارٹ میں ۱۹، ۲۰ مسافر۔ پلٹو خونخوار دانت دکھاتے ہوئے بولا ——— "کوئی

آواز نکالے گا تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔ نکالو سالے، کس کے پاس کیا ہے ؟"
کمپارٹمنٹ کے لوگ بے حرکت، بے آواز۔ صرف ایک ادھیڑ عمر عورت
کی کانپتی ہوئی ہلکی سی آواز آئی۔ وہی صرف ایک عورت ہے، کمپارٹمنٹ میں کسی
نے کچھ نہیں نکال کر دیا۔ بڈھو ایک بوڑھے کے سامنے جا کر بولا ــــ "گھڑی
اتار سالے۔ منہ پھاڑ کر دیکھتا کیا ہے" ــــ؟
سالا کہہ کر رشتہ قائم کرنے کی وجہ سے جو یا گھڑی کھول دینے کی مانگ
پر ــــ بہر حال بوڑھا حیران رہ گیا۔
بالکل بے وجہ یا صرف مثال قائم کرنے کے لیے ہی، پلٹو نے اس کے قریب
جو مسافر بیٹھا ہوا تھا اس کے سینے پر پستول لگا کر چند نہایت ہی خراب گالیاں
دیں اور اس کے بعد اس مسافر کے منہ پر ایک گھونسا ــــ ایسا گھونسا مارا کہ فوراً
ہی اس کے منہ سے خون نکل آیا۔ پھر کیا تھا روپیہ، پیسہ اور گھڑیاں ٹپا ٹپ
گرنے لگیں۔ ڈبو ان کو چن چن کر تھیلی میں بھرنے لگا۔ بڈھو ہر ایک کے پاس جا کر
اس کی تلاشی لینے لگا۔ ایک مسافر کے کمر سے سات ہزار روپیہ نکلا۔ اتنا روپیہ
ساتھ لے کر رات کے ٹرین میں وہ کیوں نکلا ہے؟ اس سوال کا جواب کون
دے۔
ادھیڑ عمر عورت کسی طرح بھی اپنے گلے کا ہار دینا نہیں چاہتی۔ عورتوں کو
زیورات بہت ہی عزیز ہوتے ہیں۔ پلٹو خود ہی اس عورت کی طرف بڑھا۔ ہار پکڑ کر
کھینچ کر توڑنے لگا لیکن آسانی سے ٹوٹا ہی نہیں۔ عورتوں پر پلٹو فطرتاً ہی بے
رحم ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے عورت کے سینے کو داب کر دوسرے ہاتھ سے ہار
کو کھینچنے لگا۔ ہار ٹوٹا، تو عورت کے گلے سے ایک ایسی چیخ نکلی جیسے اس کی جان
نکلی جا رہی ہو۔ جسمانی تکلیف سے یا ہار کے لٹ جانے سے ــــ!

سب کچھ ٹھیک سلامت کر نہیں سکا ہے۔ لیکن پھر کچھ لوگ کے ہتھے لگنے کی جلدی ہی نہیں ہے۔ دوسرے فریق کا انتخاب کر کے ڈھوا اور بڈھو اس کے سینے پر چھری رکھ کر ان کے پینٹ کھلوا رہے ہیں۔ یہ محض تماشہ نہیں ہے۔ ایک ایک پینٹ کی قیمت ۱۰۰۰ روپے ضرور ہوگی۔ ہو کر ٹریلین کے ہیں۔ ایک نے پینٹ اور شرٹ دونوں اتار دیئے۔ دوسرا زیادہ شرمیلا ہے۔ وہ کسی طرح پینٹ کھولنا نہیں چاہتا۔ بڈھو کا مزاج بگڑ گیا اور اس نے چھرا اس کے پیٹ میں گھسا دیا ——— شرم کی قیمت ———!

خون دیکھنے کے ساتھ ساتھ کمپارٹ کا منظر بدل گیا۔ اتنی دیر تک سب خاموش تھے۔ اب خوف سے چلانے لگے۔ یہ لوگ بھی اب جلدی سے سامان سمیٹ کر تیار ہو گئے۔ ٹرین تب بھی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ وہ لوگ کود کر نیچے اتر گئے اور کمرے میں سے چلانے کی آوازیں کئی گنا تیز ہو گئیں۔

اس کے بعد بم پھینکنے کی ذمہ داری بڈھو پر ہے۔ بھاگتے بھاگتے تھیلے میں سے بم نکال نکال کر اس نے ایک ایک کر کے تین بم پھینکے۔ ریل رک گئی۔ چند پولیس والے پھرتی سے ادھر ادھر دوڑنے لگے ..... صرف اس کمپارٹ کو چھوڑ کر جس میں ڈکیتی ہوئی تھی، وہ دیگر ڈبوں کے قریب گئے، دوڑے اور پھر پلٹو وغیرہ جس طرف بھاگے تھے۔ یہ پولیس والے ٹھیک الٹی طرف، مخالف سمت میں دوڑے ——— شاید سنسان اندھیرے کی تلاش میں ———!

پری جیپ لے کر انتظار کر رہی تھی۔ وہ لوگ سوار ہوتے ہی پوچھی۔ مال وال کیسا ہوا ——— اچھا ———؟

پلٹو بولا ——— "برا نہیں چل ———"

جیسے رس گلے کا رس ہو، بالکل اسی انداز میں پلٹو نے بڈھو سے کہا۔ اے

تیرے ہاتھ میں خون لگا ہے، میرے کپڑے میں مت لگا۔

جیپ دوڑ رہی ہے صاف صاف پروگرام۔ اس سے قبل کے دو پروگرام بھی اسی طرح کامیاب رہے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد ہی دیکھا گیا کہ دو اور جیپ ان کا پیچھا کر رہے ہیں ——— ایسی بات تو نہیں تھی ——!

پری بے فکر ہے۔ جیپ کافی آگے ہے لہٰذا ڈرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ کچھ دیر ریس چلنے پر پری بولی ——"استاد سامنے کے چک پوسٹ پر نمبر ہے۔ گاڑی سلو کرنی پڑے گی۔"

پلٹو گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کر کے بولا ——"دیکھ تو اس جیپ میں او۔سی ہے کیا۔؟ اگر او۔سی۔ ہو تو ——"

ڈبو اتنی دیر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں دوربین کی طرح دور کی چیزیں کو سامنے کھینچ لاتی ہیں۔ اب اس نے کہا ——"پولیس ہے ملٹری ہے۔"

ملٹری سے ریس کرنا بے معنی ہے۔ اس کے علاوہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ملٹری ان کا پیچھا نہیں کر رہی ہے۔ وہ سائڈ دیں تو چلے جائیں گے۔ ذرا آگے دائیں طرف ایک پتلی گلی ہے، اس گلی میں موڑنا ہو تو جیپ کی رفتار کو کم کرنی ہوگی۔

پلٹو بولا ——"سائڈ کر، پری سائڈ لگا ——"

لیکن رفتار کم ہوتے ہی اس گاڑی سے گولیوں کی ایک بوچھار آئی اور کوئی راستہ نہیں ہے ——قسمت کا پھیر ——ہو سکتا ہے کہ اس علاقے میں کرفیو لگا ہوا ہو، اور ملٹری اتری ہو۔ ہو سکتا ہے کہ پالیٹکس کے کرداروں نے اس [illegible]

آفت آگئی ہے۔

اچانک بریک دبا کر جیپ روک کر تیری ایک چھلانگ لگا کر اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ وہ اتنی پھرتی سے غائب ہوگئی کہ اس کے ساتھی تک لمحہ بھر پہلے اس کے ارادے کو بھانپ نہ پائے تھے۔ ڈبو بھی اتر پڑا۔ پنٹو کے ہاتھ میں پستول ہے۔ لیکن اس سے ملٹری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بھاگنے کے لیے پنٹو اور بڈھو راستے پر کم پھیلنے لگے۔

دوڑ کر وہ بہت دور نکل آئے تھے لیکن ملٹری بھی گاڑیوں سے اتر کر ان کا پیچھا کرنے لگے۔ بیٹھ پر گولی لگنے سے بڈھو منہ کے بل گرا۔ پنٹو ایک موٹے پیپل کے درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا۔ ابھی بھاگا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک آدمی بڈھو کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ بدلہ لیے بغیر بھاگ جانا پنٹو کی فطرت نہیں ہے۔ اگر بڈھو ابھی زندہ ہو تو ——————

بوٹ سے جس ملٹری والے نے بڈھو کے جسم کو دھکا دیا تھا، پنٹو نے ایک ایک کر کے تین گولیاں چلا کر اس کے بدن کو چھلنی کر دیا۔ اس کے بعد کہیں سے ایک گولی اس کے دائیں بازو میں آ لگی۔

پنٹو کے ٹولی کی بدقسمتی —————— وہ فوجی افسران نے دو جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔ ٹرین سے چند مسافر اتر کر فوجی افسران کے جیپ کو روک کر ان کو ڈکیتی کی اطلاع دی تھی اور اسی لیے ملٹری نے ان کا پیچھا کیا تھا۔

گولی لگنے سے پنٹو زمین پر گر پڑا اور پھر ساتھ اٹھ کر بھاگنے لگا۔ لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا گردن دبوچ لیا۔

بازو کے زخم سے پنٹو تب نڈھال تھا۔ پگلے کتے کی طرح پلٹ کر چھرا نکالنے سے پہلے ہی ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ پھر بھی سنبھل کر پنٹو بولا ——————

"سادھن بھیا ــــ!"

فوجی افسر نے سوال کیا ــــ "کون ــــ؟"

"سادھن بھیا، میں پلٹو ہوں پلٹو، چھوڑ دیجئے ــــ"

"کون پلٹو ؟"

ہاتھ ذرا سے ہلکا ہوا تھا۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو چھڑا کر پلٹو بھیڑ سے بھاگ۔ بھاگنے سے پہلے پلٹو اپنے مقابل والے کے منہ پر اپنے سر سے ایک دھکا اور ایک موٹی سی گالی ہی دے پایا تھا۔ اب کی بار اسے اور کوئی پکڑ نہ پائے گا ــــ

پیچھے سے آواز آئی ــــ "بالٹ ــــ گولی چلا دوں گا ــــ"

پلٹو اور رکنے والا۔ اس کے دونوں قدموں میں ابھی دم ہے۔ اس نے بڈھو کو مارنے کا بدلہ لے لیا ہے۔ اسے اب اور کوئی فکر نہیں ہے۔

پھر سے آواز آئی ــــ "بالٹ ــــ ٹھہرو ــــ"

پلٹو کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اسٹین گن کی گولیوں سے اس کا جسم چھلنی ہو گیا تھا۔ ایک لفظ بھی وہ نکال نہ سکا۔ جسم زمین پر گر جانے سے پہلے ہی وہ آخری سانس لے چکا تھا۔

۲

"کیا پلٹو، تیری خبر کیا ہے ــــ"؟

"سادھن بھیا، میری ماں مر گئی ــــ"

"ارے ــــ کب ؟ ــــ اِش ــــ"!

[illegible] ہوا۔

"تجھے اتنا ہوا سر دیکھ کر میں یہی سوچ رہا تھا پہلے تجھے ٹھیک پہچان نہ سکا کیا ہوا تھا ——؟"

"کچھ نہیں۔ بس سردی بخار وغیرہ۔ اصل میں ہمدرد احمد تھا ——"

"اچھا۔ خبر تک نہیں لی۔ تیری ماں مجھے بہت چاہتی تھی۔"

"تم لوگ تو ملتے ہی نہیں تھے ——"

"ہاں ہم تو اب دلی میں رہتے ہیں۔ تم لوگ اب کہاں رہتے ہو۔؟ تیرا باپ، وہ تو یقیناً زندہ ہیں ——؟"

"ہاں۔ بابا نے کمرہ دا میں ایک چھوٹی دکان کر لی ہے۔ ہم لوگ وہیں رہتے ہیں۔"

"تیری صورت ایسی بگڑی بگڑی کیوں ہے۔؟ پڑھا لکھا اور نہیں کیا ——؟"

پنکو شرما گیا۔ سر جھکا کر بولا —— "مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ دماغ نہیں ہے۔"

سادھن مسکراتے ہوئے بولا —— "دیکھ تو رہا ہوں کہ دماغ خوب ہے۔ اسکول فائنل میں کتنی بار فیل ہوا؟"

"دو بار ——"

"بار بار تین بار۔ نہیں ہوگا کیا ——؟"

"تم تو جانتے ہو سادھن بھیا۔ ماں نہیں ہے۔ باپ مجھے اور نہیں پڑھائے گا۔"

"تو تو اب کیا کرے گا ——؟"

"کوئی نوکری وکری دیکھنا ہوگا۔ موٹر ڈرائیونگ سیکھ رہا ہوں۔ اگر ڈرائیور کی نوکری ملے تو ——"

"اس عمر میں تجھے نوکری کون دے گا؟ تم نے غلطی کیا ہے۔ بیٹا!"

"ایس :"

"ہاں ہو گیا۔ ؟ خدا میری کرے کیا کرے گا دیکھ اگر کسی کل کا نہ نے میں گھس سکا تو ——"

"تمہاری تو کئی جگہ جان پہچان ہے۔ میرے لیے ذرا کوشش کرو نا ——"

"اچھا دیکھوں گا۔ آج کل نوکری چاکری کا بازار بہت تنگ ہے ——"

"تم کیا پھر دلی لوٹ جاؤ گے ——؟"

"ہاں اب ایک ماہ چھٹی ہے۔ جانتا ہے نا اب میں آرمی میں ہوں ——!"

"جانتا ہوں۔ تم لوگ ابھی اس خوہر پوکھر کے مکان میں ہو نا ——؟"

ہاں ہو میں —— آنا ایک دن —— چلتا ہوں ——"

ٹھہرو تو۔ بہت دن بعد تمہیں دیکھا ——"

چل چائے پی جائے ——"

سادھن، پنٹو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر قریب کے چائے خانہ کی طرف بڑھا۔ جاتے جاتے دلی محبت کے جذبات سے وہ بولا —— "تیری ماں مر گئی سن کر میرا دل بہت اداس ہو گیا۔ وہ مجھے کتنا چاہتی تھی۔ میری ماں کو بھی یہ سن کر بہت دکھ ہوگا ——"

۳

"ماں —— وہ دیکھو، سادھن بھیا :"

"کہاں —— ؟ ارے وہ۔ ٹھیک ہی تو ہے :"

"بلا دوں ——؟"

"جاؤ جاؤ ——"

"او سادھن بھیا۔ سادھن بھیا۔ مجھے پہچانتے ہو ——؟"

"کون ——؟"

"میں پنٹو ——"

"ارے پنٹو۔ تجھے پہچان ہی نہیں سکا کتنا بڑا ہو گیا ہے ——"

"واہ۔ تم بھی تو بڑے ہو گئے۔ چلو، ماں وہاں کھڑی ہیں!"

"اچھا —— چل، مل کر آؤں۔"

سادھن آکر پنٹو کی ماں کو پرنام کیا۔ ماں نے آشیرواد دی —— "جیو بابا جیو۔ خوش رہو کتنے دنوں بعد تجھے دیکھا ——!"

سادھن بولا —— "ہاں چاچی۔ بہت دنوں بعد۔ پنٹو کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ پہچان نہیں سکا۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے —— تو کون سے کلاس میں ہے رہے پنٹو ——؟"

"ساتواں —— دیش بندھو ودیالیہ میں۔"

ماں پوچھی —— "سادھن۔ اب تو کیا پڑھ رہا ہے ——؟"

"میں نے آئی۔ اے۔ سی۔ دیا ہے۔"

"خوب۔ اور بھی پڑھو۔ ماں باپ کا سر اونچا کرو۔ یہاں اچانک کیسے آئے؟"

"دوستوں کے ساتھ مرشد آباد گھومنے آیا ہوں۔ اسی بہرم پور اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں ہم لوگ ——"

"ہوٹل میں —— کیوں؟ تم ہمارے گھر میں رہو گے۔ چلو ——"

"نہیں چاچی۔ دوستوں کے ساتھ آیا ہوں۔ اس کے علاوہ ہم لوگ کل ہی چلے جائیں گے۔"

"تیری ماں کیسی ہے؟ کلکتے میں تم لوگ کہاں رہتے ہو ـــــ؟"

"ہم لوگوں نے منوہر پوکھر میں ایک گھر خریدا ہے۔ ایک دن آئیے نا چاچی۔ ماں بہت خوش ہوگی۔ ماں سے آپ لوگوں کی بات کہوں گا ـــــ"

"اور میں گئی۔ ماں سے آپ لوگوں کی وہ تو بیمار ہیں ـــــ"

"کیوں پلٹو نہیں لے جا سکتا۔ ارے پلٹو تو ٹرین میں سوار ہو کر نہیں جا سکے گا۔ سیالدہ اتر کر بس نمبر ۸، بی۔ پر سوار ہونا ـــــ"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں ـــــ"

"ماں بولی، چل سادھن۔ ذرا ہمارے گھر میں بیٹھ، چل۔ قریب ہی ہے۔ اتنے دنوں بعد تجھے دیکھی ـــــ"

"چاچی ذرا ٹھہریئے، میں دوستوں کو کہہ آتا ہوں ـــــ"

دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو کر ماں بولی ـــــ "بیٹھو۔ اس پلنگ پر۔ ارے، رہنے دو۔ جوتے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی جو حالت ہے۔ لوگ آئے تو شرم آتی ہے۔ ہاں تم سے شرم کی کوئی بات نہیں۔ جب دیش میں تھے تب تیری ماں سے دوستی تھی۔ ان کے گھر جو کچھ پکتا تو مجھے دیئے بغیر نہیں جاتی تھی۔ میں بھی پکا کر ـــــ"

"ہاں چاچی، مجھے یاد ہے ـــــ"

"تیری بہن چندنا کی شادی ہو گئی ـــــ؟"

"ہو گئی۔ دیدی بھی اب دلی میں رہتی ہے۔ جمائی بابو سنٹرل گورنمنٹ میں ہیں ـــــ"

"اچھا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ خوش رہے۔ اور تیرا چھوٹا بھائی تاتن ـــــ وہ دارجلنگ میں پڑھتا ہے ـــــ جھرنا بہن کہاں ہے چاچی ـــــ؟"

"بھتیجا تو زسنگ میں ہے۔ ٹریننگ پاس ہو جائے تو شاید کہیں کام ہے۔ شادی وادی نہیں ہو سکی ــــ ہو گی کیسے گھر میں کوئی کمانا تو ہے نہیں۔ تمہارے چاچا بیمار ہیں۔ کھانسی کی آواز سن رہے ہیں نا کھانسی اور دمہ کو خطرہ"

"تم نے کسی کو نہیں دکھایا ــــ"

"ہسپتال لے گئی تھی۔ وہ لوگ وہاں بھرتی ہونے کو کہتے ہیں۔ لیکن بھرتی ہونا کیا آسان ہے"

"چاچی آپ کی صحت بھی تو گر گئی ہے پہلے آپ کتنی اچھی تھیں ــــ!"

"نہیں، نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں اچھی ہوں ــــ"

"اچھا تو میں اب چلوں؟ دوست انتظار کر رہے ہیں۔ پلٹو کہاں گیا ــــ؟"

"بیٹھو اور ذرا۔ تجھے اتنے دنوں کے بعد دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ تم سب لوگ خوش ہو، جان کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ کیسے کہوں ــــ"

"اے پلٹو۔ کہاں گیا تھا۔ یہ کیا چاچی۔ آپ نے یہ سب کچھ کیوں منگوایا؟"

"نہیں ــــ نہیں ــــ"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں، صرف ذرا سی مٹھائی۔ اتنے دنوں بعد دیکھی۔ تو نے مجھے پرنام کیا اور میں تیرا منہ میٹھا بھی نہیں کراؤں ــــ؟"

"گاؤں میں رہتے وقت جب بھی آپ کے گھر جاتا تھا، کیا کیا کھاتا تھا۔ مجھے سب یاد ہے ــــ"

"اور وہ سب باتیں ....."

اے پلٹو، تیرا گال کیسے کٹ گیا رے ــــ؟"

پلٹو جیسے اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک بار ماں کی طرف اور ایک بار سادھن کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد مجبوراً بولا ــــ "کل گر پڑا تھا ــــ"

پنکو کی ماں روتی آنکھوں میں آنچل داب کر بولی ــــ نہیں گرا نہیں تو کیا
کتنا بے رحم ہوتا ہے۔ قریب ہی ایک گھر میں پتھر کھینچے جاتا ہے۔ دور نہیں ہیں
ہے کہ ہمارا بیاں کچھ نہیں ہے لیکن ہمارا بیٹا بھی تو بیٹا ہے۔ کیا اس کے ماں باپ
کے دل کو نہیں لگے گی ــــ؟ وہاں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا کہتے ہیں کہ پنکو کے ہاتھ
سے دھکا لگ کر ایک قیمتی پھولدان گر کر ٹوٹ گیا۔ ہو سکتا ہے ٹوٹا ہو لیکن وہ
تو بچہ ہے۔ کیا اس نے جان بوجھ کر توڑا ہے ــــ؟ ان کے بیٹے کا ہاتھ لگ کر
بھی تو ٹوٹ سکتا تھا۔ اس کے لیے کون مارتا ہے ــــ؟ دیکھو کیا مارا ــــ کرتے
میں خون لگا روتے روتے جب وہ گھر لوٹا، تب میرے دل میں ..... میں
کاغذ کے ٹھونگے بنا بنا کر بیچتی ہوں۔ کتنی محنت کر کے اسے پڑھا رہی ہوں .....
ہی تاکہ اگر آدمی بنا سکوں تو ایک دن ہمارے دکھ دور ہوں گے ــــ"

۴

پانچ برس کا لڑکا اچھلتے کودتے ہوئے آکر بولا ــــ "ماں، تم نے
سادھن کو میٹھا چاول دیا ہے۔ مجھے نہیں ــــ"

ہی ــــ پگلو، سادھن نہیں، سادھن دادا بولنا، تجھ سے بڑا ہے ــــ"

تم نے سادھن دادا کو پہلے کھیر دیا۔ مجھے نہیں ــــ"

لمبے برآمدے میں کارپٹ کے آسن پر خوب جم کر بیٹھا ہوا ہے آٹھ سال کا
ایک لڑکا ــــ سادھن ــــ اور کھیر کھانے میں مشغول ہے۔

ماں بولی ــــ دیتی ہوں، جا پہلے منہ ہاتھ دھو آ ــــ

پنکو کودتا ہوا ہاتھ دھونے گیا۔ ماں سادھن سے پوچھی ــــ "اور دو

لے اور دو بچے ـــــ ناریل کے لڈو بھی لے ـــــ واہ، کتنا اچھا لڑکا ہے بڑوں کی بات سنتا ہے ـــــ"

پلٹو بھی آکر سادھن کی دیکھا دیکھی جم کر بیٹھ گیا۔ بولا ـــــ "مجھے بھی سادھن دا کی طرح لڈو دو ـــــ"

تو نے تو صبح بھی کھایا ہے۔ درد ہوگا پیٹ میں۔"

نہیں ـــــ مجھے بھی دو ـــــ"

اچھا جلدی سے کھالو۔ پھر دونوں کھیلنے جانا۔ جھگڑنا نہیں۔ سمجھے ـــــ"

سادھن کھیر کھا کر اٹھا۔ پلٹو کی ماں نے اس کا منہ دھلوا کر تولیے سے پونچھ دیا۔ سادھن کے ناک سے بہہ رہی تھی وہ بھی صاف کی۔ اس کے بعد پلٹو کا منہ دھلوا کر بولی ـــــ جاؤ ـــــ کھیلنے جاؤ۔

اتنے میں سادھن کے ماں باپ آگئے۔ وہ لوگ ایک اور پڑوسی کے گھر گئے تھے۔ سادھن کی ماں سادھن سے بولی ـــــ چل اب گھر چلیں۔ پلٹو کی ماں بولی ـــــ اتنی جلدی کیا، بیٹھو۔ بچوں کو تک تک کھیلنے دو ـــــ"

سادھن کی ماں نے پلٹو کو پکڑ کر گود میں لینے کی کوشش کی لیکن پلٹو کود کر دور ہٹ گیا۔ سادھن کی ماں بولی ـــــ "کتنا، تیرا بیٹا کتنا سندر ہے سر پر گھنے بال، بڑی بڑی آنکھیں ـــــ"

پلٹو کی ماں مسکرا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی۔ سادھن اور پلٹو کھیلنے چلے گئے۔

ندی کے کنارے اونچا باندھ۔ موسم برسات۔ کچھ دیر پہلے پانی برس چکا ہے۔ آسمان نے دھرتی کو دھو کر صاف کیا ہے۔ دوب پر اب بھی بوندیں پانی ہے۔ شام کی ٹھنڈی، ٹھنڈی، بھیگی بھیگی ہوا چل رہی ہے۔ ایسے میں دو

بچے کھیل رہے ہیں۔

ایک کدم پھول کے درخت پر بے شمار پھول کھلے ہیں۔ لیکن پھول اوپر کی شاخوں پر ہیں، جہاں تک بچوں کا ہاتھ پہنچ نہیں سکتا۔ اچک اچک کر بھی نہیں۔

پنٹو بولا ــــ "سادھن دادا، تم درخت پر چڑھ سکتے ہو ــــ؟"

سادھن نے بزرگوں کی طرح کہا ــــ "برسات کے دنوں میں درخت پر چڑھنا نہیں چاہیے۔ درخت پر سانپ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے سانپ ــــ"

"میں نے سانپ دیکھا ہے۔ تم نے دیکھا ــــ؟"

"بہت ــــ!"

"کدم پھول کے درخت پر سانپ نہیں ہوتے ــــ"

"ہاں ــــ تجھے کس نے کہا۔ بڑا آیا جاننے والا ــــ"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ دیدی اور میں ایک دن اس درخت پر چڑھے تھے ــــ"

"جا ــــ جھوٹا کہیں کا ــــ!"

"سچ۔ دیکھو گے۔ پھر سے چڑھوں ــــ؟"

"چاچی سے بولوں گا۔ بھگا درخت ہے ــــ آ ــــ آنکھ مچولی کھیلیں ــــ"

کچھ دیر بعد پنٹو بھاگتا بھاگتا گھر میں گھس کر بولا ــــ "ماں۔ سادھن بھیا نے مجھے مارا ــــ"

سادھن کی ماں بولی ــــ "مارا۔ تجھے۔؟ بلاؤ سادھن کو۔ ابھی ڈانٹتی ہوں ــــ آؤ۔ اچھے بیٹے ــــ کہاں لگی ہے چوٹ۔؟ پیار کروں... تھوڑا سا یا بہت بہت ــــ!"

پنٹو بولا ــــ "تھوڑا"

پنکو کی ماں بولی ــــ جاؤ، کھیتے کھیتے شکایت نہیں کرتے۔ کھیلنے میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ جاؤ ــــ کھیلو۔

آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے سادھن، پنٹو کو تلاش کرنے پاتا ہی نہیں۔ نہایت احتیاط سے ندی کے باندھ سے جھک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے پنٹو۔

ڈر کر سادھن چلا اٹھا ــــ "اے پنٹو، کہاں گیا، ــــ پنٹو ــــ ٹو... ٹو..... ٹو....."

بالکل قریب سے آواز آئی ــــ "ای ــــ ہاں"

سادھن اطراف دیکھنے لگا۔ لیکن کہیں دیکھ نہ پایا۔

کدم پھول کے درخت پر، پھولوں کے درمیان، پنٹو چھپا بیٹھا ہے۔ ہلکی ریک آواز میں بول اٹھا ــــ "ای ــ ہاں ــــ ٹو کی ــــ مجھے پکڑ نہیں سکتے ــــ تم مجھے پکڑ نہیں سکتے ــــ"

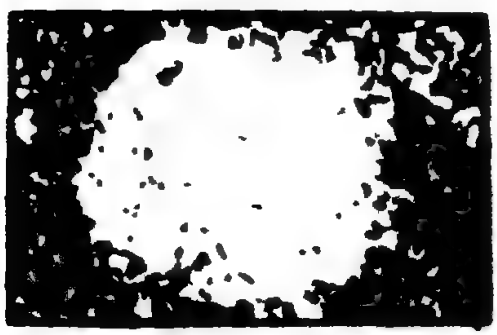

خوف

ترجمہ: نصر ملک

ٹوڈ ٹیلیوسن

یہ کہانی ڈنمارک کی مشہور و معروف ادیبہ شاعرہ اور رومانی ٹوڈ ٹیلیوسن کی عمدہ کہانیوں میں شمار ہوتی ہے اور میرے خیال میں انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے بعد اردو میں پہلی بار میں نے ہی اس کا ترجمہ کیا ہے دیگر زبانوں میں اس کے ترجمے بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں اور مختلف لوگوں نے کیے ہیں۔ موصوفہ نے سن ۱۹۱۸ میں کوپن ہیگن کے غریب ترین علاقے میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہیں وہ بڑی ہوئیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۹ میں شائع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈینش ادبی آسمان پر چھا گئیں۔ ان کی کہانیوں اور نظموں کے کئی مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور مقبول عام ہوئے۔ ان کا ناول "زہر" انہیں شہرت دوام بخش گیا۔ وہ اس پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں ابھرنے والی "یورپی مادر پدر آزادی کی تحریک" کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھنے میں مشہور تھیں۔ افسوس انہوں نے ۱۹۷۶ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

مترجم ——

آج صبح گھر سے نکلتے وقت بڑا بابو جارج بہت خوش تھا اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اپنا بیگ بغل میں دبایا اور بڑے خوشگوار موڈ میں گلی سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے جان پہچان والے چند ایک ہی ملے جنہیں اس نے نہایت ادب سے ہاتھ ہلا کر سلام کیا حسب عادت وہ آج بھی بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ گھروں میں صبح سویرے دیر تک سونے والے لوگ گلیوں میں اخبار یا دودھ فروخت کرنے والوں کی ہی نہیں بلکہ ٹھیلے والے لوگوں کے جوتوں تک کی آواز پسند نہیں کرتے اور پھر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو بتلاتے رہتے تھے کہ "وہ ہے صبح سویرے چین کی نیند خراب کرنے والا" بڑا بابو جارج یقیناً کسی کی بھی نیند خراب کرنے والا "بدامن شہری" نہیں تھا ــــ وہ تو کسی کو بھی تکلیف نہیں دیتا تھا وہ تو محض اپنے کام سے کام رکھتا تھا کام کرنا ــــ تنخواہ لینا اور اس میں سے باقاعدہ ٹیکس ادا کرنا اور کسی بھی وجہ سے اڑوس پڑوس میں گھروں بنگلوں اور کوٹھیوں کے دروازوں کھڑکیوں کے قریب تک نہ جانا اس کا ایک طرز اصول تھا وہ لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان کرنے کے قطعاً حق میں نہیں تھا۔ بڑی بڑی کاروں اور عالی شان بنگلوں اور موٹی توندوں والے ڈائریکٹروں کو صبح سویرے ان کی نیند سے

وہ بدمزا کیوں کرے ـــــ یہ وقت تو ان کے آرام کے لیے مخصوص ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ میں اسی وقت ہزاروں دوسرے لوگوں کی طرح بڑے بابو جارج کو انہیں کے آرام کی خاطر کام پر جانا ہوتا ہے۔ اپنے انہی خیالات میں گم لیکن ساتھ ہی غیر ارادی طور پر محتاط جارج بابو تنگ گلی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر صبح کی سرمئی نیم روشنی میں جو دیکھا تو حیران رہ گیا کچھ لوگ فٹ پاتھ پر سوئے پڑے تھے ـــــ "اوہ اچھا ـــــ وہ بھی تو انسان ہی ہیں ـــــ اپنی صبح سو کر گزارنا چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے گزاریں آخر انہیں بھی تو اس کا حق حاصل ہے" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

بڑے بابو نے سامنے گرجا گھر کی دیوار پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے معمول سے لیٹ ہو رہا تھا اس نے اب اپنی رفتار تیز کر دی۔ گلی کے کونے پر اس کی مڈھ بھیڑ نیلسن موچی سے ہوئی جو اپنے کام پر جا رہا تھا۔ جارج بابو نے ہر روز کی طرح حسب معمول اپنا ہیٹ چھو کر اسے بھی سلام کیا لیکن نیلسن موچی اس کا جواب دیے بغیر اس کے قریب سے یوں گزر گیا گویا اس نے بڑے بابو کو دیکھا ہی نہ ہو ـــــ بڑے بابو پہلے تو قدرے حیران ہوا پھر اس نے سر جھٹک کر خود سے سرگوشی کی ـــــ شاید نیلسن آج جلدی میں ہو ـــــ نہیں ممکن ہے وہ بھی میری ہی طرح اپنی سوچ میں گم ہو گا بعض لوگ اپنی سوچوں میں یوں کھو جاتے ہیں کہ وہ راہ چلتے ہوئے دوسرے افراد کی موجودگی محسوس ہی نہیں کرتے" جارج بابو کا موڈ قدرے خراب ہو گیا تھا ـــــ "آخر نیلسن نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا ـــــ اس نے مجھے دیکھا تو ضرور ہو گا ہر صبح ہماری ملاقات اسی وقت اسی جگہ ہی تو ہوتی ہے اور پھر میں اپنے جوتوں کی مرمت بھی تو ہمیشہ اسی کی ہی دکان سے کراتا ہوں ـــــ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے ـــــ اس نے جان بوجھ کر میرے سلام کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ جارج ابھی تک نیلسن موچی کے بارے میں سوچ رہا تھا ـــــ "نہیں ـــــ وہ شاید کسی اور طرف متوجہ تھا تبھی تو مجھے دیکھ نہیں سکا

ہوگا" جارج بابو چلتے چلتے سوچتا جا رہا تھا۔ نیلسن شاید اب اپنی دکان پر پہنچ گیا ہوگا۔ اپنے کسی ایسے گاہک کو جو اس کے ہاں جوتا پالش کرانے آیا ہوگا یہ بتا رہا ہوگا ——— "بڑے بابو جارج نے آج ابھی صبح جب مجھے اپنا ہیٹ چھو کر سلام کیا تو میں اسے خاطر میں لائے بغیر سیدھا دیکھتا اس کے قریب سے گزر گیا ——— نہیں بھئی میں تو بڑے بابو کے پھلوں کے قریب تر تھا لیکن میں نے اسے اہمیت ہی نہیں دی ——— جارج بابو نے لمبا سانس لیا اور سوچا "کہتا ہے تو کہتا پھرے ——— آخر نیلسن اور کر ہی کیا سکتا ہے وہ میرا کوئی ایسا پھلو یا معاملہ تو جانتا ہی نہیں جس پر وہ میرے بارے میں بات آگے بڑھا سکتا ہو یا پھر کسی افواہ کی بنیاد رکھ سکے۔"

جارج بابو اپنے مکان کی قسطیں ادا کر چکا تھا۔ اس کی بیوی بر گیتے اس سے پیار کرتی تھی۔ بچے مناسب تعلیم و تربیت کے ساتھ جوان ہو چکے تھے اس کے بارے میں کوئی اگر انگلی اٹھاتا بھی تو کیوں؟ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں یہ وقت ہی ایسا تھا کہ کسی ایک کے بارے میں کسی دوسرے کا ایک لفظ ہی اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ جارج بابو کے بارے میں ایک بات واضح تھی کہ اس کا اپنا نقطۂ نظر اور سیاسی مسلک کیا ہے اور اس کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں۔ جارج بابو نے اس بارے میں خود ہی واضح کر دیا تھا اور یہاں تک کہ نیلسن موچی کی دکان پر بیٹھنے اور کسی قسم کا سیاسی اثر و رسوخ نہ رکھنے والے افراد بھی جارج کی زبانی اس کے اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں متعدد بار سن چکے تھے کہ "وہ تو محض اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور بس!" جارج بابو کی رفتار میں اب مزید تیزی آگئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں خیال ابھرا "ہو نہ ہو نیلسن موچی دوسری پارٹی سے تعلق رکھتا ہوگا" اب تو جارج بابو انہی سوچ میں یوں گم ہو گیا کہ اسے اپنی بھی خبر نہ رہی ——— "مجھے اپنے بارے کم از کم اس موچی کی دکان پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی کہ میرا سیاسی نظریہ کیا ہے اور میں اپنے کن کاموں سے کام رکھتا ہوں" جارج اب

بات کے تیز حملے سے بچا جا رہا تھا شاید اب وہ میرے گھر کا مقدمہ
ہو جائیں گے ـــــ میری بیوی برگیتے نے اپنا ہاتھ کاٹن پہنے ہی پہنے دروازہ کھولا
ا ـــــ وہ برگیتے کو وضاحت کا موقع دیے بغیر اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے گھر
ا داخل ہو چکے ہوں گے ـــــ ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے برگیتے پر اپنا ریوالور بھی
ا رکھا ہو شاید انھوں نے اس کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو ـــــ جارج بابو
سل سوچے جا رہا تھا ـــــ "ہم تمہارے خاوند کو تلاش کر رہے ہیں ـــــ دیکھو!
ں بذاتِ خود گھبرانے کی ضرورت نہیں ـــــ بتاؤ وہ کمینہ جارج کدھر ہے
معاملہ تمہارے خاوند ہی سے متعلق ہے" وہ بک رہے ہوں گے۔!

جارج بابو اب ریل گاڑی بیٹھا پینے سے شرابور ہو رہا تھا اس کے ہاتھ اتنے
پ رہے تھے کہ وہ اپنا اخبار تک نہیں کھول سکا تھا ـــــ یقیناً یہ ایک اہم معاملہ
ور جارج کے لیے ایک منحوس واقعہ بھی ـــــ لیکن یہ کوئی غیر سیاسی معاملہ بھی
سکتا تھا جس میں اتنا خطرہ بھی نہ ہو ـــــ شاید یہ محض اس کی اسی طرح کی سوچ ہو
طرح وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سوچنے لگ جاتا ہے۔
یہاں اس شہر میں تو اب تک کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا ـــــ ایک
رے سے سیاسی گفتگو کے باوجود سب خیریت ہوتی اور رہتی تھی۔ وہ جب اس
ں میں منتقل ہوا تھا تو سبھی محلے والوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا ـــــ اس کی
جلد ہی تمام دکانداروں کو پہچاننے لگی تھی اور وہ بھی اسے ایک خوش مزاج خاتون
ے تھے اس کے بچوں نے کئی دوسرے بچوں کو جلد ہی دوست بنا لیا تھا ان میں
بچے بھی تھے جن کے والدین بڑی بڑی کاروں، کوٹھیوں اور بنگلوں کے ساتھ جائیدادوں
الک تھے" ـــــ جارج بابو نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا "شاید حالات معمول
جائیں گے ـــــ حکومت ہی تو بدلی ہے آخر ہمیں اخبار اسے [illegible]

پہلے ہی وہ سوچ رہا تھا ـــــ اس کے بچوں کے اپنے اپنے گھر ہوں گے وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اپنے معاشرے کے پروقار باعزت شہری ہوں گے ـ وہ اپنا آمدنی ٹیکس ادا کرتے ہوئے سرکار کے ہاں بھی باعزت سمجھے جائیں گے !

ریل گاڑی سے باہر نکل کر جارج بابو نے اسٹیشن کی گھڑی میں وقت دیکھا ـــــ اپنے دفتر وقت پر پہنچنے کے لیے اسے اب قدرے دوڑنا ہوگا اگر میں بروقت دفتر نہ پہنچ سکا تو لوگ خواہ مخواہ کی باتیں بنائیں گے ۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ کوئی سیکنڈ ہی کھڑا کر دیں ۔ اسے اپنے دفتر میں ہیڈ کلرک کا عہدہ سنبھالے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس سے پہلے مس ہنسن نے یہ عہدہ حاصل کرنے کے لیے بہت تگ و دو کی تھی ـــــ وہ تو ایک سفارش بھی لے آئی تھی ـــــ لیکن چونکہ ملازمت کے تجربے میں وہ جارج بابو سے ایک سال پیچھے تھی اس لیے وہ ہیڈ کلرک نہ بن سکی تھی ۔ دفتر میں مس ہنسن کے مقابلے میں اگر اسے یہ عہدہ نہ ملتا تو تمام عرصہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ شاید ہی وہ ہیڈ کلرک کی ذمہ داریاں نبھا سکے جارج بابو کو اب بھی یقین تھا کہ اس کی طرف سے دفتری ذمہ داریوں میں یا وقت کی پابندی میں ذرہ بھر بھی کوتاہی یا خیر ـــــ لوگوں کو باتیں بنانے اور اس کے بارے میں افواہیں پھیلانے کا موقع ضرور مہیا کر دے گی اور یقیناً ایسا کر کے وہ خوش ہوں گے ۔ خاص کر مس ہنسن کو اگر ایسا کوئی موقع ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کے بارے میں افواہیں پھیلانے اور صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں ہرگز پیچھے نہیں رہے گی ـــــ ممکن ہے کہ وہ اس کی دفتری بے قاعدگیوں کا ذکر نیسن موتی سے بھی کرے اور وہ دوسرے دکانداروں اور اپنے گاہکوں کے کانوں میں اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتا پھرے گا ـــــ آخر لوگ بات سے بات پیدا کرتے بال کی کھال اتارتے اور افواہوں کو ہوا دیتے پھیلاتے ہی تو ہیں !

جارج بابو ابھی تک تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرح سے دفتر کی طرف بھاگے جا رہا تھا "اف میرے خدا میں کن خیالات میں گھرا ہوا ہوں ـــــ یہ خوف مجھے کیوں بوچھے جا رہا ہے" اس نے لمحے بھر کے لیے رک کر سوچا اور بھول گیا کہ اس کے دائیں ہاتھ والی سڑک کونسی ہے اس نے سر کو جھٹکا دے کر اپنی رفتار قدرے تیز کر دی "کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے اس سڑک کا نام یاد ہو" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ لیکن اب وہ اپنے آپ پر غصہ ہو رہا تھا ـــــ سر پر پہنے ہوئے اپنے ہیٹ کو ہاتھ کا سہارا دے کر ہوا کے جھونکے سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اور دفتر وقت سے پہنچنے کا بھوت اس پر اب پوری قوت کے ساتھ سوار تھا۔ لیکن اپنے تحت الشعور میں جارج بابو ابھی تک پیچھے والی اسی سڑک کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی نام آ رہے تھے ـــــ شاہراہ آزادی ـــــ نہیں نہیں ـــــ وہ تو شہر کے بیچ ٹاؤن ہال کے دائیں طرف پڑتی ہے ـــــ آہا ـــــ وہ تو ـــــ خیابانِ جمہوریت تھی ـــــ ارے میں بھی کیا پاگل ہو گیا ہوں ـــــ یہ سڑک تو شہر میں داخل ہونے کے لیے ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ ابھی بنائی جا رہی ہے ـــــ ہاں اس سڑک کا نام ـــــ شاہراہِ ساحل تھا ـــــ یہ ہوئی نا بات! اسے اپنے آپ پر اعتماد آنے لگا تھا ـــــ وہ نیلسن موچی اگر مجھے سرِ راہ نہ ملتا تو اس کا کیا بگڑتا اور اگر اسے ملنا ہی تھا تو پھر اس نے میرے سلام کا جواب کیوں نہ دیا ـــــ وہ پھر خیالات میں بہنے لگا تھا ـــــ لیکن سڑک کا نام یاد کر کے وہ ایک طرح سے فوراً اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے اندر ہی اندر اپنے لیے ایک طرح سے تحفظ بھی محسوس کر رہا تھا اس سے پہلے جارج بابو خود کو ایسا غبارہ سمجھ رہا تھا جو کسی شریر بچے کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ بچہ کبھی تو اس میں ہوا بھرنے لگے اور ہوا بھر کر نکالنے لگے اور پھر یہ عمل مسلسل تب تک جاری رکھے تا آنکہ غبارہ پھٹ نہ جائے۔

جارج بابو، باہر گئے تھے جب دفتر پہنچا تو اس نے استقبالیہ کمرے میں مس ہنسن کو بال
پھاڑتے سے کھڑے کے قریب سامنے کھڑے اپنے بال سنوارتے ہوئے موجود پایا۔
"صبح بخیر" جارج نے قدرے دکھی آواز میں کہا اور سوچا کہ "یہ بڑھیا بھی ایسی تمک
حرام ہے اس کے لیے یہ کتنا تکلیف دہ ہوگا کہ وہ اپنی تمام زندگی ایک ہی دفتر میں کام کرتی
رہے ـــــ لیکن یہ عورت اب یہاں سے جا کر کہاں جا سکتی ہے؟ ـــــ یہ بھی اچھا ہی ہے
کہ اب وہ اس عمر میں ہے کم از کم کوئی یہ تو نہیں کہہ سکے گا کہ میں ایک دن اسے اپنی دلہن
بنا لوں گا ـــــ یا اس سے شادی کر لوں گا ـــــ چلو خدا نے مجھے اس بدنامی سے تو
محفوظ رکھا ہے" ـــــ جارج بابو اپنی اس عجیب و غریب سوچ پر خود حیران رہ گیا کہ
مس ہنسن کے بارے میں آج یہ خیال اس کے ذہن میں اچانک کیسے آ گیا۔ مس ہنسن
اگرچہ ملازمت کے تجربے میں اس سے ایک سال پیچھے تھی عمر کے لحاظ سے کچھ نہیں وہ
تو اس سے بیس برس آگے تھی ـــــ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کامیابی کے لیے محض تجربہ
ہی نہیں سرکاری دفتروں میں بعض اوقات عمر کا بھی کچھ حق سمجھ ہی لیا جاتا ہے
لیکن اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا کہ مس ہنسن دفتر میں ہیڈ کلرک نہ بن سکی تھی
اور دفتری ملازمین نے اس ذمہ داری کے لیے اسے ہی مناسب اور موزوں قرار دیا
تھا بلکہ ان ملازمین میں سے بعض کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ دراصل جارج پیدا ہی اس
منصب کے لیے ہوا تھا اور اکثر نے تو اسے "دیر آید درست آید" کا مقولہ یاد کراتے
ہوئے کہا کہ اس ملازمت کا وہی تو حقدار تھا ـــــ بس کچھ دیر ہو گئی یہ منصب اسے کہیں
پہلے مل جانا چاہیے تھا۔
"صبح بخیر ـــــ مسٹر جارج" مس ہنسن نے اپنے بالوں میں ربن لگاتے ہوئے
کہا اور وہ اپنے خیالات سے چونکا۔
"مسٹر کیوں ـــــ محض جارج کیوں نہیں کہتی ہو؟" وہ خیالات کے دلدل سے

کھل کر بولا۔

"اب آپ چونکہ ہیڈ کلرک بن چکے ہیں لہٰذا دفتری آداب کے تحت آپ کو اب مسٹر کہہ کر ہی مخاطب کیا جانا چاہیے ——— آپ اب مسٹر ہیں ——— مسٹر" مس ہنسن نے جواب دیا۔

غالباً وہ پہلے بھی جارج بابو کو مسٹر ہی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور دوسرے دفتری ملازمین کی طرح وہ اس کے ساتھ کوئی خاص بے تکلف بھی نہیں تھی لیکن آج تو نہ صرف اس کی آواز بلکہ لہجے میں بھی ایک نمایاں فرق واضح تھا۔

"انسانی بدباطنی بھی کبھی کبھی عداوت و مخاصمت بن جاتی ہے اور انسان جب سوچتا ہے کہ دھرتی پر وہ کتنے مختصر سے وقت کے لیے آیا ہے اور اسے اپنی حقیقی ہستی کے لیے بھی کچھ زیادہ درکار نہیں تو پھر دوستی دشمنی ہی اسے اس کی راہ دکھاتی ہے اور پھر وہ "زندہ رہنے دو اور زندہ رہو" کا اصول اپنا لیتا ہے۔"

جارج بابو اپنی عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے نہ جانے کن فلسفیانہ خیالات میں کھو چکا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے دوران ——— جارج بابو کے ایک شریک کار نے اسے ایک ایسے کلرک کی کہانی سنانا شروع کر دی جو ایک زرعی فارم پر ملازم تھا ——— وہ کلرک ہر روز صبح سویرے فارم پر آنے والے گوالوں سے دودھ خریدتا اور اسے شہر بھجوایا کرتا تھا ——— فارم پر دودھ فروخت کرنے والے گوالے بھی عجیب وضع کے لوگ ہوتے ہیں ——— جارج بابو ——— اور پھر جارج بابو کے دوست نے اس متذکرہ کلرک اور دیہاتی گوالوں کے بیچ ہر صبح ہونے والے مکالموں کی نقل اتارتے ہوئے کہنا شروع کیا ——— ہر صبح گوالے اس کلرک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے مسٹر فریڈرکسن ——— مسٹر فریڈرکسن کہہ کر مخاطب کرتے، تھکتے نہیں

تھے ـــــ وہ گوالے بھاپے، اس کلرک اپنے خالصتہً دیہاتی انداز فکر میں بتاتے کہ مسٹر فریڈرکسن ـــــ موسم بھی کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں ـــــ اب دیکھنا ـــــ موسم بہتر ہے تو ہم کتنے اچھے دن بسر کر رہے ہیں ـــــ ہمیں کچھ زیادہ تو درکار نہیں بس گزر بسر چاہیے ـــــ لیکن مسٹر فریڈرکسن ـــــ آپ یقین جانیے کہ خزاں کے موسم میں تو یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ مسٹر فریڈرکسن ـــــ یہ حقیقت ہے کہ خزاں میں ہمارے ساتھ ہمارے مویشیوں کا بھی بہت ہی برا حال ہوتا ہے ـــــ مسٹر فریڈرکسن ـــــ آپ جانتے ہی ہیں خزاں آخر خزاں ہے اس میں بہار کہاں سے آئے گی!

جارج بابو نے اپنے شریک کار کی کہانی بڑے اطمینان سے سنی اور جب اس کے شریک کار کو اپنی فتح کا احساس ہونے لگا تو اس نے بھرپور قہقہہ لگایا ـــــ اتنی تھوڑی سی دیر میں جارج بابو جو اب سنبھل چکے تھے ـــــ اپنے شریک کار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ـــــ "سنو ـــــ جانسن ـــــ کیا یہ سبھی دودھ فروش، دوکاندار اور اس قبیل کے لوگ ایسے ہی جیسے نہیں ہوتے؟ ـــــ مثلاً ـــــ جارج بابو نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میری گلی میں ایک موچی ہے ـــــ روزانہ کام پر آتے جاتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو گلی کے نکڑ پر ملا کرتے ہیں ـــــ میں ہمیشہ اپنا ہیٹ اتار کر اسے سلام کرتا ہوں بھی مجھے صبح بخیر کی دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے ـــــ کبھی کبھی ہم چلتے چلتے موسم پر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں ـــــ لیکن آج صبح تمہیں معلوم ہے کیا ہوا؟ جارج بابو نے اپنا پہلو بدلا ـــــ کافی کی چسکی لی اور پھر بولا" میں نے حسب معمول اپنا ہیٹ اتار کر اسے سلام کیا لیکن وہ موچی مجھے دیکھتا ہوا گردن اکڑائے سیدھا چلتا گیا ـــــ اب بتاؤ، تم اس کے رویے پر کیا کہو گے؟ جارج بابو کھانے کی میز پر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سبھی فنکار کار کی طرف سے اپنی کہانی پر داد کا طلب گار تھا ـــــ لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ان میں سے ایک دو محض ہلکا سا مسکرا کر رہ گئے اور

کچھ سے صرف اپنے شانے اچکا دیئے اور باقی تو گویا ایسے تھے جیسے انھوں نے جارج بابو کی بات سنی ہی نہیں تھی ـــــ انھیں اس بات پر ہرگز تعجب نہیں تھا کہ اس موچی نے جارج بابو کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا وہ بذاتِ خود جارج بابو اور اس کی عادتوں سے پوری طرح واقف تھے وہ جانتے تھے کہ جارج بابو کے بارے میں جو کچھ آج کل کہا اور سنا جا رہا تھا وہ اس موچی کو بھی معلوم ہی ہو گا۔ جارج بابو کے بارے میں اب ایسی باتوں کو پوشیدہ رکھنا مشکل تھا ـــــ وہ تو زبان زدِ عام تھیں ـــــ ہاں ان سے اگر اب تک کوئی آگاہ نہیں تھا تو وہ جارج بابو بذاتِ خود تھا ـــــ وہ ان باتوں میں حقیقت کی اصلیت سے تو خود بھی واقف نہیں تھے اور جارج بابو کے بارے میں اتنی سنگین افواہوں کے بارے میں خود سوچ بھی نہیں سکتے تھے ـــــ جارج بابو تو ایک مکھی تک نہیں مار سکتا تھا ـــــ اس نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی تھی ہاں وہ کسی اور کے ایسے مفاد میں جس میں کسی حد تک اس کا اپنا ہی فائدہ ہو اس کے لیے اپنا ذاتی نقطۂ نظر بدلنے کو عار نہیں سمجھتا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کی دلجوئی اور مدد کا زیادہ خیال رکھتا تھا جارج بابو ان کے نزدیک اس اصول پر کاربند تھا کہ بغیر وجہ کسی کو اپنے دشمنوں میں ہرگز اضافہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسے لوگوں کی ویسے بھی کمی نہیں ہوتی جو بغیر وجہ بتلائے کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

آج کل پورے ملک میں عوام میں ایک طرح سے اپنی اپنی رائے کے اظہار کا جنون پھیلا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنا اپنا نظریاتی اُدھیڑ بن اپنے ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور اپنے نظریات کا جھنڈا بلند کرنے میں مگن تھا۔ جارج بابو کے بھی اپنے نظریات تھے وہ ہر قسم کی قدامت پسندی، رجعت پسندی، تشدد و بربریت اور نفرت و حقارت سے بہت دور تھا ـــــ اسے مادر پدر آزادی کے پرستاروں اور بن بیاہی ماؤں کے جلوس بھی اچھے لگتے تھے مگر وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اس کا اپنا مقام کیا ہے! جارج بابو اس بات سے

وہ اپنی ملنے کا بے باکانہ اظہار صرف دکھوں کا اضافہ ہی کرتا ہے ـــــ بالکل اس
بچی کی طرح جس نے بیچ بازار میں کر اس کے سوال کا اگرچہ جواب نہیں دیا تھا البتہ وہ اپنی
ناواقف زبان سے بہت کچھ کہہ گیا تھا ـــــ جارج بابو ابھی تک اسے فراموش نہیں کر سکا تھا
دفتر سے گھر واپس جانے کے لیے وہ پیدل اسٹیشن پہنچا اور گاڑی میں سوار ہو کر کھڑکی
کھولے بیٹھ گیا ـــــ گاڑی سے باہر نکل کر جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو ہر چیز اسے چکتی
دکھائی پڑتی تھی ـــــ ہر چند کہ منحوس دن کا بوجھ اسے ابھی تک محسوس ہو رہا تھا لیکن گھر
پہنچنے کے خیال سے وہ اسے کسی حد تک بھول چکا تھا ـــــ گھر جاتے ہی وہ سب سے
پہلے نہائے گا ـــــ اتنی دیر میں اس کی بیوی میز پر شام کا گرما گرم کھانا سجا دے گی ـــــ
جارج بابو اپنے ناک میں کھانے کی خوشبو محسوس کر رہا تھا ـــــ برگیتے نے اپنے گھر کے
باغیچے سے پھول توڑ کر گلدان میں سجا رکھے ہوں گے ـــــ بچے اس کے گرد اکٹھے ہو کر آداب
بجا لائیں گے ـــــ جارج بابو کچھ اسی طرح کے خیالات میں تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے
بڑھتا جا رہا تھا ـــــ "خدا کا شکر ہے میرے پاس اب اچھی اور مستقل ملازمت ہے
ـــــ لیکن اس میں خدا کے شکر کی کیا بات آخر میں نے خود بھی تو ہمیشہ ہمت و ایمانداری
سے محنت کی ہے ـــــ میں نے کبھی کسی کو اپنی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیا تھا میں
نے کبھی کسی کو زحمت یا تکلیف نہیں دی ـــــ میں تو ہمیشہ دوسروں کے حقوق کی عزت
کرتا ہوں تبھی تو اپنے حقوق کی ان سے عزت چاہتا ہوں" جارج بابو سوچے جا رہا تھا اور
ہر نئے خیال کے ساتھ ہی وہ ایک انجانے خوف میں بھی مبتلا ہو جاتا تھا ـــــ غیر ارادی
طور پر اسے یاد آیا کہ وہ صبح اپنے ہی علاقے کی ایک معروف سڑک کا نام ہی بھول گیا تھا
یہ خیال آتے ہی جارج بابو نے اس سڑک کا نام پھر سے یاد کرنا چاہا ـــــ "شاہراہ آزادی"
ـــــ نہیں یہ تو نہیں ـــــ "شاہراہ جمہوریت" ـــــ ارے یہ تو شہر کے اس طرف ہے
ـــــ اور پھر وہ بے ساختہ پکار اٹھا ـــــ "شاہراہ ساحل" ـــــ یہ ہوئی نہ بات! وہ ایک

یا دہ شب برتنے کے لئے [illegible] تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ سامنے سے [illegible]
دوسری جانب سے اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا ـــــ جارج بابا سے دیکھتے ہی [illegible]
اندر ہی اندر مشتعل ہو گیا اور اس نے نیلسن کے سلام کا جواب تک نہ دیا ـــــ "شاید
مسٹر جارج ـــــ آج موسم کتنا خوشگوار ہے" نیلسن موچی اس کے قریب سے گزر کر آگے
جا چکا تھا۔

جارج کی جیسے جان میں جان آگئی ہو اور اسے پھر سے زندگی بسر کرنے کی مہلت
مل گئی ہو ـــــ اس نے ایک گہرا سانس لیا ـــــ وہ پل بھر کے لیے رکا اور اس نے دور
جاتے ہوئے نیلسن کو پیچھے مڑ کر دیکھا ـــــ پھر ایک لمبا سانس لے کر تیز تیز قدم اٹھاتا
گھر کی طرف چل دیا ـــــ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں کو بھگو رہے تھے
ـــــ گھر کے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے دستک دینے سے لمحہ بھر پہلے
ـــــ شام کی بھوری روشنی میں کھلے آسمان کی طرف دیکھا تو اسے فضا میں بہار کی خوشبو
محسوس ہوئی ـــــ "نیلسن موچی حق بجانب ہے ـــــ بوڑھا موچی ـــــ کیا شخصیت
ہے اس کی ـــــ وہ کتنا پر لطف اور باذوق انسان ہے" ـــــ آج واقعی موسم
کتنا بدل چکا تھا موسم کی یہ خوشگواری بہار کی آمد کا سندیسہ تھی ـــــ جارج
اپنے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

COMPLEMENTS FROM

THE MANDEEP ENGINEERING & PACKAGING

INDUSTRY INDUSTRIES PVT.LTD.

RELIABLE HOME

6-KOH-I FAZA

INDOR ROAD, BHOPAL

"عصری ادب ۶۶" دہلی

کتابوں کی باتیں

نکات فن ـــــــــــــــــــــــــــ مصنف: آغا صادق

مطبوعہ: ۱۶ ونڈر میئر روڈ۔ لندن

اردو میں علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت حیرت انگیز ہے۔ خالص ٹیکنیکل قسم کی کتابیں بھی بڑے حسن اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ چھپ رہی ہیں "نکات فن" مصنفہ آغا صادق (مرحوم) کے بیٹے جناب نوید حسن نے انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ۔ ونڈر میئر روڈ۔ لندن سے شائع کی ہے۔ سرمایۂ زبان اردو (جلال لکھنوی)، آئینۂ بلاغت (محمد عسکری)، آئینۂ سخن فہمی (مسعود حسن رضوی)، اور "الفصاحت (نجم الغنی) کے بعد نکات فن تقسیم ہند کے بعد پہلی مبسوط کتاب ہے جو علم عروض، شعر و سخن، الفاظ کی حرکت و سکون، شعری اوزان کے تصور، اصول تقطیع، بحور کی تشکیل، سقوط حروف اور زحافات وغیرہ سے متعلق ہے۔ دو سو ۳۵ صفحات کو محیط ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کتاب میں بحور و اوزان، زحافات وغیرہ کی وضاحت کے لیے جو جدول، نقشے اور گوشوارے بنائے گئے ہیں سب کو صحیح کتابت اور طباعت کی منزلوں سے بحسن و خوبی گزارنا، ہفت خواں سے کم نہیں ہے۔ آخر کے حصے میں موسیقی پر بھی مقالات ہیں۔ راگ راگنیوں کی اٹھان، مُرکیوں اور کٹلریوں وغیرہ پر اسی طرح کی بحث ہے جس طرح واجد علی شاہ کی کتابوں، بنی، ناجو اور دلہن میں تفصیلی بحثیں ملتی ہیں۔ ان تمام فنون کی باریکیوں اور تکنیکی صورتوں کو سمجھنے کے لیے

ہے مثلاً مصنف نے "بشارت" بضم ب صحیح لکھا ہے مگر اردو میں عوام و خواص سب "بشارت" بفتح ب بولتے ہیں۔ اسی طرح "پارس" کو لکھا گیا ہے کہ اس لفظ میں "ر" ساکن اور "س" موقوف ہے جو یوں ہاؤ ہوز کو دیتے ہیں عراق و پارس (جبل) ہر دو لفظ "ر" متحرک کے ساتھ بھی نظم کیا گیا ہے ؎

بخارا جا چکا، پارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض نیم جاں کب تک

(علامہ شبلی نعمانی)

اسی طرح "تبدیلی" اور "تابعدار" کو غلط بتایا گیا ہے۔ اردو میں بہرحال یہ دونوں الفاظ ثقہ حضرات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح "جلاوطن" ج فتحہ کے ساتھ بولنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اردو میں تو لوگ "جلاوطن" ج کسرہ کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔ "حکومت" کو ح مفتوح بولنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اردو میں ح مضموم ہی بولتے ہیں۔ "مہلت" بہ ہر سہ لغت لیکن اردو والے ح مضموم بولتے ہیں۔ "عیال" بکسر ع لکھا گیا ہے مگر اردو والے ع مفتوح بولتے ہیں۔ "بلبل" کے لیے لکھا گیا ہے کہ ل کے سکون سے غلط ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ میر انیس نے لکھا کہ

لوٹ لو، پھونک دو، تاراج کرو بہتر ہے
کہ گرو، یہ تمہارے ہی نبی کا گھر ہے

(میر انیس)

لازم ہے تم کو پاس کلام مجید کا
کلمہ نبی کا پڑھتے ہو تم، یا یزید کا

(میر انیس)

اسی طرح "قبیل" کے بجائے "قبیل" ق مکسورہ اور ب مفتوح۔ "لایزرغ" مکسورہ، "سا" لام مکسورہ، "متوفی" درست "متوفی" غلط۔ "جاز" بضم میم بولنے کی سفارش [illegible] درست ہے۔ "حسب بات" رہا ہے کہ "نکبت" لفظ کے لیے لکھا گیا

کو خاصا دخل ہے۔ ہمارا شاعر الفاظ کے اعراب و اصوات کو عوام میں مستعمل ہونے کے طریقے کے سبب زیادہ نظر میں رکھتا ہے اور یہی طریقہ زبان کی ترسیل میں مدد دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے "رَقم" لفظ کو سکون اوسط یعنی "رَقْم" بروزن عمل لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات درست ہے۔ یہ لفظ اپنے دونوں معنی (رَقم بمعنی تحریر کرنا اور "رقم" بمعنی روپیہ پیسہ) میں متحرک الوسط ہے۔

مثال (۱)

جو حرفی ہیں انہیں عادت ہے اظہار کی ہے
تمام مردوں کا رقم باڑھ پہ تلوار کی ہے

(دوبا صاحب مرزا مکھنوی) بمعنی تحریر

مثال (۲)

تمہیں نا ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ "رقم" نہ ہاتھ لگتی، وہ یہ افتخار ہوتا

(داغ دہلوی) بمعنی نقدی

لے کے دل آپ جگر چھوڑ گئے سینے میں
اک "رقم" یاد رہی، ایک "رقم" بھول گئے

(داغ دہلوی) بمعنی نقدی

اسی طرح ص۵۱ پر مصنف کتاب ہذا تحریر فرماتے ہیں "چیونٹی کو بعض شاعر فاعلن، باندھتے ہیں جو صحیح نہیں۔ چیونٹی کا وزن "چوٹی" (بروزن) فاعلن درست ہے۔ مثلاً چیونٹی ننھی سی تو اک جان ہے (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/فاعلان) لیکن میر انیس نے "چیوں ٹی" باندھا ہے:

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے داد کش فقیروں کے رازق ترے نثار

ع چیونٹی بھی مورچوں میں رہتی آدمی تو کیا (میر انیس)

اب ایسی صورت میں ہم لغت کو مانیں یا اپنے شاعر کو۔ اسی طرح "مفرد کلمات کی صحت" والے باب میں بھی الفاظ کی حرکت و سکون اور اعراب سے اختلاف ممکن

مصنف نے کیا کیا ہوگا کتنا حصہ غیر عربی اس میں صرف ہوا ہوگا۔ اس کتاب کے مطالعے کے بغیر اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ اس طرح "فکاتِ فن" اب اردو کی پہلی کتاب ہوگئی جو بیک وقت اتنے فنون کا احاطہ ایک ساتھ کرتی ہے۔ مرتب اور ناشر قابل مبارک باد ہیں۔

کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت بعض باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں کہ میں اُن سے ناواقف تھا۔ خاص طور پر "سقوطِ حروف" والے باب کی بہت سی باریکیاں جہاں مصنف نے الفاظ کی حرکت و سکون کی بحث چھیڑی ہے وہ بھی بڑی دلچسپ اور پُراز معلومات ہے۔ "تقطیع کے اصول" اور "زحافات کی کھینچا تانی سے باجبر رہنے کے لیے ہندی شعرا کو خاص طور پر فکر کرنی چاہیے"۔ بحور کے اوزان اور ارکان پر بڑی اچھی بحث ہے۔ کہیں کہیں ارکان کے معاملے میں اکثر واقفینِ فن نے بعض ارکان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً بحر متقارب مقبوض اثلم شاعر دہ رکنی کے ارکان اس کتاب کے مصنف نے فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول وفعلن (تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی) بتلائے ہیں۔ مگر علی حیدر نظم طباطبائی نے ایک بحث میں یہ ارکان مانے انھوں نے یہ کہا کہ اس کے اصل ارکان ہیں

مفاعلن فاعلن فعولن، مفاعلن و علن فعولن

اس طرح ارکان کی تعداد گھٹ جائے گی اور یہ بحر اب شاعر دہ رکنی کے بجائے دوازدہ رکنی ہو جائے گی۔ مگر سوا نظم طباطبائی کے اور کسی نے یہ بحث نہیں اٹھائی۔ نجم الغنی بھی "بحر الفصاحت" میں "فعول فعلن" ہی مانتے ہیں۔

میری دلچسپی کے اس کتاب میں دو ابواب خاص ہیں۔ "سہ حرفی کلمات کے حرکات و سکنات (ص۵۰ ص۵۱ ص۵۲ ص۵۳) اور "مفرد کلمات کی صحت"۔ ایک اور باب "ہم وزن الفاظ" بھی قابل توجہ ہے۔ یہاں مصنف سے اختلاف کی صحی گنجائش ہے۔ مصنف نے بہت سے الفاظ کے اعراب و اصوات کو لغت کے سہارے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو میں اعراب و اصوات میں بعض

ہے کہ یہ لفظ فارسی میں "نکہت" ہے۔ جہاں تک واقف الحروف کو معلوم ہے "نکہت" کوئی لفظ نہیں ہے۔ ناواقف لوگوں نے یا کسی مولوی نما مدرس نے بنا لیا ہے۔ فارسی میں بھی "نکہت" ہی صحیح لفظ ہے اسی طرح "ہجوم" بہ فتحہ ہ، مگر اردو میں "ہ" بالضم ہی مستعمل ہے۔ عوام اور خواص سب "ہجوم" ہی بولتے ہیں۔ اسی طرح "اس کی بجائے" صحیح ہے مگر اسے لکھنے میں تامل ہے۔ دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ "اس کے بجائے" رائج ہے۔ نثر میں حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد کسی نے "اس کی بجائے" نہیں لکھا۔ ہاں وہ لوگ جو اردو زبان ڈکشنری سے پڑھتے ہیں ضرور اس طرح کی عبارت لکھتے ہیں "آپ کے بجائے کوئی دوسرا کہتا تو مزہ چکھا دیتا" ہی اردو میں ملے گا۔ اس عبارت کو اس طرح بھی بولتے ہیں "بجائے آپ کے کوئی دوسرا کہتا ....." اب اگر کوئی یہ لکھے "بجائے آپ کی کوئی دوسرا ..." تو پہلوئے ذم پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اسی پہلوئے ذم کو بچانے کے لیے "کی" کے بجائے "کے" کا استعمال شروع کیا گیا ہو۔

"نکات فن" میں کچھ ابواب معرکے کے ہیں۔ اردو کے اس دور میں بے حد مفید اور پُراز معلومات ہیں۔ "تحقیق زبان" کے بہت سے مسئلے صاحبان علم و دانش کو بھی ٹھٹک کر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً "نور چشمی" "طول عمر" "فریب المرگ" "دائم المریض" "کلام الملوک ملوک الکلام" "روشن الدین" وغیرہ کو مصنف نے غلط بتایا ہے یہ بات درست ہے۔ مگر عام طور پر لوگ بولتے اور لکھتے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے "روشن الدولہ (کی کچہری لکھنؤ)" "معرکۃ الآرا" بھی غلط ہوئے۔ "معرکۃ الآرا" کی "آرا" کو کچھ بڑے لکھے پڑھے عربی سمجھتے ہیں اور "رائے" کی جمع تصور کرتے ہیں جب کہ "آرا" "آراستن" سے مستخرج ہے رائے سے نہیں۔ جو لوگ "بڑی معرکۃ الآرا بات ہے" بولتے ہیں ان کا مطلب بڑی اچھی یا قابل داد بات سے ہوتا ہے "اچھی رائے والی بات" نہیں ہوتا۔

"راگ رنگ" اس کتاب کا آخری حصہ ہے (علم جو موسیقی اور اس کی مختصر تاریخ سے متعلق ہے۔ اس کے متعلق میری معلومات صفر ہیں تاہم اس باب کے مطالعے سے مجھ جیسے عامی کو بھی بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مصنف نے ایک جگہ "بھیرویں" کو "بھیرو" لکھا

ہے یہاں تک میں نے سنا ہے بھیروں کو لوگ "راگنی" کہتے ہیں۔ بسم اللہ خاں کو مشہور سارنگی نواز" لکھا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی بسم اللہ خاں سارنگی کے لیے مشہور رہے ہوں مگر اب تو وہ خالص شہنائی بجانے کے لیے مشہور ہیں۔ کتاب کے آخر میں اور ان موسیقی کے بے نقشے بھی بنے ہیں جن میں "تین تال" "جھپ تال" "چوتال" "دھمار" "دادرا" "لاونی" وغیرہ کی تصریحات درج ہیں۔ پوری کتاب کے مطالعے کے بعد قاری پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ آغا صادق مرحوم نے کیسے ان مختلف النوع معلومات پر عبور حاصل کیا ہوگا۔ ایک حیرت انگیز بات اور ہے کہ اتنی خوب صورت کتاب کی کوئی قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً اس لیے کہ یہ کتاب "نکات فن" واقعی انمول ہے۔

تبصرہ نگار: سید محمد عقیل۔ الہ آباد

لسان، فلسفے کے آئینے میں ——————— خلیل مامون

ناشر: ہیل رفت پبلی کیشنز، سلم چوک، گلبرگہ صفحات ۱۳۲ قیمت: ۳۶/۰

بظاہر کتاب آٹھ مضامین کا مجموعہ ہے مگر غور کیجیے تو ان سب مضامین میں گہرا ربط ہے۔ آغاز ہوتا ہے گرونانک کے فلسفے میں نام سے جو خود ایک علامت ہے۔ دوسرا مضمون غالباً اسی علامت نگاری پر ہے اور تیسرا مابعد الطبیعیات پر۔ اس کے بعد فلسفہ لسان پر مختصر سا مضمون ہے اور اسی کا سلسلہ ہیڈیگر کے نظام فکر میں لسان اور اسرل کی لسانی نظریات کے مضامین میں جاری ہے ان سبھی مضامین میں مغرب کے سربرآوردہ ماہرین کے لسانی نظریات سے بحث کی گئی ہے اور یہ بحث لسانیات اور فلسفے کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ زبان میں الفاظ کس حد تک معنی ادا کر سکتے ہیں اور ان کی صوتی، نحوی اور معنوی حدود کیا ہیں؟ ہارک فرام کی تصنیف "فرائڈ" کی عظمت اور حدود کے ابتدائی مضمون سائنسی علم کے حدود کا خلاصہ بھی ایک باب کی شکل میں شامل کر دیا گیا ہے۔ آخر میں نئی فکر، سماجی تغیر اور لسان اور لسانی تدن میں لسان اور اسطور کے عنوان سے ایک مختصر باب ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب نہایت شستہ اور رواں اسلوب میں لکھی گئی ہے اور فلسفہ لسان کے بعض اہم

مفکروں کے بنیادی خیالات کو نہایت فکر انگیز ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں اپنے ڈھنگ کی پہلی اور اہم کتاب ہے۔

تبصرہ نگار، م۔ ح

"گناہ سخن" (مجموعۂ کلام) ——————— کانتی موہن سوز

ناشر، ۲۲۲۔ وی پی ہاؤس، ربیع مارگ۔ نئی دہلی صفحات ۱۱۰ قیمت: ۵/۰

"گناہ سخن" اردو کے ایسے چاہنے والے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جو اردو رسم خط سے بے بہرہ رہ گیا مگر اس کی بول چال کی زبان اردو ہے اور اس کا ادبی ذوق اردو ہی کی روایات میں پروان چڑھا ہے اس اعتبار سے یہ کسی ہندی شاعر کی اردو غزلیں نہیں ہیں بلکہ اردو والے ہی کی غزلیں ہیں جس کو حالات نے اردو رسم خط سے آشنا نہیں ہونے دیا اسی لیے ان میں اردو کے اہم شاعروں کی جھلکیاں صاف ملتی ہیں شاعر نے ان جھلکیوں کو اپنے دکھ درد اور اپنے وسیع تر جذباتی شعور سے زیادہ تیکھا اور تابناک بنانے کی کوشش کی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

دل بھی مجرم ہے اسے ہم کیوں بتائیں اپنا راز
اب یہ ٹھانی ہے کہ خود سے بات آہستہ کریں

ہر کوئی سنگ اٹھائے تھا کہ سر پھوڑنا ہے
ڈر نہیں تھا کہ وہ پتھر کہیں بھگوان نہ ہو

معرکہ ختم ہوا جنگ ابھی جاری ہے
دل کی مانیں کہ خرد کی یہی دشواری ہے

بازار میں قتل و غارت کا سامان رہا اور خوب رہا
ہر ایک کے پہلو میں اس کا بھگوان رہا اور خوب رہا

جفا پرستی، دراز دستی، نہ شیشۂ دل کو توڑ پائی

شاہ حسن کی شاعری اردو غزل کی مضبوط اور مستحکم روایات میں رچی بسی شگفتہ اور دل سوز شاعری ہے جو غزل کی سرحدوں کو اور بھی وسیع کرتی ہے۔

تبصرہ نگار: م ح

"سرسید، اقبال اور علی گڑھ" ——— اصغر عباس

پروگریسیو پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ صفحات ۶۴ قیمت ۱۰/-

اقبال سے علی گڑھ اور سرسید کے ذہنی اور جذباتی تعلق کے نشانات بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے یکجا کیے ہیں اور فکر اقبال میں سرسید اور علی گڑھ سے ہم آہنگی اور یکرنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے

تبصرہ نگار: م۔ ح

"مخفی تنقید و تحقیق" ——— ڈاکٹر حسن آزاد

شعر و دل نواز پبلی کیشنز، بہرام صفحات ۱۳۰ قیمت ۳۰/-

یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں علم الاعداد کی بنا پر مختلف ہستیوں کی کیفیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور علم نجوم کی مدد لی گئی ہے۔ علم نجوم کی تائید اور ہمارے شعرا نہایت دلچسپ اور نئے مضمون ہے۔ اسی طرح امیر خسرو پر مقدمہ ہے۔ دریافت کہ خسرو پانچ بادشاہوں کے درباری تھے انھوں نے پانچ تاریخی مثنویاں لکھیں، پانچ دیوان مرتب کیے، پانچ زبانوں میں شاعری کی فارسی میں پانچ لاکھ اشعار چھوڑے، نثر میں رسائل کے پانچ دفتر لکھے، پانچ [illegible] میں عمر کا بڑا حصہ گزارا، پانچ علوم [illegible] فنون میں کمال حاصل کیا اور ان کی مثنوی [illegible] میں ۹ بحروں کو استعمال کرکے [illegible] علم شناسی کا ثبوت دیا نئی دریافت ہی ہے۔ رنگین کے بارے میں یہ انکشاف [illegible] انھوں نے خود چالیس سال کی عمر میں اپنے فوت ہو جانے کی تاریخ لکھی تھی۔ سب سے [illegible] مضمون "اقبال کا تصور زماں — ترسیل کی ناکامی" ہے۔ اقبال کے تصور زماں [illegible] بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کبھی برگساں کے خالص تسلسل زماں سے ہم کنار ہوتے

ہیں کبھی اس سے دست و گریباں، کبھی نیوٹن کے تصور زماں و مکاں
کی تنقید کرتے ہیں، کبھی آئین سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے زماں
مکاں کی نفی کرتے ہیں، کبھی زرتوان کو زمان و مکاں کی ایک علامت
بنا کر پیش کرتے ہیں اور کبھی اسے روحی کی زبان سے ایک حقیقت
کی دو حالتیں بتاتے ہیں، کبھی اسے عشق کی تقویم میں دیکھ لیتے
ہیں اور کبھی مقام دل میں۔ غرض کبھی سوالیہ نشان چھوڑ دیتے
ہیں کبھی سوال کا حل پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

زمان کے بارے میں اقبال کے بیانات کے تضاد کو حسن آرزو نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور روایتی اثرات کی واضح طور پر نشان دہی کی ہے۔

ایک اور دلچسپ مضمون قاضی عبدالودود پر بھی ہے جس میں حسن آرزو نے قاضی صاحب کا بنیادی مدعا ہے اور ان کا مولوی عبدالحق اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا سخت نکتہ چیں ہونا دراصل علم الاعداد کی باہمی کشش اور مخالفت کی وجہ سے ہے کیونکہ موخرالذکر حضرات کے نام کے اعداد قاضی عبدالودود کے نام کے اعداد کے مخالف ہیں

اقبال بڑے بت شکن اور موحد ہیں مگر حسن آرزو نے ان کو بھی انجم شناس مومن کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ غرض کتاب بڑی دلچسپ ہے۔

فصیل شب (مجموعہ کلام) ——————— **حامد الہ آبادی**

حامد الہ آبادی ان شاعروں میں ہیں جو اپنے درد و کرب کو شعر میں ڈھالتے ہیں وہ بے اختیارانہ اور والہانہ طرز میں کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل طرز زیست ہے۔ اس لیے کلام میں تیکھا پن اور گداز ہے جو دور حاضر کے اکثر غزل گو شعرا کے کلام میں نہیں ملتا۔ "فصیل شب" ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے اور ان غزلوں میں ان کے دل کا درد موتی بن کر پھوٹ بہا ہے۔

"روشنی موضوعِ کلام" ——————— وجاہت سندیلوی

ملنے کا پتہ: نصرت منزل، سندیلہ (یوپی)

وجاہت سندیلوی نے مدوح نگار کی حیثیت سے نام پیدا کیا مگر ان کے شعری مجموعے ان کے ستھرے شاعرانہ ذوق کے بھی آئینہ دار ہیں۔ وہ غیر ضروری حشو و زائد سے پاک شعر کہتے ہیں اور سنبھل کر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت کا احترام بھی ہے اور نئے تجربے کا انداز بھی۔

"کتھا" ——————— خالد اگا سکر

آٹھویں دہائی کی مراٹھی کہانیوں کا نمائندہ انتخاب اردو ترجمے کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ترجمہ نہایت شستہ اور رواں ہے اور کہانیاں بھی ایسی منتخب کی گئی ہیں جو اردو کہانی کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ شروع میں ۳۲ صفحات کا معلومات افزا اور خیال انگیز دیباچہ ہے جس میں آٹھویں دہائی کی اردو کہانی کا بھی ذکر ہے اس تقابلی مطالعے میں البتہ بعض جگہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ اردو کہانی شہری ہی میں سمٹ کر رہ گئی ہے (۲۶) درست نہیں۔ یوں ہوتا تو نہ سریندر پرکاش کی کوکا ہوتی نہ غیاث احمد گدی کے افسانے۔ اسی طرح حسین الحق کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی کہانیوں میں زندگی بکھری بکھری سی ہے (۲۵)، صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ اردو دہائی کے بعض اہم نام چھوٹ گئے ہیں۔ بہرحال اس سے مراٹھی کہانیوں کے ترجمے کے ذریعے جو ادبی خدمت انھوں نے انجام دی ہے اس کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

"یادبسیرے" (کہانیاں) ——————— از انور خاں

شرا تخلیق کار، ۴۰، فراش خانہ، دہلی ۶ صفحات: ۱۳۰ قیمت: ۴۰/-

"یادبسیرے" انور خاں کی ۱۸ واقعی مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان سبھی کہانیوں میں انور خاں نے تجربے کے پھیلاؤ کے بجائے ارتکاز پر زیادہ زور دیا ہے۔ کہانیاں ہے کو ہیں اچھی خاصی افسانوی غزلیں ہیں جنھیں بڑی نرمی، شائستگی، لطافت

رمثالیں ہیں۔ یاد بسیرے۔ شاید اس مجموعے کی سب سے اچھی کہانی ہے [illegible]
نہیں۔ مدتوں بعد شہر سے آبائی گاؤں کی طرف ایک اچھے کھاتے پیتے خاندان کی واپسی کا
منظر ہے مگر انور خاں نے اسے واقعی لطافت احساس اور نزاکت اسلوب سے غزل کا
پیرایہ دے دیا ہے۔ کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں مگر وقت اور اس کے ساتھ سماجیاتی
عاملوں نے کیا کھیل کھیلا ہے کہ اپنے وطن میں لوگ اجنبی ہو گئے ہیں ان کی گود میں
صرف یادوں کے پتے رہ گئے ہیں۔

> "ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کئی پتے شاخوں سے جدا ہو کر فضا میں
> ڈولنے لگے۔ ایک پتہ لہراتا ڈولتا خورشید کی گود میں آگرا۔ اس
> نے عقیدت سے پتے کو ہاتھ میں لیا اور اس کی چکنی شفاف سطح پر
> ہاتھ پھیرنے لگا۔ کمبخت ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ اس پتے کو آنکھوں
> سے لگا لیتا۔" (ص ۱۰)

احساس کی یہی لطافت اور نفاست ان کہانیوں کی قدر مشترک ہے جسے انور
خاں زمانے کی دشت برد اور ترقی کی اندھی دوڑ میں روندے جانے سے بچا لائے
ہیں۔

بہترین اور تسلی بخش خدمات کے لیے

سنجیو ٹریڈرس

سے رابطہ قائم کریں

جو اسٹاک اور کمپنیوں کے شیئر کے ماہر ہیں

پتہ

سنجیو ٹریڈرس

E-76 ایسٹ پٹیل نگر۔ دہلی ۱۱۰۰۰۸

ٹیلی فون: ۵۷۳۳۳۵۲

مصری لائن ۶۶ دہلی

عصری ادب

شمارہ ۶۷ اپریل تا جولائی ۱۹۹۲ء

نگراں
محمد حسن

مدیران
ڈاکٹر روشن آرا
سید ضیاء الدین احمد

فی شمارہ : بیس روپے زرِ سالانہ : پچھتر روپے
بیرونی ممالک سے : ایک پاؤنڈ فی شمارہ (علاوہ محصول ڈاک)
پاکستان سے : فی شمارہ بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ تصنیف
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹
فون نمبر: ۷۲۲۲۲۷۳

(ایڈیٹر پرنٹر پبلشر سید ضیاء الدین احمد نے این۔ کے اٹھوائنز ۱۴۳۶ فوٹھانہ دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تصنیف ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹ سے شائع کیا)

فہرست

۱۔ حرفِ آغاز

۲۔ آڑے ترچھے آئینے ۱

۳۔ اس شور سے دنیا میں اجالا نہیں ممکن

۴۔ مارکسزم — زندہ یا مردہ — سید خورشید عالم ۳

۵۔ مضامین۔

تراجمِ ہندی : زمین ساخت کا مطالعہ — پروفیسر برہمن سنگھ ۳

تقابلی مطالعہ کا ارتقا — سید احتشام احمد ندوی ۱۸

زندگی — ڈاکٹر مصطفےٰ کریم ۰۱

۶۔ شخصیات۔

کہانی بگیا سے اڑی کوکیلا کی — اقبال متین ۱۲

بلراج ساہنی — کنول نین پرواز ۰۲

۷۔ افسانے :۔

خوشبو — انور خاں ۱۵

خواب سراب — رفعت نواز ۲۳

خلیفہ — ش حیات ۲۸

۸۔ حصۂ نظم :۔ کیفی ۱۲۵، راہی ۱۵۱، علی عباس امید ۱۵۲، نشتر ۱۵۶، جاوید اختر ۱۵۷، منظر سلیم ۱۵۸، حسن عابد ۱۵۹، دوراں ۱۶۰، حرمت الاکرام ۱۶۱، شجاع ۱۶۳، جینت پرمار ۱۶۳، اختر بستوی ۱۶۵، وجاہت سندیلوی ۱۶۸، خیال ۱۶۹، اقبال متین ۱۷۱، اختر نقوی ۱۷۳، انیس ۱۷۶، اکرام ۱۷۹، اعجاز ۱۸۱، علی ظہیر ۱۸۳، ذوقی ۱۸۵، ظہیر نازیبوی ۱۸۶، سکندر ۱۸۷

۹۔ کتابستان : کتابوں کی باتیں — م۔ ع، ہارون ایوب، اطہر، احمد شمیم ۹۶

۱۰۔ مکتوبات ۲۲۱

حرفِ آغاز

اس بار عصری ادب اپنے دامن میں کئی خاص سوغاتیں لایا ہے اور ان
اتوں میں نیا پن بھی ہے۔

غالباً سب سے اہم ہے پروفیسر ہربھجن سنگھ کا ترانۂ ہندی کا تنقیدی
نظم جتنی پرانی ہے تجزیہ اتنا ہی نیا ہے اور محض شین اور قاف گننے تک
نہیں ہے متن کے حدود میں سختی کے ساتھ رہنے کے باوجود شعر فہمی کی
کیسی جہات اس تجزیے میں روشن ہوئی ہیں اس کا اندازہ مطالعے
ہی ہوگا۔ پروفیسر احتشام ندوی نے تقابلی ادب کا تعارف کرایا
ر عربی کے مآخذ سے کرایا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔

اس بار حصۂ نظم پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔ دو ایک پرانی نظموں
لاوہ جو موجودہ حالات سے ہم آہنگی کے باعث دہرادی گئی ہیں ہر نظم
ی دردمندی سے اور ہر غزل ایک انوکھی کیفیت سے دوچار ہے اور ان
ات نے ایک قوس قزح بکھیر دی ہے۔

افسانوں میں انور خاں، شین حیات اور رفعت نواز تینوں کے
نے معرکے کے ہیں اور تینوں کے خاتمے نہایت قابل توجہ ہیں۔ انور خاں
سانہ قبرستان کے ذکر سے معمور ہے مگر اس کے حقب میں زندگی کی جیسی
جاگتی مولسری کی مہک ہے کہ موت پر گویا فتح یاب ہو جاتی ہے شین حیات
سانے کا اختتام مظلوموں کی مقاومت پر ہوتا ہے مگر کیسا [illegible]
یک بھر دو بھر تین بھر نہ جانے کتنے ہاتھ اٹھتے ہیں جو اس مزاحمت بلکہ
زمت کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور رفعت نواز کا افسانہ جو دلسلوں

کے درمیان کشمکش کا آئینہ دار ہے گو خاکے میں ذرا زیادہ خوشگوار ہو گیا ہے مگر بے رحمی کے ساتھ باپ اور بیٹے کے جداگانہ طرزِ فکر کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیتا ہے۔

شخصیات کے ضمن میں اس بار بلراج ساہنی کے علاوہ سروجنی نائیڈو پر اقبال متین کا خاکہ توجہ طلب ہیں ـــــ ایسی نئی اور پرانی چنگاریاں ہمارے خاکہ میں بہت ہیں جن سے حال کی تیرگی میں جگنوؤں کی سی چمک میسر آسکتی ہے۔

پھر سائنسی معلومات اور سائنسی نقطۂ نظر کے بارے میں ایک مضمون بھی ہے جو قارئین کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

رخصت ہونے والوں کو سلام

۱۔ ڈاکٹر معصوم رضا راہی	مکالمہ نویس، شاعر، ناول نگار
۲۔ کرنل بشیر حسین زیدی	ماہر تعلیم
۳۔ ستیہ جیت رے	فلم ساز، شاعر اور فن کار
۴۔ سرور تونسوی	مدیر "شانِ ہند"

ہم سے رخصت ہو گئے۔ ادارہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور انھیں سلامِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

ادارہ

آڑے ترچھے آئینے

آئیے نئے سرے سے سوچیں:

آٹھ سال اور ہیں اور بیسویں صدی ختم ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ ختم ہوں گے سوچ بچار کے بہت سے زاویے۔ پس ماندگی اور پچھڑے پن کو ماضی بہت پیار لگتا ہے اور ہر آن وہ مستقبل کے ڈرے بندریا کی طرح اپنے مردہ ماضی کی کھکھوڑل کو سینے سے لگائے گھومتی ہے ہمارا معاشرہ بھی ماضی کے حصار میں بند ہے ——— ضرورت سے کہیں زیادہ!

ہماری ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی پرانی سوچ کے جواز میں نئی دلیلیں ڈھونڈھ لائیں یا یہ ثابت کر دیں کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے زمین آسمان وہی ہیں اور جن حقیقتوں سے ہم دوچار ہیں وہ زمین آسمان کی طرح قدیم ہیں۔

آئیے، ماضی سے دامن چھڑا کر نئی نظروں سے نئے اُفق دیکھیں، نئے رویے اپنائیں اور زندگی کے ہر رُخ پر از سر نو نظر ڈالیں۔ زندگی، معاشرہ، انسانی رشتے، ادب، سائنس، حقیقت اور جمالیات بھی اس نئی فکر کے منتظر نہیں۔ ڈریے نہیں، راستہ پیچھے کی طرف نہیں ہے آگے کی طرف جاتا ہے۔ ؎

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر نکلو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

یہ بہت ہوا کہ امریکا، برطانیہ، کناڈا، یورپ اور خلیجی ممالک میں اردو کے فروغ پر اپنی پیٹھ تھپتھپالی اور اردو کے مستقبل سے مطمئن ہو بیٹھے۔ قابل قدر ہیں

ہندو پاکستان سے بہت دور رہ کر بھی اپنی زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اردو زبان کی بقا کا ہونا ہو اردو ادب کے مستقبل کا مسئلہ تو جڑا ہوا ہے ادب کے فکری اور فنی تمول سے اور یہ تمول یہ تابانی یہ بلندی افکار اور ندرت اظہار پوری اردو برادری کی مشترکہ ذمہ داری ہے اگر کناڈا اور برطانیہ میں بسنے والے صرف ہندو پاکستان کے اہل علم سے سرقی فکیٹ وصول کرتے رہیں اور ان پس ماندہ ممالک کے چھوٹے چھوٹے قصبوں کی ادبی محفلوں کی ہاسلیانی کاٹ پیچ ہی میں لگے رہیں اور ہندستان اور پاکستان کے اردو والے ہی کی طرح کی تحریریں لکھتے رہیں تو پھر آج کی دنیا کی آگہی کی روشنی سے اردو ادب کو جگمگانے کا کام کون کرے گا اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو کی عالمی برادری اپنی ذمہ داری پہچانے۔ بڑے پیمانے پر عالمی ادب کے ہی نہیں عالمی فکر کے شاہکاروں کے ترجمے ہوں۔ آج کی دنیا میں چھپنے والے اور آج کی دنیا کو متاثر کرنے والے سبھی اہم مضامین کی گونج اردو والوں تک ان کی اپنی زبان اور محاوروں کی دل نشینی اور سلاست کے ساتھ پہنچے اب یہ مضامین خواہ سائنس کے ہوں یا زندگی کے سائنٹیفک نقطۂ نظر سے گزارنے کے بارے میں ہوں خواہ فلسفیانہ جہت کے ہوں یا جمالیاتی کیفیت کے۔

سوال محض معلومات کا نہیں ہے رویے کا ہے زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی طرف ہمارا رویہ کیا ہو۔ پھر اردو دنیا خصوصاً ہندستان اور پاکستان میں روایت پرستی ذہن اور جذبے کا سانچہ بن گئی ہے یوں بھی ہم کلیشے اور فرسودہ اصطلاح کی بیساکھیوں کے بغیر اعتماد سے قدم اٹھانے کے عادی نہیں مگر دنیا میں ادب وہی زندہ رہتا ہے جو واقعی فکر و احساس پر اعتماد کرے اور اعتماد کرنا سکھائیں۔ یہی اعتماد کی کھوج، یہی بغیر بیساکھیوں کے نئے مسائل پر اپنے رویے طے کرنے کی للکار پوری عالمی اردو برادری کو درپیش ہے۔

کچھ نئے سوال

آیئے نئے طرز سے سوچیں،

- سہ محوری دنیا ختم ہوئی۔ انسان ذاتی منافع سے قدم آگے نہ بڑھا سکا اور عالمی مارکیٹ ذاتی منافع کی بنیاد پر مستحکم ہے (مع اپنے تمام تر کمزوریوں کے)
- مشینی زندگی سے مفر نہیں۔ کل کل کے رواج نے سکے اور پیشی کو بیکار کیا تھا، بجلی آنے سے مشعلیں بیکار ہوئے۔ بڑے کارخانوں سے دستکار اور چھوٹے صنعت کار اُجڑے۔ اب کمپیوٹر اور لیزر سے آسانیاں اور بیروزگاری دونوں بڑھیں گی۔ ان سے مفر نہیں۔
- ہر ملک کی معیشت کا انحصار دوسرے زیادہ ترقی یافتہ ملک کی معیشت پہ یعنی سب کے داتا جاپان اور امریکا ـــــ سو ایسے میں اس مفروضے کی کیا حیثیت ہے جسے 'قومی آزادی' کا نام دیا جاتا رہا ہے اور جس کی خاطر لاکھوں اپنی جان سے گئے۔ لاکھوں اپاہج ہوئے گئے اور برباد ہوئے؟ کیونکہ آزادی اور اقتصادی غلامی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ آزادی محض آقاؤں کی رنگت بدلنے کا نام نہیں ہو سکتا۔
- جب اقتصادی سطح پر قومی فلاح ممکن نہیں اور سب کے داتا نورڈ اور اک فیلر ہی کو ہونا ہے تو اپنے اوپر ہی نظر مرکوز کیوں نہ رکھی جائے؟ ذات اور صرف اپنی ذات، جیب اور صرف اپنی جیب، خوشحالی اور صرف اپنی خوشحالی؟ لمحہ اور صرف لمحۂ موجود۔
- نئی اخلاقیات ـــ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنی زندگی کو کس طرح سجا اور سنوار سکتے ہیں دوسروں کو کم سے کم نقصان پہنچا کر یعنی دنیا میں جو قانون نافذ

[illegible] ENLIGHTENED SELF روشن خیال مفاد پرستی کا قانون ہے اور اس قانون کا نفاذ ہر ایک پر لازماً فرداً ہوتا ہے۔

♣ اس قانون کی گرفت میں آپ کی ذات آتی ہے خاندان نہیں، کیونکہ خاندان کا تصور نئی معیشت نے آپ سے چھین لیا ہے۔ مشترکہ خاندان ٹوٹ چکا۔ عورت اور مرد کے رشتے اب (خاندانی منصوبہ بندی بلکہ ضبط تولید کی وجہ) نسل بڑھانے اور بچے پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف جنسی پیاس بجھانے کے لیے ہیں اور اس کے لیے گولیوں سے لے کر نرودھ اور بچہ گرانے تک کی قانونی سہولتیں موجود ہیں پھر جنسی ضرورت پوری کرنے کے بعد طویل سماجی رفاقت اور ایک دوسرے کے مزاج داری اور نباہ کیسا اور کیوں؟ بچے اگر ہو بھی گئے تو چڑیا کے بچوں کی طرح پر نکلتے ہی پھر سے اڑ جائیں گے اور جہاں جی چاہے گا جا بسیں گے اس کا نام ہوا نیوکلیائی خاندان جس میں والدین کی اگر کوئی ذمہ داری ہے تو بس بلوغت تک۔ باقی عمر یا تو جدائی میں یا پھر جنریشن گیپ (نسلی خلیج) کی نذر۔ طلاق بے معنی اور ماں باپ اور بیٹے بیٹیوں کی پسند کی یکسانیت اور ہندبی اور نسلی ہم آہنگی غیر ضروری!

♣ اس سے عشق و عاشقی کا بھی ایک نیا تصور ابھرنا لازمی ہے۔ عورت اور مرد چونکہ یکساں رتبے کے ہیں یا کم سے کم مانے جاتے ہیں سو یا تو پرانے تصور کو برقرار رکھ کر بیوی جہیز کے لیے بیاہ کر لائیے اور جہیز کم ملنے پر اسے زندہ جلا دیجیے یا پھر عورت الگ زندگی گزارنے کی جدوجہد میں ہر روز جھگڑے، اور اس جھگڑے میں بچوں کی پرورش کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا رہے۔ عشق جسم کی تڑپ اور اس کی کرشمہ سازی کا بیان بھی نہ رہے صرف لمحے دو لمحے کی جنسی پیاس بن جائے اور اپنے سارے الوہی تلازمے بھول جائے۔ نشاط و کرب سے بے خبر محض ارتعاش احساسات تک محدود۔ سو ہماری عشقیہ شاعری کا کیا ہوگا؟

• یوں ہے تو کیا ماضی کی پناہ گاہوں میں سکون ہے؟۔ مذہب اگر ذاتی عقیدے کی پناہ گاہ ہے تو سکون کا باعث ہو سکتا ہے لیکن اگر عقل اور معقولیت سے فرار کا وسیلہ ہے تو اس کی افادیت محدود ہے پھر اس میں تصوف، رواداری اور صلح کل کا رنگ ہو تو آہستہ آہستہ توکل کے راستے سے بھولیت، پست ہمتی اور پس ماندگی آجاتی ہے اگر کٹرپن اور تفاخر کا رنگ آجائے تو فرقہ پرستی اور تعصب، دوسرے مذہب والوں کے خون سے زمین رنگین کر دیتے ہیں پھر لیبرز اور کمیونزم کے دور میں مذہب اور روحانیت شاید لمحاتی تسکین فراہم کر سکتے ہوں، حل فراہم کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں ممکن ہے مسائل کو اور زیادہ الجھا دیں۔

• کیا ماضی کی طرف گہری وابستگی کا رویہ موزوں ہے (خصوصاً وہ رویہ جو ہم ایشیائیوں نے اپنا رکھا ہے)؟ کیا واقعی تاریخ پرستی اور ماضی کی پرستش (خواہ وہ گزرے جاہ و جلال کی شکل میں ہو، قومی اور نسلی تفاخر ہو یا وطن پرستی یا اخلاقیات، مذہب اور روحانیت سے اندھا لگاؤ) ہمیں بہت دور لے جا سکتی ہے؟

انسان شاید بہت تنہا رہ گیا ہے مگر تنہائی کی اس مملکت میں اسے بہرحال اپنے سوال اپنے طور پر (اور اپنے طور پر ہی) حل کرنے ہوں گے خصوصاً ادب اور فکر کی قلمرو میں، کہ ادیب محض کارِ فضول یا گھڑی دو گھڑی کی پھلجھڑی نہیں دوسروں سے پہلے خود اپنے روبرو جواب دہ ہونے کا وسیلہ بھی ہے۔ نئے سوالوں کی آگہی نہ ملی تو ادب میں سناٹے کی سائیں سائیں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دے گا۔

نوالِ روس کے بعد کے فکری مسائل

اک شور ہے دنیا میں اُجالا نہیں ممکن

اک شور ہے دنیا میں اُجالا نہیں ممکن، مارکسزم کا بلبلہ پھوٹ گیا مشرقی یورپ اور مشرقی جرمنی میں بغاوت کا علم بلند ہوا سوویت یونین کے ۱۵ برس سے اشتراکیت کا گڑھ تھا فتح ہو گیا اور اب وہاں ایک ریاست کے بعد دوسری ریاست خود مختاری کا اعلان کر رہی ہے دنیا نے گویا مارکسزم اور اشتراکیت دونوں کو رد کر دیا اور دنیا کے سرمایہ داروں اور ان کے مفکروں اور دانش وروں کے جھنڈے پوری دنیا میں بڑے کر و فر سے لہرا رہے ہیں۔ تو کیا دنیا کا مقدر صرف خواب اور شکست خواب ہی ہے؟ کیا انسانی ارتقا محض ایک دھوکا ہے؟ کیا دنیا کے انسانوں کے تقدیر میں ایک رات کے بعد دوسری رات ہی لکھی ہوئی ہے، کیا مظلوموں اور محنت کشوں کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے؟

ان سوالوں اور ان جیسے ان گنت سوالوں پر غور کرنے سے پہلے سوالوں کی درجہ بندی کر لی جائے۔ معاملات دو ہیں گو ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں پہلا مسئلہ ہے اشتراکیت کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کا جس کی مختلف شکلیں سوویت روس، یوگوسلاویہ، پولینڈ، ہنگری اور مشرقی جرمنی ـــ ورچین اور کیوبا ـــ میں اور رومانیہ اور البانیہ میں نظر آئیں۔ کیا اس انتظامی نظام اپنے رہنے بسنے والوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکا یا نہیں؟ اگر کیا تو کس حد تک اور اگر نہ کر سکا تو کس حد تک؟ اور اگر ناکامی ہوئی تو اس کی نوعیت کیا تھی اور اس کی ذمہ داری کس حد تک اہل اقتدار کے سر تھی اور کتنی

خود نظام کے سر؟

دوسرا مسئلہ ہے خود مارکسی طرز فکر اور بطور فلسفے کے مارکسزم کے جواز کا کیا فلسفے یا فکری نظام کی حیثیت سے مارکسزم قابل قبول ہے یا نہیں۔

پہلی بات یہ کہنے کی ہے کہ مارکسزم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے جو ہمیشہ کے لیے ہو اور جس کا رد و قبول ممکن نہ ہو۔ مارکسزم سائنس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یعنی اگر عقل کی کسوٹی پر پورا اترے تو اسے قبول کیجیے پورا نہ اترے تو اسے رد کر دیجیے۔ وہ عہد بعہد تبدیلیوں کا بھی منکر نہیں اس لیے جو اس کی گواہی اور عمل کی شہادت مارکسزم کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آخر کیا بپتا پڑی کہ ایک جگہ ۷۰ سال بعد سوویت روس اور ۴۵ سال بعد مشرقی یورپ کے ممالک کو اپنے انتظامی ڈھانچے اور سیاسی نظام کو بدلنے کی ضرورت پیش آئی۔ اگر دشمنوں سے بھی پوچھیے تو دو ہی باتیں بتائیں گے ایک یہ کہ وہاں انفرادی آزادی نہ تھی دوسرے یہ کہ وہاں معاشی آسودگی کی کمی تھی۔

جہاں تک انفرادی آزادی کا سوال ہے جس کے نہ ہونے کا شکوہ بول زے نتسن اور پسترناک کے حوالے سے کیا جاتا رہا ہے اسے کسی حد تک تسلیم کر لینے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں، یہ بات لینن ہی نہیں کمیونسٹ نظام کے سبھی معماروں نے کہی ہے کہ اشتراکی نظام قایم ہو جانے کے بعد کچھ عرصے تک اشتراکی نظام میں پرولتاری ڈکٹیٹر شپ قایم رہنا ناگزیر ہے یہ مستقل طور پر قایم نہیں رہے گی مگر کچھ مدت ضرور رہے گی خاص طور پر اس وجہ سے کہ یہ نظام طبقہ واری ہے اور استحصالی طبقے کے اثرات حکومت اور اقتدار ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اتنے زیادہ کہ وہ محنت کشوں کے اقتدار کو للکار سکتے ہیں اور اپنے قومی اور بین الاقوامی اثرات سے اس کا تختہ پلٹ سکتے ہیں۔

لہذا کچھ تعجب کی بات نہیں کہ انفرادی آزادی کے سوال کو سوویت یونین اور

سوشلسٹ ممالک کی اشتراکی اور نیم اشتراکی حکومتیں اس طرح حل نہیں کر سکیں جس طرح وہ غیر اشتراکی یا بورژوا جمہوری حکومتوں میں ہوا ہے۔ اس کمزوری میں اضافہ کیجیے اس کا کہ سوویت روس اپنے ۔ سارے وجود کے دوران بڑی مدت تک دنیا کا تنہا اشتراکی ملک رہا ہے اور چاروں طرف فاشسٹ اور سرمایہ دار ملکوں سے گھرا رہا ہے اور ان کی جارحیت کا شکار رہا ہے۔ یہ بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اشتراکی نظام انفرادی آزادی کے مسئلے کو حل نہیں کر سکا۔ یہ الگ سوال ہے کہ یہ مسئلہ کس طبقے کے ہاتھ پاتھ پر دم توڑنے والے فرد کا یا عیش محلوں میں بسنے والے فرد کا۔

اس سے بگڑا ہوا سوال ہے معیشت کا۔ ظاہر ہے کہ دشمنوں سے گھرا ہوا ایک ملک جو حال کے زمانے تک پس ماندہ تھا جینے کے لیے فوجی تیاریوں کے لیے مجبور تھا اور فوجی تیاریاں کیسی؟ ایٹمی جنگ کی تیاریاں جس میں ہر روز سائنس کی ایجادات نت نئے ہتھیاروں کا اضافہ کر رہی تھیں لہٰذا ایک ایسے ملک کے بجٹ پر اس کا اثر ناگزیر تھا اور اس کا اثر اتنا تو پڑنا ہی تھا کہ وہ معاشی خوشحالی وہاں نہ آئے جو بورژوا یورپی ممالک یا امریکہ میں آئے جہاں یا تو جنگ عظیم لڑی ہی نہیں گئی یا ان کی فوجی تیاریوں کا پورا بوجھ امریکہ نے اٹھا رکھا ہو۔

جو احباب (اور ان میں کمیونسٹ ملکوں کے رہنے والے بھی شامل ہیں) اسٹالن کے منہ پر کالک مل کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں بڑی زبردست کمیوں کے باوجود بھی وہ نظام تھا اور ہے جس نے

۱۔ روس جیسے پس ماندہ زار زدہ ملک کو جاگیردارانہ سطح سے ابھار کر مسلسل ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچایا کہ آج دنیا کے دو بڑے ملکوں میں ہے۔

۲۔ روس کو دوسری جنگ عظیم کی بدترین تباہیوں کے باوجود، صرف ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹ فوجوں کے مقابلے میں فتح دلائی اور اس تباہ شدہ ملک کو بہت ہی مختصر مدت میں دوبارہ تعمیر کر دیا کہ اپنے

پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ جہاں جہاں پر جنگ لڑی گئی وہ کسی ملک دوسرے اور تیسرے درجے کے ملک بن کر رہ گئے مثلاً افغانستان اور فرانس جہاں نے ترقی کی تو اول تو وہاں زمینی جنگ لڑی نہیں گئی دوسرے یہ ترقی تمام تر امریکہ کے سہارے ہوئی صرف سوویت روس نے جو کچھ ترقی کی اسپتنک بنائے، چاند پر کمندیں ڈالیں، ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنائے وہ بے منت غیر کی (اور اس کام میں اسٹالن کی انفرادی کوششوں کو بھی دخل تھا)

۳۔ اس پورے زمانے میں روس کے قید خانوں اور سائبیریا کے کس کس ٹریشن کیمپوں کا ذکر تو بہت ہوا مگر کسی نے ابھی تک یہ نہیں کہا کہ روس میں بھکاری بہت ہیں یا بیکار گاروں کی بڑی تعداد ہے یا لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں اور قحط میں بھوک سے مرتے ہیں مطلب اس کا یہ ہوا کہ یہ دور سابق میں پس ماندہ ملک جنگ عظیم کی ساری تباہیوں کے باوجود اس قابل رہا کہ اپنے بے حد طاقت ور دشمنوں کے مقابلے کے لیے دفاعی تیاریاں بھی کرے اور اپنے کروڑوں باشندوں میں سے ہر ایک کو روٹی، کپڑا اور مکان بھی فراہم کرے۔ (یہ مان لیجیے کہ کپڑا موٹا جھوٹا، روٹی ادنیٰ درجے کی اور مکان معمولی رہا ہوگا) مگر کیا یہ کارنامہ معمولی ہے؟

۴۔ دور حاضر کی بات جانے دیجیے بڑے سے بڑے کمیونسٹ دشمن نے سوویت روس کے اس معاشرے میں سمگلنگ، نشہ آور دواؤں، قحبہ خانوں اور نائٹ کلبوں کا ذکر نہیں کیا یعنی "خوش حال" بورژوا معاشرے کے برخلاف یہ کسی قدر کم "خوش حال" معاشرہ بورژوا معاشرے کے انحطاط سے محفوظ تھا اسمگلنگ کا دھندا استحصال کے بھیانک روپ، جسم فروشی سے محفوظ۔

بیشک اس معاشرے میں کمیاں تھیں اور سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ استحصال زدہ مجبوری رشتوں کے بجائے خود ایک طرح کی نوکر شاہی میں تبدیل ہو گیا تھا نشانیاں اس کی سول نے نت سن اور پاسترناک کے ناولوں اور قصوں میں ملیں گی اور اس کی وجہ سے پورے معاشرے میں ایک قسم کی گھٹن محسوس کی جانے لگی اور آخر کار وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے یعنی

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام

گویا جو کچھ ہوا ہے وہ صرف اتنا ہوا ہے کہ سوویت نظام اور اشتراکی نظام کی دو بنیادی خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے،

اول یہ کہ یہ نظام انفرادی آزادی کا مسئلہ حل نہ کر سکا اور اس مسئلے کے حل نہ کرنے سے پارٹی کے کارکنوں میں خود اپنی آمرانہ نوکر شاہی پیدا ہو گئی جس نے استحصالی رخ اختیار کر لیا۔

دوسرے یہ کہ معاشی ضرورتوں کو یہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام کی سطح پر پورا کرنے میں ناکامیاب رہا (اس کے اسباب سے بحث نہیں) اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یاران طریقت نے ضروریات سے متعین ہونے والی معیشت کے بجائے بازار کے تقاضوں سے متعین ہونے والی معیشت اپنانے کا فیصلہ کیا (گویا گھڑی کی سوئیوں کو اشتراکی نظام کے بجائے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف گھما دیا۔)

بجا اور درست، اگر واقعی انسانیت بازار کی ضرورتوں سے جڑ کر ہی خوش رہ سکتی ہے تو یونہی سہی۔ مارکسزم ہو یا اشتراکیت، ان سب کو رد کیا جا سکتا ہے مگر ٹھہریے، اس مرحلے پر ایک نظر سرمایہ دارانہ نظام کے اعلیٰ ترین مراکز پر بھی ڈالتے چلیں۔ امریکی سماج کی برائیاں گنانا مقصود نہیں لیکن اتنا تو دوست دشمن سبھی مانتے ہیں کہ امریکی نظام اپنے اسمیگ، اپنے تناؤ بھرے اعصاب زدہ مزاج، نائٹ کلبوں اور بے کل معاشرے کے پیش نظر کم سے کم مثالی نظام نہیں ہے اور بادی النظر

ذہنی نفسی اور جذباتی صحت خود اقدار کے پیش نظر سوویت نظام اس سے کہیں بہتر تھا یا کسی حد تک ہے یہاں وہ تحریک نا بالغوں کی بھرتی ہے جو ہر دو اعلیٰ کو توڑنے فارغ فورتھ اسٹیٹ بنا کر ہوئی منتظر طوائفیں اور اوزی ہیں ایک کے لئے میں جان دینے والے امریکی نوجوان ہیں جن کی لاشیں نیویارک روانی اور سلی کے احاطے سے اٹھائی جاتی ہیں۔

اشتراکیت ہے کیا؟ صرف یہی تو ہے کہ پیداوار خواہ زراعتی ہو یا صنعتی اشخاص کے لیے نہ کی جائے بلکہ انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور یعنی آپ کی اور ہماری زندگی پر حکمرانی مارکیٹ کی نہ ہو ہمارے فطری تقاضوں کی ہو۔ ظاہر ہے بات سیدھی سادی ہے مگر ہے خاصی دشوار کیونکہ انسان صدیوں سے خود غرضی اور جمع خوری کی بیماریوں میں مبتلا ہے اور وہ اپنا قد نا پتلا ہے تو اپنے مقبوضات سے ہزاروں سال نے اسے استحصال سکھایا ہے، ذاتی جائیداد حاصل کرنے اور ذاتی دولت کمانے کی سیکھ دی ہے اس میں لالچ پیدا کیا، ذاتی اور نجی دولت کا تصور پیدا کیا ہے گویا سوال تھا اور ہے ـــــ اس لالچ، خود غرضی اور نجی سوار تھے آزاد انسانی شخصیت کی تعمیر نو کا۔ اور جو احباب صنعتی پیداوار میں ذاتی نفع یا خود مزدوروں میں بھی انفرادی کوششوں کا معاوضہ ذاتی آمدنی کے تصور داخل کرنا چاہتے ہیں وہ گویا نئے انسان کی تشکیل سے ناامید ہو کر پرانے راستے کا رخ کرتے ہیں۔ اشتراکی نظام کو رد کر کے مارکیٹ کے نظام کو نافذ کرنے کے اس کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں۔

کیا مادی جائیداد اور جمع خوری کے لالچ کے علاوہ انسان کے لیے بہتر کام کرنے کے لیے دوسرے محرکات نہیں ہو سکتے۔ کیا انسان سدا انہی لالچوں میں گھرا رہے گا اور اپنے ملکیت اور دولت کے کھاتے ہی تصنیف کرتا رہے گا۔ ہو سکتے یاد ہو سکتے ہونے کی بات یہ ہے کہ اس نئے انسان کی تشکیل کا خواب کیا واقعی دیکھنے کے قابل تھا یا ایسے انسان کا خواب جو محض جوڑے ہوئے پیسوں اور حاصل کی ہوئی دولت

اور دوسرے دوسروں کا استحصال کرنے کی اپنی صلاحیت سے اپنے آپ کو دور نہ چاہے بلکہ اپنی کامیابی کے اس سے مختلف اور اس سے بہتر معیار کا حل کرے۔ مارکسزم اور کمیونزم اگر اس تشکیل نو میں کامیاب ہو سکے تو بھی مگر یہ کوشش تو مبارک ہے تاکہ آدمی منافع خوری، دولت پرستی جائیداد اور استحصال کے چکر سے نکلے اور اپنی ضروریات کے مطابق پیداوار بنا کر خوش ہو اور اس پیداوار کا معیار ہی نہیں اس کی اپنی زندگی کا معیار بھی بلند ہو۔ اس کی اپنی شخصیت زیادہ ذہنی اور جذباتی آسودگی اور سربلندی پائے اور نون، تیل، لکڑی کے چکر سے آزاد ہو۔ اگر اس خواب کی تعبیر سرمایہ دارانہ نظام فراہم کر سکتا ہو تو کرے۔ استحصال اور استبداد کو بند کرے اور فطرت آزادی کے طلبگار نت نئے وہت نام اور نکار اگوا بنانا بند کریں اور انسانیت کی عالمی ترقی میں معاون ہوں جو اشتراکیت اور دیگر تجربوں سے کہیں عظیم کام ہے۔

اب اس مسئلے کے دوسرے پہلو پر غور کیجیے، کیا مارکسزم ناکام ہو گیا؟

مارکسزم کیا ہے؟ اس کی اصل ہے مادی جدلیت یعنی یہ اصول کہ دنیا میں جو کچھ بھی ترقی ہو رہی ہے وہ طبقاتی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور طبقات دو ہیں ایک استحصالی اور دوسرا وہ جس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کے چار پہلو ہیں اور چاروں پہلوؤں پر الگ الگ غور کرنا چاہیے۔

پہلا عملی پہلو ہے یعنی موجودہ سماج میں استحصال ہے اور اسے طبقاتی ٹکراؤ کے ذریعے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس مسئلے پر لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو سوچتے ہیں کہ ٹکراؤ سے یہ مسئلہ حل نہیں بلکہ تدریجی ارتقا سے حل ہو جائے گا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اہل ثروت کو خطا کا مقرر کردہ غریبوں اور استحصال ہونے والوں کا محافظ جانتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو سرمایہ داری کے اندر ہی نجات کا امکان دیکھتے ہیں اور یہ بھی سوچتے ہیں کہ وقت خود اپنا مرہم ہے۔ ممکن ہے بعض کے فکری رویے درست ہوں لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے اور استحصال

[illegible] فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور کسی دوسری [illegible] سب باشندوں کو بیروزگاری سے بھی آزاد نہیں کر سکے ہیں اور ان کی بنیادی [illegible] پوری نہیں کر پائے ہیں۔

مثال کے طور پر جاپان معاشی رو سے بہت آگے نکل گیا مگر اس سماج میں بھی روٹی روزی کا حق سب کو نہیں ہے۔ امریکہ میں بے روزگاروں کی فوج موجود ہے اور اس کی پوری معیشت ہتھیار بیچنے کی صنعت پر کھڑی ہے۔ برطانیہ دوسرے درجے کی طاقت بن چکا ہے اور اس کی معاشیات امریکہ پر منحصر ہے۔ اس کے مقابلے میں سوویت نظام میں لاکھوں خلا بیاں ہوں اور وہ اپنے باشندوں کو امریکہ اور برطانیہ کا سا اعلیٰ معیار زندگی نہ بھی دے پایا تو بھی یہ ہر ایک کہتا ہے کہ وہاں بیکاریوں اور بے روزگاروں کی فوج نہیں ہے۔ سب کو روٹی روزی حق ہے اور سب کے سر پر مکان کی چھت ہے یا تھی۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبقاتی آویزش نے بہرحال اس مسئلے کو مکمل طور پر نہ سہی جزوی طور پر حل تو کیا اور اس کی مثالیں مشرقی یورپ کے ممالک ہی سے نہیں چین، کیوبا، ویت نام سے بھی فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ان ممالک سے بھی کم سے کم قحط اور بھوک مری کی خبریں نہیں آتیں۔ کم و بیش یہی صورت حال مشرقی یورپ کے اشتراکی یا نیم اشتراکی ملکوں کی بھی ہے۔

دوسرا پہلو اس مسئلے کا یہ ہے کہ استحصال ہی کا انکار کر دیا جائے کہ دراصل آزادی اسی کا نام ہے کہ معیشت کی اجتماعی اور سماجی نوعیت نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد ہی کھلے بازار اور انفرادی منافع خوری پر ہو۔ یہ صحیح ہے کہ سوویت روس نے معاشیات اور معیشت کی سطح پر کیا، اس میں ذاتی ہاتھ بڑھانے اور نجی ملکیت اور دولت جمع کرنے کی آزادی نہیں تھی اور اسے استحصال کی بنیاد قرار دیا گیا۔ اور سوشلزم کی اصل ہی یہ ہے کہ پیداوار ضرورت کے لیے ہو منافع کے لیے نہ ہو۔ منافع

[illegible] ہے [illegible] تو اس کے [illegible] انسان کی [illegible] تکمیل [illegible]
[illegible] کے لیے انسان میں ذاتی منافع خوری [illegible] خود غرضی
[illegible] کو [illegible] استعمال کر کے [illegible] اور [illegible] کے
[illegible] کے مقابلے (OPEN COMPETITION) کا جو نظام قائم کیا تھا اس کے مقابلے
میں [illegible] مارکس ایک ایسے انسان کا تصور پیش کر رہے تھے جو ذاتی غرض
سے بلند ہو کر سماجی فلاح اور وسیع تر انسانی بہبودی کے تصور کی بنا پر
محنت کرے اور جی جان سے کام کرنے میں لگا رہے۔

اگر کمپیوٹر یا مشینیں کم وقت میں اس کے تقاضوں کو پورا کر دیں تو بجائے
شکر میں گھلنے کے مشینیں اتنے زیادہ وقت بیکار پڑی ہیں اور کام میں
دخل دینے کی وجہ سے اس کا زیاں ہو رہا ہے وہ آرام کرے اور عام انسانوں کو اور اپنے
ذہنوں کو اعلیٰ تر غیر معاشی سرگرمیوں میں شریک ہونے کا وقت اور حوصلہ دے
مثلاً کھیل کود فنون لطیفہ بہتر زندگی کے لیے تحقیق اور فکری مشغلے۔ اس لیے مارکس
نے اس دن کا خواب دیکھا تھا جب ذہنی اور جسمانی محنت یکساں ہو جائیں گی اور
محنت کش بجائے مشینوں کی مدد سے اتنی کم مدت میں کام کر کے ضروریات پوری کر سکے
جو اتنی کم مدت میں فکری سطح پر کام کرنے والے کرتے ہیں۔

اب سوال یہ بھی ہے کہ ضرورت سے ہماری کیا مراد ہے؟ بے شک ضرورت سے
مراد ہے متعلقہ علاقے اور ملک کے لوگوں کی ضرورت کا سامان۔ بلاشبہ اس سے یہ
بھی مراد ہے کہ اس سامان میں تنوع بھی ہو اور مقداری کے لحاظ سے وہی معیار
کے اعتبار سے یہ سامان بہتر ہو اور سب لوگوں تک پہنچے۔ لیکن جب آپ سب لوگوں
تک پہنچانے کی بات کرتے ہیں تو اس سامان میں کسی قدر یکسانیت لانی ضروری
ہے اور اس کا معیار بھی اتنا بلند نہیں ہو سکتا جتنا مارکیٹ کے منافع کے لیے پیدا
[illegible] سامان کا ہوتا ہے لیکن بعض حالتوں میں ہیں معاشرے کا معیار
[illegible] تو معیار بھی بلند ہوگا۔

[illegible]

[illegible] ہے یہ بھی تو ہوگا کہ وہاں [illegible] استحصال [illegible]
[illegible] ملکوں کے [illegible] کی [illegible]
[illegible] ہے یہ بھی ہے کہ انقلاب [illegible] کیا جا سکتا بھی دست ہے کہ [illegible]
ملک پر انقلاب نہیں ٹھونسا جا سکتا مگر اس کے باوجود [illegible]
انقلابی تحریکیں اور آزادی اور سوشلزم کے لیے جہاد کسی فیصلہ کن موڑ پر [illegible]
ہیں اشتراکی حکومتوں کو اپنا فرض ادا کرنا ہوگا اور اشتراکی سماج کے ظہور کو [illegible]
یا خود غرضانہ تصور ملکیت کے بجائے عالمی انقلاب کے اسی تصور سے زیادہ اور بہتر
پیداوار کے لیے حوصلہ ملنا چاہیے۔

اس منزل میں مشین منافع خوری سے وسیلے کی حیثیت سے احساس مروت
کو کچلنے والے آلے کی شکل اختیار نہیں کرتی جسے فراڈ یا جس کی نفی اقبال کے لفظوں
میں اس طرح لازم آئے کہ ؎

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بلکہ وسیع تر..... ضروریات کے تقاضے کے مطابق انسان کی محنت کو بچانے والی
اور اسے آسودگی سے زیادہ وقت اور آرام دینے والی چیز بن جاتی ہے اور انسان ایک
سائنٹی فک دشمن اور فکر دشمن (ANTI RATIONAL) اور منطق دشمن رویہ اختیار کرنے
کے بجائے سائنس، فکر اور منطق سے قریب تر ہوتا ہے اور قنوطیت اور بے بسی اور
سپردگی، بجائے امید، حوصلے اور اعتماد حاصل کرتا ہے یہی اس نئے انسان کی صورت
ہے جو سوشلزم کا مقصود ہے۔

مسئلے کا تیسرا پہلو ہے کہ استحصال کو ختم کرنے والی اس جدلیت کا طریق کار
کیا ہو۔ ظاہر ہے مارکسزم نے اس کا طریق کار طبقاتی آویزش قرار دیا ہے اور اس کا
فکری اور سائنسی ثبوت بھی دے دیا ہے معاشروں کی تبدیلیوں سے بلکہ [illegible]
کرنے اور بھاپ بن جانے سے فراہم کیا ہے ملاحظہ ہو TEXT BOOK OF MARXISM (MOSCOW)

اور طبقاتی شعور صرف انقلاب سے قبل والی صورت حال ہی میں نہیں ہوتا اس کے بعد کی صورت حال میں بھی موجود رہتا ہے تاوقتیکہ استحصال کرنے والے طبقے کا وجود ختم ہو جائے اور جب طبقے ختم ہو جائیں یا ان کی استحصالی نوعیت ختم ہو جائے تو پرولیتاریہ کے لفظوں میں ایک ایسا دور شروع ہوگا جب دنیا کو حکومت کی فوجوں کو اور پولیس وغیرہ کے نظام جبر کی ضرورت نہ رہے گی اور یہ چیزیں آثار قدیمہ میں شمار ہو کر عجائب خانوں میں سجا دی جائیں گی اور یہی منزل کمیونزم کی منزل ہے

جہاں تک طبقاتی آویزش کے طریق کار کا سوال ہے اتنی بات واضح ہے کہ اس کی رہبری ان طبقوں کے ہاتھوں میں ہونی لازمی ہے جن کا استحصال کیا جا رہا ہے اور جن کے لیے فوری طور پر سماجی تبدیلی، زندگی اور موت کا سوال بنی ہوئی ہے ظاہر ہے کہ ان طبقوں میں مزدور، کسان اور محنت کش سب سے آگے آگے ہیں اور چونکہ اس قسم کی جدوجہد میں صرف ضرورت کا احساس ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ نظریاتی شعور اور مجاہدانہ ڈسپلن بھی ضروری ہوتا ہے اس لیے اشتراکی جماعتیں اور کمیونسٹ پارٹیاں بنیں اور انھیں محنت کشوں کے طبقوں میں یہ انقلابی شعور پھیلانے، ان میں سماجی تبدیلی اور انصاف طلبی کے احساسات جگانے اور ایک اصول اور نظریے کے مطابق جدوجہد کا حوصلہ پیدا کرنے اور اس کی رہبری کرنے کا کام سنبھالنا پڑا اور اس طرح کمیونسٹ پارٹیوں کو پوری طبقاتی جدوجہد کی لڑائی میں سربراہ کا منصب حاصل ہو گیا۔

یہ طے ہے کہ جن ممالک میں بھی آج تک کمیونسٹ انقلاب آیا ہے ان میں سے ہر ملک میں انقلاب کا راستہ مختلف رہا ہے اور کوئی دو ملک ایسے نہیں ہیں جہاں بالکل ایک ہی انداز سے انقلاب آیا ہو۔ روس میں مزدوروں نے انقلاب کی رہبری کی اور ہر علاقے میں سوویت بنا کر انقلاب سے پہلے ہی اپنی متبادل حکومت بنا لی، چین میں کسانوں نے رہبری کی اور سرخ فوج کی شکل میں انقلابی تحریک کو مجاہدانہ رخ دے دیا، کیوبا میں ان دونوں سے مختلف صورت پیش آئی، مشرقی

یورپ کے ممالک میں ہٹلر کے فاشسٹ قبضے کے خلاف دوسری جنگ عظیم کے دوران آزادی کی جدوجہد کے جلو میں اشتراکی انقلاب آیا۔ یوں نام میں اس کی شکل بھی جارحیت کی مخالف تحریک کی ہو گئی۔ غرض جتنے ملک اتنے ہی راستے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس راہ میں کئی مجاہدانہ تحریکیں کامیاب نہیں ہوئیں اور زمین خون سے لالہ زار ہو گئی۔ ایران میں تودہ پارٹی، انڈونیشیا اور ملی میں تمام جمہوریت پسندوں کا قتل عام اور خود اسپین میں دوسری جنگ عظیم سے قبل کی صورت حال اس کی صرف چند مثالیں ہیں۔

جس طرح انقلاب کے دوران طبقاتی کشمکش مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور کسی مخصوص نصاب کی پابند نہیں ہوتی اسی طرح انقلاب کے بعد بھی ہر ملک کی روداد مختلف ہوتی ہے اور یہ روداد صرف کامیابیوں ہی کی نہیں ہوتی ناکامیوں کی بھی ہوتی ہے کہیں کمیونسٹ پارٹیاں اپنا حوصلہ اور عالمی انقلاب کے لیے اپنا جوش کھو بیٹھتی ہیں اور اس کے کارکن اور رہبر نوکر شاہی کی نذر ہو جاتی ہیں کہیں کھوتہ بازی میں پھنس جاتے ہیں کہیں نظریاتی غلطیوں اور عملی فروگزاشتوں کا بھی شکار ہوتے ہیں (مثلاً چین کے تہذیبی انقلاب کی دستاویزوں میں اور اس کے بعد خود تہذیبی انقلاب کی تنقید میں ملیں گی) یہ بات البتہ افسوسناک ہے کہ کمیونسٹ پارٹیاں تب کے پانی کے ساتھ ساتھ بچے کو بھی پھینکتی آئی ہیں جس کا کوئی جواز نہیں ہے سیاست اور فکر دونوں میں ——— موڑ پھیر آتے ہیں ہر موڑ پھیر کے ساتھ کچھ افراد (یا گروہوں) کے نام جڑ جاتے ہیں اب اگر وہ غلط اور گمراہ کن بھی ہوں تو ان کی تاریخی حیثیت کا انکار تو ممکن نہیں ہوتا دوسرے خود مارکسی فلسفۂ فکر کے مطابق کوئی نظریہ محض کسی ایک فرد واحد کی ذہنی اپج نہیں ہوتا اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی عصری بلکہ طبقہ، احساس اور فکر کا عنصر کارفرما رہتا ہے لیکن روز اول سے مارکسی فکر اس کی نفی کرتی آئی ہے۔

اسٹالن نے اقتدار پایا تو اپنے سبھی حریفوں کو غدار قرار دے کر انھیں گولی مار دی

مخالفت کر دیا ان میں ٹراٹسکی جیسا اہم رہنما بھی تھا بے شک اس کے خیالات کی سخت تنقید کی جاتی ..... اس طرح اس کا مقابلہ ہرگز ضروری نہیں تھا۔ اسٹالن کے بعد آنے والوں نے اسٹالن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو یہ ہوئی کہ بچارے کی ہڈیوں تک کو مقبرے سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا گیا اور ہر قسم کے گناہوں، گمراہیوں اور کمزوریوں کی ذمہ داری اسٹالن پر ڈال دی۔ اس اسٹالن پر جس نے لینن کی وفات سے لے کر خود اپنی وفات تک سوویت روس کے اشتراکی سماج کی سربراہی کی تھی دوسری جنگ عظیم جیتی تھی اور سوویت روس کو ایک پس ماندہ زرعی ملک کی سطح سے اوپر اٹھا کر دنیا کے دو اعلیٰ ترین ملکوں کے درجے تک پہنچایا تھا۔

اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اسٹالن کے بعد برسر آنے والا اپنے سے پہلے حکمراں اور سربراہ کو سوویت یونین اور اشتراکی دنیا کی تاریخ ہی سے خارج کرنے پر تلا ہوا ہے انتہا یہ ہوئی ہے کہ اسٹالن کے زمانے کی لکھی ہوئی سوویت کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ واپس لے لی گئی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ سوویٹ یونین کو کوئی مستند اور معروضی تاریخ ہی مرتب نہ ہو پائے گی آج تو خرشچیف سے لے کر برزنیف تک سبھی پر سوالیہ نشان لگایا جا رہا ہے اور جیسے ہر مذہبی رہنما کی سوانح لکھتے وقت یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ان سے نزول سے پہلے پوری دنیا گمراہی اور جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کھوئی ہوئی تھی اسی طرح ہر زندہ اشتراکی سربراہ کے کارناموں کی داستان لکھتے وقت دیکھنے میں آرہا ہے بلکہ یہ ہے کہ صرف روس ہی میں نہیں چین میں بھی یہی حال ہے۔ ماؤزے تنگ اور چو این لائی کی 'تکفیر' آخر کیا ضرور ہے؟

آیئے اب ہم مسئلے کے چوتھے پہلو پر غور کریں۔ یعنی کیا واقعی مارکسزم بحیثیت ایک نظام فکر کے ضروری ہے؟ اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے بڑے حصے میں استحصال نظام قایم ہے۔ آدھی دنیا بھوکی ہے، ننگی ہے، جہالت اور بیماری کا شکار ہے اور خود بورژوا ترقی یافتہ ملکوں کے معاشرے، بیروزگاری سے آزاد نہیں ہیں

پس ماندہ ملکوں کی لوٹ میں شریک ہیں یا انھیں لڑا کر منافع کما رہے ہیں اور ان کی ہم نہاد آسودہ حال معاشرے بھی اعصابی تشنج، توہم پرستی، مخنوطیت اور اسیکس اور نشہ پرستی اور جنس زدگی کی انحطاطی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس غربت، جہالت، بیماری اور بھوک کو کس طرح ختم کیا جائے سرمایہ داری نظریہ اسے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے اس کا ثبوت امریکہ میں بیروزگاروں کی تعداد سے فراہم ہو سکتا ہے مزید ثبوت چاہیے تو اس نظام میں آنے والی تیزی اور مندی کے چکر کافی ہیں جنھیں ماہرین اقتصادیات الفلاطر اور [illegible] کے ناموں سے یاد کرتے ہیں دوسری طرف روس، چین اور کیوبا کم سے کم یہ تو دکھا ہی چکے ہیں کہ وہاں بیروزگاری نہیں رہی (بے شک روس پر آپ سائبیریا کے [illegible] کا الزام لگائیں، اسٹالن پر قتل عام کی فرد جرم نافذ کر دیں) مگر چین میں کوئی سائبیریا نہیں اور کیوبا میں بھی اس قسم کے قید خانوں کا ابھی تک کسی نے ذکر نہیں کیا۔ ہنگری، پولینڈ، رومانیا اور چیکوسلوا میں حرکے ذکر تو ہوئے مگر بڑے پیمانے پر لیبر کیمپوں کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی صورت ہے پس ماندہ ملکوں کے لوگوں کی نجات کی تو وہ یہی ہے جسے مارکسزم نے طبقاتی کشمکش کہا ہے اب اس طبقاتی کشمکش کی صورت کیا ہوگی اور اس کی رہنمائی میں محنت کش طبقوں اور ان کی پارٹی کا کیا مقام اور کیا درجہ ہوگا؟ یہ سوال وقت کے ساتھ نئی نوعیت اختیار کرتا رہے گا اور اس میں برابر اضافے اور ترمیم کی گنجائش رہے گی۔ بے شک سوشلزم کمیونزم سے جدا ہے اور جب کروڑوں انسانوں کو انتہائی غربت کی سطح سے کم سے کم وقت میں اوپر اٹھائے گا کہ طرز زیست کے اعلیٰ معیار میں کمی آئے گی، سب کو ضرورت کی چیزیں تو مل جائیں گی مگر کم کم ملیں گی اور اعلیٰ درجے کی نہیں ملیں گی اور کمیونزم کے مطابق نہیں ملیں گی۔ اب آپ اسے جبر کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ یہ جبر عیش پسندی پر ہے، یہ جبر سماجی ضرورت پر ہے، یہ جبر ذاتی ملکیت پر ہے، ذخیرہ اندوزی پر ہے جائیداد

جمع کرنے، دولت کی نمائش کرنے پر ہے۔ نفع خوری اور منافع بازی پر ہے۔

حالیہ بحران میں جو باتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن لوگوں نے یہ نظام نافذ کیا ان میں خود منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، ذاتی ملکیت اور طاقت پرستی کا رجحان پیدا ہو گیا اور پارٹی کے اندر خود ایک مفادات کا طبقہ پیدا ہو گیا اور اس نے افسر شاہی کے روپ اپنا لیے یہاں اس پر غور کیا جانا چاہیے کہ اس خطرناک بیماری کو دور کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور ایسے کونسے ضوابط ہیں جن کی بنیاد پر افسر شاہی پنپنے سے روکا جا سکتا ہے یہ سوال معمولی نہیں ہے نہایت اہم ہے کیونکہ اسی سے جڑا ہوا معاملہ ہے بہتر انسان کی نشو و نما کا۔ کیا ذاتی ملکیت اور ذاتی اقدار انسانی جبلت ہے یا محض حالات کی پروردہ ہے اور اسے حالات کے بدل دینے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ معاشرے ہی میں نہیں پارٹی میں بھی جمہوریت کا زیادہ عمل دخل ہو اور کسی شخص یا گروہ کی بڑھتی ہوئی طاقت یا اقتدار پرستی پر نظر رکھی جائے مختلف الخیال گروہوں اور افراد کو زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں یعنی محنت کشوں میں انفرادی زر طلبی اور ملکیت پرستی کے رجحان کو دور کرنے کے طریقے اختیار کیے جائیں۔

ان چار پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد سوال ہے ادب پر ان تصورات کے اثرات کا۔ ترقی پسند ادب کی اصطلاح اردو میں رائج ہوئی مگر مارکسزم کے اثرات نے پوری دنیا کے ادب کو متاثر کیا اور مختلف طریقوں سے اپنا اثر جمایا۔ ان اثرات کی نوعیت آج کیا ہے؟

مارکسزم نے فلسفیانہ سطح پر چار تصورات پیش کیے ہیں۔ ایک اقدار کے اضافی ہونے کا سوال یعنی ہر چیز اور ہر تصور زمان و مکان کا تابع ہے اور قدر مطلق کا کوئی وجود نہیں دوسرے اقدار اور زندگی کے ہمہ وقت تغیر پذیر ہونے کا تصور یعنی ادب

ہو یا فلسفہ، فزکس ہو یا کوئی مادی وجود، وہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے ارتقائی منزل حالت میں رہتا ہے اس لیے زندگی کا کوئی موڑ محض نقطہ نہیں ہے سلسلہ ہے پورا ایک عمل ہے اور اسی کے پس منظر میں ہر نقطہ کو سمجھا جانا چاہیے۔ تیسرا تصور جدلیت کا ہے یعنی ہر شے اپنے اندر ٹکرانے والے دو اجزا کی آویزش سے بڑھتی ہے اور چوتھا تصور خیال اور مادے یعنی ادب اور زندگی کے ایک دوسرے اثر انداز ہونے کا یعنی مادہ خیال کو بدلتا ہے اور خیال مادے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

غور کیجیے تو یہی تھے جنھوں نے عالمی ادب میں مارکسی اثرات کو رائج کیا۔

جب کوئی قدر مطلق نہیں ہے تو انقلابی ادب یا ترقی پسند ادب کا تصور بھی مطلق نہیں ہو سکتا جب ہر تصور تغیر پذیر ہے تو یہ تصور بھی ضرور تغیر پذیر ہوگا جب ہر شے میں جدلیت کا رفرما ہے تو ترقی پسند ادب میں بھی یہ جدلیت موجود ہوگی اور جب ہر تصور زندگی یا ماحول سے ابھرتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے تو ترقی پسند ادب بھی حالات سے پیدا بھی ہوگا اور ان پر اثر انداز بھی ہوگا دونوں قسم کا رشتہ رکھے گا اثر پذیری کا بھی اور اثر اندازی کا بھی۔

یہ باتیں مان لی جائیں تو سیدھا صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پرانے زمانوں کو چھوڑیے آج کے زمانے میں بھی کم سے کم تین قسم کے معاشروں کے ادبیات میں ترقی پسندی کی جن مختلف (متضاد بھی) شکلیں ہوں گی۔ ایک اس معاشرے میں انقلاب کے لیے کوشاں ہے یا اس کا متمنی ہے وہاں ایسا تمام ادب ترقی پسند ہوگا جو کسی نہ کسی شکل میں سماجی تبدیلی کے لیے ذہنوں کو تیار کرتا ہے یہ تک وہ اس تبدیلی کی سمت اور شکل واضح نہیں کر پاتا مگر کشش کی طرف توجہ دلاتا ہے اور انقلاب کی جذباتی اور جمالیاتی فضا تیار کرتا ہے اسے قبل انقلابی کہا جا سکتا ہے اس قسم کے ادب کے اندر بھی جدلیت کی موجودگی ناگزیر ہے یعنی اس میں ایسے عناصر بھی ہوں گے جو دقیانوسیت پرست اور رجعت پسند ہوں (اور ممکن ہے مصنف کا رویہ ان عناصر کی طرف ہمدردانہ بھی ہو) اور ایسے

نصر بھی ہوں گے جو سماجی تبدیلی کی خواہش بیدار کرتے ہوں اور صحت مند تبدیلی
کا ارمان پیدا کرتے ہوں (مثالیں لینن کے ٹالسٹائے پر مضمون اور مارکس کے
غالب پر مضمون سے فراہم کی جا سکتی ہیں) دوسرا اس دور کا ادب ہوگا جس میں
انقلاب ہو رہا ہو اس وقت کا ادب یقیناً خندق کے اس پار یا اس پار کا ادب
ہوگا۔ اس دور کے ادب کا لہجہ زیادہ تر ہنگامی اور خطابیہ ہونا لازم ہے اور اس
کا دوام سے رشتہ، ان انقلابی لمحوں کے دوام سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ
مصنف کے اپنی عصری وابستگیوں اور گہرے جذباتی شرکت سے بھی اس
دور کے ادب کے جمالیاتی پہلو کا تعین ہوگا۔ تیسرا ادب اس دور کا ہوگا جب
انقلاب ہو چکا ہو۔ ایسے معاشرے کے ادب میں دو قسم کی تقسیمیں واضح ہوتی
ہیں گی۔ ایک ان طبقوں کا ادب جو ابھی خواندگی اور تہذیب سے روشناس
ہوئے ہیں دوسرے اس طبقے کا ادب جس کی وراثت اور روایت کا رشتہ پرانے
بعد انقلاب دور کے ادب کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شخص،
جماعت یا ادارہ ادب کا تجزیہ تو کر سکتے ہیں مگر ادب پیدا کرنے کا کوئی نسخہ نہیں بتا
سکتے یا کوئی ایسا فارمولا ایجاد یا متعین نہیں کر سکتے جو اچھے ادب کی تخلیق کی
ضمانت دے سکے اسی طرح کوئی ادب کسی ایک قسم کے لہجے یا اسلوب کا پابند نہیں
کیا جا سکتا (اور اسی لیے محض ہنگامی یا خطابیہ لہجے کو اس دور یا کسی اور دور کے
ادب پسند ادب کی پہچان قرار نہیں دیا جا سکتا۔)

ان باتوں کو اگر مان لیا جائے تو پھر مختلف ادوار کے ادب کے بارے میں
اس قسم کے نتیجے نکلتے ہیں۔

پہلے دور کے ادب میں (یعنی قبل انقلاب کے ادب میں) دقیانوسی
رجعت پسند عناصر اور ترقی پسند عناصر کو الگ الگ کرنا ہوگا اور یہی اس کی
جمالیاتی نوعیت ہوگی۔ یہ صورت حال اقبال وغیرہ کے ہاں پیش آتی ہے
یا تو جوش بیان میں ان کے صرف ترقی پسند پہلو پر زور دے کر انھیں انقلابی

اور اشتراکی شاعر تک کہہ دیا جاتا ہے یا پھر دوسرے حصے پر زور دیا جاتا ہے اور انہیں فاشسٹ اور رجعت پسند قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے دور کے ادب یعنی انقلابی ادب کا جواز تو انقلابی صورتوں کے دوران ہی پیدا ہوتا ہے ان صورتوں کے بغیر جو "انقلابی" ادب پیدا ہوتا ہے وہ چونکہ غیر حقیقی ہوتا ہے لہٰذا اس پر رجعانی یا جنگی ادب کا الزام عائد ہوگا اور ان میں سے بیشتر حصہ نعرے بازی پر مشتمل ہوگا۔

۳۔ تیسرے دور کے ادب یعنی بعد انقلاب ادب میں جان آئے گی۔ ادب کی اپنی ذہنی اور جذباتی وابستگیوں سے جن کی مدد سے وہ صرف اپنے دور کی ترقیوں کا ذکر نہیں کرے گا بلکہ ان کی ناتمامیوں کا بھی ذکر کرے گا۔

خلاصہ بحث کا یہ ہے کہ ادب پر فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ سوشلسٹ رجحان کا کوئی سکہ بند تصور نہیں کیا جا سکتا اور ترقی پسند ادب کی پہچان (۱) نہ تو محض اس کے موضوع کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔

(۲) نہ محض اس کے خطیبانہ لہجے یا تبلیغی انداز پر کی جا سکتی ہے بلکہ اس کے عمومی نقطۂ نظر کی بنیاد پر کی جانی چاہیے شاعر اور ادیب ہمیں معاشرے کا کوئی صالح اور مثبت پہلو تصور دیتا ہے اور آرٹ کے ذریعے جمالیاتی ہم آہنگیاں (فن کار اور تصور فرد اور معاشرے کے درمیان) پیدا کرتا ہے تو یہی ترقی پسندی ہے جسے دوسرے لفظوں میں روشن خیالی کہا جا سکتا ہے اسی طرح محض لہجے کا خطیبانہ یا تبلیغی ہونا قطعی ہونا ضروری نہیں یہاں تو کاج اور سیفت کی کشش کی طرف توجہ دینا ضروری ہے جسے بعد کے مارکسی مصنفین مثلاً اور ہنگن نے اور آگے بڑھایا کہ ادب مکمل اور مربوط اکائی کے طور پر زندگی کو پیش نہیں کرتا کہ یہ لوزڑ تصور ہے جو مقدرات اور ناقابل تغیر اشیا کا حصہ قرار دیتا ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے جسے مخاطبین بدل بھی سکتے ہیں اور اس کو خود اپنے تئیں نئے معنی دے سکتے ہیں یہی بات التھیوسر سے لے کر دلاں بارتھ اور

ویسین گورلڈ مین تک کی تنقیدی تحریروں میں STRUCTURALISM اور POST STRUCTURALISM بن کر سامنے آئی۔ ان نظریات سے بحث کرنا اس وقت ضروری نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے ادب میں بھی مارکسی نظریات کے انطباق کی اب کوئی ایک سطح بند صورت نہیں ہے اور اسے محض خطیبانہ انداز اور ہنگامی موضوعات تک محدود نہیں رکھا جا سکتا اور ۱۹۳۳ء سے آج تک اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر جو سہل پسند فیصلے کیے گئے ہیں ان کا پھر سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ آج ترقی پسند ادب کے صرف دو معنی ہیں ایک ایسا ادب جس میں ماضی کی طرف واپسی دقیانوسیت، تقدیر پرستی، توہم پرستی اور فرقہ پرستی کے بجائے تعقل اور روشن خیالی ہو، دوسرے ایسا ادب جو استحصال کے خلاف اور سماجی انصاف کے حق میں آواز بلند کرتا ہو۔ اور یہ تعریف آج بھی باسی نہیں ہوئی ہے۔

ایک بار پھر ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ آخر ایسا کیا ہوا کہ عالمی سطح پر اشتراکی نظام کو ان کا شکار ہوا۔ اس کو عام طور پر دو توجیہیں پیش کی جاتی ہیں اور دونوں اپنی جگہ کسی حد تک درست ہیں ایک یہ کہ سرمایہ دار حکومتوں نے اشتراکی نظام کے خلاف سازش بُنی اور دھیرے دھیرے اپنے جاسوسوں اور کارپردازوں کے ذریعے اشتراکی حکومتوں کو قبضے میں کر لیا یہاں تک کہ بعض احباب تو خروشچیف اور گرباچوف کو انہی طاقتوں کا جاسوس قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حکومتوں میں پارٹی چلانے والے لوگ منافع خوری، افسر شاہی اور کرپشن کا شکار ہو گئے جب تک پولینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ کی پوری اقتصادی صورت حال سامنے نہ ہو کچھ نتیجہ نکالنا مشکل ہے مگر اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

خروشچیف نے اسٹالن کو برا بھلا کہنا شروع کیا (جو شاید غیر ضروری تھا) اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک نیا نعرہ بقائے باہم کا بھی دیا یعنی عالمی انقلاب کو رد کر کے صرف ایک پُرامن مقابلے کو اپنا لیا جو سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کرنے کے درمیان ان کے خیال کے مطابق جاری رہے گا اور وقت خود اشتراکی نظام کی برتری ثابت کر دے گا لازمی بات ہے کہ اشتراکی نظام کے ملکوں کے پاس سرمایہ دارانہ ملکوں کی طرح نہ تو بیرونی ملکوں سے نجات کے ذریعے استحصال کے وسیلے تھے اور نہ ہتھیار ڈھالنے اور ہتھیاروں کی تجارت کے ذریعے تھے اور مارشل پلان کی آسانیاں اور قرضوں کا نظام تھا اور نہ وہ پس ماندہ ملکوں کی لوٹ مار سے اپنے خزانے بھر سکتے تھے اس کے علاوہ ان کو اپنے ہر فرد کو یکساں مواقع اور یکساں آسانیاں بھی فراہم کرنی تھیں یعنی اپنے ہاں کے مرفہ الحال طبقے کا پیٹ کاٹ کر بھوکے ننگے طبقوں کو ان کی سطح تک لانا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی اقتصادیات پر مزید بوجھ تھا اور اس بوجھ سے اب تک جن طبقوں نے فائدہ اور تجربہ حاصل کیا ہے وہ طبقے ان حکومتوں کے خلاف تھے اکثر ان کے خلاف سازشوں میں بھی مبتلا تھا کیونکہ ان سے ذاتی ملکیت اور ذخیرہ اندوزوں کا اختیار چھین لیا گیا تھا تیسرے پورے سوشلسٹ نظام کو سرمایہ دار ملکوں کے بھی خطروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی دفاعی طاقت پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑ رہا تھا جو ان پر مزید اقتصادی بوجھ بن گیا تھا۔

جب پُرامن بقائے باہم کی باتیں ہونے لگیں تو عالمی انقلاب کی خاطر قربانیاں دینے اور پیٹ پر پتھر باندھنے کا جوش بھی روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں کم ہونے لگا شاید یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ خروشچیف کے زمانے میں سوویت روس نے امریکہ کی دھمکی میں آ کر کیوبا سے اپنے میزائیل ہٹا لیے تھے اور کیوبا کو امریکہ کے رحم و کرم پر یکہ و تنہا چھوڑ دیا تھا یہ بھی یاد رہے کہ ویتنام کی مدد بھی سوویت روس نے بہت بعد میں شروع کی ہے۔ اس کے علاوہ

ماؤزے تنگ سے اختلافات کی ایک بڑی وجہ بھی تھی کہ ماؤ سرمایہ داروں سے جنگ کو اہمیت دیتے تھے اور سرمایہ دار طاقتوں کو کاغذی شیر کہتے تھے جبکہ خروشچیف پرامن بقائے باہم کی بات کر رہے تھے اور یہی نظریات کے پیش نظر مسلح انقلاب ہی کو عالمی وجود کے لیے خطرہ قرار دے رہے تھے۔

عالمی انقلاب کے تصور سے نظر ہٹی تو ان سبھی ملکوں کے نوجوانوں کا خیال خود اپنی زندگی میں حاصل مراعات اور سہولتوں کی طرف جانے لگا ادھر سرمایہ دار نظام کی گھس پیٹھ بھی جاری تھی ان اشتراکی ملکوں میں رہنے والے لوگ نائٹ کلب اور ہیروئن اور ڈرگ نہ سہی تو کم سے کم جین کی فرمائش کرنے لگے۔ کام چلاؤ روزمرہ زندگی کے سامان کے بجائے بہتر قسم اور زیادہ قیمتی چیزوں کی طلب ہونے لگی اور اس نا آسودگی کو مغرب زدگی نے ہوا دی اس بدمستی نے مختلف کارخانوں کے سربراہوں کو بھی متاثر کیا اور پارٹی کے کارپردازوں میں بھی یہ ذہنیت پھیلنے لگی اور آخر کار پورا نظام ناکارہ ہوگا اور ذاتی ملکیت اور آزاد مارکیٹ (یعنی استحصال پر مبنی کاروبار اور کنزیومرزم کے لیے رجحان بڑھنے لگا۔

اشتراکی نظام نہ تو دہشت پسندی یا [illegible] سے قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے آمریت سے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ مارکس کا دعویٰ ہے کہ وہ استحصال ہونے والوں کی عظیم اکثریت کی حکومت ہے قلیل مگر نہایت طاقتور استحصالی اقلیت پر اس لیے یہ صرف اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب کسی ملک کی دبی کچلی مخلوق کی اکثریت اس کی متمنی ہو اس کے لیے کام کرے اور اس کے لیے قربانیاں دے۔ یہ صرف انہی صورتوں میں قائم رہ بھی سکتی ہے کم سے اس وقت یہی صورت رہے گی جب تک پوری دنیا میں اشتراکی نظام قائم نہیں ہو جاتے، بعد کے حالات مختلف ہو سکتے ہیں۔

اس وقت ساری دنیا کے روشن خیال خواتین و حضرات کے سامنے جو بنیادی سوالات ہیں وہ یہ ہیں:۔

کیا اشتراکی نظام ناکام ہو چکا ہے؟

اس کی ناکامی کا فیصلہ اگر ان باتوں کو سامنے رکھ کر کریں کہ:

(i) کیا وہ اپنے یہاں کے غریب ترین اور مفلس ترین لوگوں کو روٹی، روزی اور بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کر سکا یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مفلسی اور بے روزگاری ان سبھی اشتراکی ملکوں سے ضرور ختم ہو گئی لیکن وہ اپنے عام باشندوں کو اعلیٰ قسم مصنوعات اور اعلیٰ طرزِ زندگی فراہم نہیں کر سکا۔

(ii) کیا وہ اپنے علاقے کے رہنے والوں کو مہلک رجحانات سے محفوظ رکھ سکا یعنی ان میں ایڈز، ہیروئن اور اس قسم کی دوسری بیماریاں، نائٹ کلب، عصمت فروشی، چور بازاری، مافیا وغیرہ کا رواج روک سکا یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان علاقوں میں اشتراکی نظام نے یہ بیماریاں عام نہیں ہونے دیں اور تہذیبی طور پر یہ معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرے سے بہتر ہے۔

(iii) کیا وہ اپنے علاقے کے رہنے والوں کو آزادی، سلامتی اور مساوات دے سکا یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گو مکمل طور پر اس نظام کو اس کام میں کامیابی نہیں ہوئی بڑی حد تک اس نے مساوات تو دے دی مگر آزادی کے سلسلے میں انفرادی آزادی اور سلامتی کے سلسلے میں مکمل سلامتی کا احساس دینے میں اسے جزوی کامیابی بھی نہیں ملی اب یہ اپنے طور پر طے کرنے کی بات ہے کہ اس کی جزوی کامیابی یا ناکامی کا سبب خود نظام کے اندر کی کوئی خرابی ہے یا اس پر عملدرآمد کرانے والوں میں کسی قسم کی کج فہمی ہے۔

(iv) کیا نسلی، مذہبی، لسانی اور علاقائی جھگڑوں کو حل کرنے میں کامیاب رہا یا نہیں۔

اس کا جواب ان نسلی، تہذیبی، علاقائی اور لسانی مسائل کے

بڑنے سے ہوتا ہے جن کا کوئی وجود پچھلے ۷۳ برس سے نہیں تھا ان میں بعض جائز اور منصفانہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۷۳ برس تک یہ سب جھگڑے محض حکومت کے ڈر سے تو دبے نہیں رہے ہوں گے ان میں کوئی نہ کوئی پیش رفت بھی ضرور ہوئی ہوگی۔

۲۔ اگر اشتراکی نظام ناکام ہو چکا ہے تو کیا کوئی اور ایسا نظام ہے جو اس کی جگہ لے سکے اور معاشرے کے دبے کچلے ہوؤں کو استحصال سے نجات دلا سکے؟

اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس وقت تک دنیا میں اشتراکی نظام کے علاوہ جو نظام رائج ہے وہ یا تو اعلیٰ درجے کا سرمایہ دارانہ صنعتی نظام ہے جس کی بنیاد مشین پیداوار پر ہے آزاد مارکیٹ کے اندھے تقاضوں پر ہے اور جو [illegible] کے اصول کے مطابق سماجی بہبودی کے ذریعے پیدا کرتا ہے۔ اس نظام کی کارفرمائی امریکہ میں اعلیٰ ترین شکل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور باوجود اس کی تمام چکاچوند کرنے والی کامیابیوں کے امریکی استحصال خود اس کے اپنے ملک ہی میں نہیں پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے بیروزگاروں کی فوج بھی ہیں مافیا اور اسمگلنگ کی فراوانی بھی اور سیگرود دشمنی کا طوفان بھی۔ امریکی معاشرہ اپنی دولت و ثروت کے باوجود بیمار معاشرہ ہے اور افراط زر اور ری سیشن کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ یہی نہیں جن جن ممالک نے امریکی نظام پر چلنے کی کامیاب یا ناکام کوشش کی ہے ان کے ہاں بھی کم و بیش یہی صورت ہے پسماندہ ملکوں میں تو سرمایہ دارانہ نظام نے زبردست تباہی مچائی ہے اور وہاں کے اقتصادی، سیاسی، اور تہذیبی (لسانی، علاقائی اور فرقہ واری) مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے [illegible] پوری سطح پر خوشحالی ضرور آئی ہے۔

[illegible] تا ہے کہ پچھلے ۷۳ برس میں مادی آسودگی کے اعتبار سے شاید [illegible] ما ہو مگر اشتراکی نظام نے معیشت اور اخلاقیات کا جو معیار [illegible] اس کی کچھ کہیں بہتر تھا۔

اس پوری بحث سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام ہو یا مارکسزم دونوں کا سردست کوئی متبادل نہیں ہے اور انسانی فلاح کی تلاش کے جاں کاہ سفر میں جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے، جو کامیابیاں اور حیرت انگیز کامیابیاں مارکسزم کے اطلاق سے اشتراکی نظام نے حاصل کی ہیں ان کی ضمانت کوئی دوسرا نظام آج تک نہیں دے پایا ہے۔ یہ البتہ ماننا چاہیے کہ مارکسزم کوئی نسخۂ کیمیا یا اسم اعظم نہیں کہ سب سوالوں کا حل اس کے پاس ہو۔ بہت سے سوالات کے جوابات وہ نہیں دے پایا اور کئی مسائل حل نہیں ہو پائے مگر انھیں حل کرنے کے لیے مارکسزم کے اطلاق کی ان کمزوریوں کو دور کرنا ہوگا اس سے روگردانی کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ اسے رد کرنے کے معنی محنت کشوں، زیردستوں اور دبے کچلے کروڑوں اربوں انسانوں کو مدتوں کے لیے ان کے حقوق ہی سے نہیں اُن کے آزادانہ وجود کی امید سے بھی محروم کرنے کے ہوں گے اگر مارکسزم میں کوئی کمی ہے تو اسے پورا کیا جا سکتا ہے اگر اس کی کارکردگی میں کسی رد و قبول کی ضرورت ہے تو اس کا بھی امکان ہے مگر یہ سب باتیں مارکسزم کے تخلیقی استعمال اور اشتراکی نظام کے ۷۰ سالہ تجربات کی روشنی ہی میں کی جا سکتی ہیں انھیں رد کر کے ممکن نہیں۔

مختصر یہ کہ مارکسزم آج بھی ایک زندہ نظریہ یا سائنس ہے جس کا اطلاق ہر قوم علاقے اور ملک کے لوگوں کو خود اپنی عقل و فہم کے مطابق اور اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر کرنا چاہیے۔ اس کی عالمی امامت نہ موجود ہے نہ ضروری، گو مختلف مارکسی تحریکوں، تنظیموں اور ملکوں کے درمیان دوستانہ رابطے اور ہم آہنگی مفید ہوگی مگر یہ لازم نہیں ہے۔ مارکسزم کے خلاقانہ انطباق ہی میں آج بھی انسانیت کی فلاح ہے بقول جگر

خود اپنے ہی سوز باطنی سے نکال اک شمع غیر فانی
چراغ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے بجھا کریں گے

ید خورشید عالم

مارکسزم — زندہ یا مُردہ

آفاق گیر شہرت یافتہ تصنیف — "جینیس — ایک ادبی نظریہ" میں مصنف برٹ کوری نے مارکس کے بارے میں لکھا ہے کہ مارکسی نظریہ تاریخ کے چیستاں مکمل جواب ہے اور یہی اس کا حل ہے:

اس حکیمانہ بیان کو اب ڈیڑھ سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے۔ اس طویل مدت میں دنیا کا نقشہ عالمگیر انقلابی تبدیلیوں کی زد میں آیا۔ جغرافیائی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ہوئیں۔ دنیا کے دو تہائی حصے کو غلامی سے نجات ملی۔

دنیا نے اپنی علمی بصیرت اور بصارت کے مطابق سوشلزم کے روپ اور بہروپ سب دیکھ لیے مگر جدلیات اور طبقاتی تقسیم کے تحت استحصال کا شکار مخلوق نے مفادات کے تحفظ اور بقا کی اس تحریک پر کوئی حرف نہ آیا۔ ریاستی حکمت عملی میں پرولتاری آمریت ایک مضبوط آلۂ کار کے طور پر اُبھری۔ پیداواری ذرائع نے سرمایہ دارانہ نظام کی شکل اختیار کر لی اور تمام ممالک میں کارٹل کنٹرول کے باوجود سرمایہ کاری ادارے اور کارخانے سمٹ کر چند مخصوص گروہوں کی ملکیت بن گئے ہیں جس کے نتیجے میں مختلف ملکوں کے عوام اور محنت کرنے والے لوگ استحصال اور غربت کے شکار ہوتے گئے۔

ہیبتناک جبرت ناک ہولناکی کے ساتھ پہلے مشرقی یورپ اور پھر خود اسی بیل

سوشلسٹ ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجنے لگی اور تمام ریاستی ادارے تخت و تاراج ہونے لگے۔ یہ اُمڈتا ہوا طوفان اور بپھرتی ہوئی موجیں جمہوریت اور شخصی آزادی کی آڑ میں ریاستی ڈھانچے کو توڑتی اور سماجی تہوں کو اکھیڑتی گہرائی تک چلی گئیں۔ آخر اس شکست و ریخت کے پیچھے کون سے خارجی عناصر تھے؟

اس عرصے میں منظرِ عام پر آنے والا تمام تحریریں اور الیکٹرانک میڈیا ہمیں چند خاص نکات کی طرف متوجہ کرتا ہے:

الف:۔ اسٹالینی عہد میں بلند ہونے والی مخالفانہ آوازوں کو دوسری جنگ عظیم کے بعد بیدردی طور پر "بے دردی سے" دبایا جانا۔

ب:۔ پرولتاری حاکمیت کی حقیقی توجیہات و معنی کو مسخ کرنا اور تمام تر ریاستی قوت کو نعتی حاکموں اور بیوروکریٹ منیجروں کے کلی اختیارات میں دیا جانا، جس سے عوام میں برگشتگی اور بیگانگی کا احساس پیدا ہوا۔

ج:۔ حکمراں گروہ کا فرسودہ اور زنگ آلود ہو جانا اور ان کا عوام کے جذبات و احساسات سے دور ہو جانا۔

آیئے، ادب کے حوالے سے اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں گے:

اسٹالن کی وفات (۵ مارچ ۱۹۵۳ء) کے بعد وہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے جو خروشچیف نے اقتدارِ اعلیٰ سنبھالنے کے بعد ڈرامائی انداز سے گزرے ہوئے اسٹالینی عہد کی غلطیوں، مظالم اور تمام "غلط کاریوں" کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں۔

اس واقع کے بعد ادبی/سیاسی محاذ پر بوکھلاہٹ اور تیزروی کے ساتھ کچھ دوسرے اقدامات کیے گئے۔

دسمبر ۱۹۵۳ء میں سوویت روس کے معروف مدبروں، شاعروں اور دانشوروں کو اس وقت شدید جھٹکا لگا جب ایک شہرت یافتہ ادیب VLADIMIR POMERANTSEV کا مضمون "ادب میں صداقت" روس کے مشہور ادبی جریدے "نوائے میز" میں اپنا

طویل مضمون شائع کرایا، اور اس مضمون کی شہرت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اپنے موضوعی مقالے میں "پومیرن" نے اسٹالینی عہد کے ادب پر تیکھے انداز سے سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"سچائی ہی تنہا وہ حقیقت ہے جس سے تصانیف اور اسٹیج ڈرامے قطعی عاری ہیں ۔ ادیب و شاعر اگر چاہیں تو لازمی طور پر اپنی فن کارانہ تحریروں سے بعض لازمی کمی اور دوسرے اُن حربوں کو خارج کر دیں جنھیں وہ تصادات اور مشکل مسائل سے دامن بچا کر نکل جانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں تو حقیقی تصادم کو اپنے ناولوں میں جگہ دینے کے بعد ایک یا دو برسوں میں صداقت پر مبنی فن سامنے آجائے گا۔"

بہ طور تمہید کی مسلّم نشانی خروشچیف کی اس خفیہ تقریر میں کھل کر سامنے آگئی جو انھوں نے بیسویں کانگریس منعقدہ ۱۹۵۶ء کو کی تھی۔ خروشچیف نے جب پارٹی کے خلاف کیے جانے والے جرائم وضاحت سے بیان کیے تو ملک کے سربرآوردہ عالموں پر جن میں "نوائے مبر" کے چیف ایڈیٹر الیگزینڈر ٹارڈوسکی سرفہرست ہیں، بہت ہمدردانہ اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے فوراً بعد ہی اسٹالینی افکار اور حاکمیت اعلیٰ کے تصور سے دور ہٹنا شروع ہوا الیگزینڈر اس وقت تک خود بھی نظام حکومت سے بے حد قریب تھے لیکن انھوں نے اُبھرتے ہوئے نئے سیاسی مقاصد کو ڈھانپ لیا اور اپنے تمام زندگی کے نظریاتی افکار کی خود تنقید کی۔ خروشچیف نے ۱۹۵۶ء میں جو طرح ڈالی تھی وہ تو حقیقتاً ۱۹۴۸ء ہی میں یوگوسلاویا کے ٹیٹو نے مارکسزم اور لینن ازم کے "نئے قومی تصور" سے شروع ہو چکی تھی اور یہیں سے ماسکو کے ساتھ ان کے اختلافات شروع ہوئے تھے۔

طرفہ تماشا ہے کہ ٹیورڈوسکی کی اپنی تخلیقی نظم (کینٹوز) "فاصلہ در فاصلہ"

میں ہمیں براہ راست اسٹالن کے خلاف خیالات ملتے ہیں اور اسے ادب کے توسط سے لعن طعن کا پہلا بھرپور حملہ قرار دینا مناسب ہے :-

(۱)

THAT WAS A FATHER WHOSE MERE WORD,

THE FAINTEST HINT OF MOVEMENT OF HIS EYEBROWS

BECAME LAW

FULL FIL YOUR HARSH DUTY

AND SAY THAT WHAT IS NOT SO

(SOLZHENITSYN, TVARDOVSKY AND NOVY MIR

P 207)

اور اس سے قبل یہ بھی نظم کیا

(۲)

AND THOSE WHO ACCOMPANIED HIM AT FIRST

THE UNDERGROUND AND PRISON LATER KNEW

AND THEY TOOK POWER AND SURGED

AND DISAPPEARED ONE BY ONE INTO SHADOWS

(P 204)

الیگزینڈر ٹورڈوسکی نے اعلیٰ سطح کی خود آگاہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ماضی پر یوں نگاہ ڈالی :

(۳)

AND WE (THE YOUTHS OF THE 1930'S) KNEW

DURING DIFFICULTIES OF THE CAMPAIGN,

THAT WE WERE TRUE TO THE CAMPAIGN

THAT WE WERE TRUE TO THE [illegible],

NOT WE ALONE,

BUT THE FLOSNER OF THE PEOPLE

BUT THE HONOUR AND INTELLIGENCE OF THE WHOLE COUNTRY

(P.206)

اس کے باوجود ایلگزینڈر خود اپنی ذات اور اپنی ہم نسل کو اُن جرائم سے مبرا نہیں سمجھتا،

(۴)

NOW WE ARE DIFFERENT SORT

YESTERDAY HAS NOT BECOME UNKNOWN AND

UNFAMILIAR TO US

WE KNOW BOTH THESE YEARS AND THE PAST

AND BELONG TO BOTH EQUALLY

(P.216)

(۱)

وہ ایک باپ تھا جس کی زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ
جس کے ابروؤں کا فقط اشارہ
قانون بن گیا
اپنے درشت فرائض پورے کرو
اور وہ کچھ کہو جس کا کوئی وجود نہ ہو

(۳)

ابتدا میں جو ساتھی اس کے ساتھ تھے
وہی زر زمین اور جیلوں کو بھگتنے کے بعد
انھوں نے حکمرانی اور طاقت حاصل کر کے جدوجہد کی

اور سب کے بعد و تجربے مرد بہ ہو کر سایوں میں سمٹ گئے

(۳)

اور ہم کہ جو ۱۹۳۰ء کی نوجوان نسل تھے وہ جانتے ہیں
تحریک کی مشکلات کے باوجود
ہم لوگ اس مہم میں ثابت قدم رہے
اور اس پرچم کی صداقت کا علم بلند کرتے رہے
ہم اکیلے بھی نہ تھے
بلکہ ایک جم غفیر ہمارے ساتھ تھا
یہاں تک ذی عزت و راست باز ذہین مخلوق
ملک کے گوشے گوشے سے ہمارے ساتھ تھی

(۴)

اب ہم مختلف خانوں میں بٹ کر مختلف ہو گئے ہیں
ماضی اور گزرا ہوا کل ہمارے لیے اجنبی نہیں
اور نہ ہی ہمیں اس سے عدم واقفیت ہے
ہم ان دونوں ماضی و حال کو پہچانتے ہیں
اور ہمارا ان دونوں سے ربط و تعلق یکساں ہے۔

یگزینڈر ٹیورڈوسکی کو روسی ادیبوں اور شاعروں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اُن کا انتقال ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

ان واقعات کی تفصیل دار فہرست سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ روس میں ن اور افراتفری کی تمام نشانیاں ۸۴-۱۹۸۳ء میں شروع کی جانے والی تحریک سناسٹ سے بہت پہلے نمایاں ہونے لگی تھیں۔ مغربی ممالک اور خصوصاً امریکی ت عملی نے انسانی حقوق سلبی کے خلاف جاذارانی اور مکمل جہاد کی ابتدا کرتے ے یہودی نسل پر مظالم کی داستانیں دُہرانا شروع کیں اور ان کے روس سے

[illegible] کے بے زور ہونے کی وجہ سے بیل ٹالی اندرونی طور پر وہاں بدنظمی اور انتشار پھیلنے لگا اور مرکز مفلوج اور بے بسی کا شکار ہونے لگا۔ ان بے چینیوں کے درمیان ہی پھر قومیتوں کے درمیان لسانی تنازعات اور نسلی تفرقہ پرستی کی لہریں اور اٹھتی چلی گئیں جنھوں نے پورے سماجی ڈھانچے کو متزلزل کر دیا۔

کلاسنسٹ اور پیرسٹرائیکا کے سربراہوں نے بھی ریاست کے ڈھانچے کی تجدید نو کے رومانوی شوق میں اس آئین کو اٹھا کر نہیں دیکھا جو متحدہ مختلف قومیتوں کے یکجا کرنے کے باوجود ان کی علیحدگی کے حقوق کا اعلان کرتا آ رہا تھا۔ لیڈر شپ نے اپنی ترجیحات پر جس بے سمجھے انداز سے عملدرآمد کیا تھا ان کا نتیجہ نکلنے لگا۔

کارل مارکس نے شخصی شہنشاہیت و آمریت کے دور میں صنعتی انقلاب کے پیش نظر تاریخ کے معمے کو تخلیقی سائنسی نقطۂ نظر کے مطابق حل کیا تھا جسے دنیا کے کونے کونے میں رائج کرنے کی تحریکوں نے عالمی سطح پر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ لیکن مارکس جس فلسفیانہ فکر اور سماجی سائنس کی ترویج کا محاکماتی اصول لائے تھے وہ سب ارتقائی عمل کے تابع بھی تھے اور سوشلزم کے فکر و عمل کو سائنسی ارتقا کے مطابق ہر آن بدلتی ہوئی کائنات اور بدلتے ہوئے انسانی رشتوں کی روشنی میں جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

یہی ایسے متبادل راستے تھے جن کے ذریعہ تبدیلیاں لا کر حالات کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ممکن ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ معاشرے کو سرمایہ دارانہ صارفیت کے متعدی امراض میں مبتلا کرنے کا رجحان ہے۔ مارکٹ اکانومی کی ترغیب بے سہاروں کی مزید افلاس، بیماری اور بے روزگاری میں اضافے کا باعث ہوگی۔ روس کے نظام فکر اور طرز ریاست کی تجہیز و تکفین کے فتوے تو ہمیشہ دیئے جاتے رہے لیکن اس بار سنجیدگی سے مغربی ممالک اور امریکہ کے تمام مفکرین اور ادبی دنیا میں ناموری و شہرت یا فتح حاصل کرنے والے دانش ور متفقہ طور پر سوشلسٹ

نظام کے خلاف صف آرا ہیں اور اسے دفن کر دینے کی اطلاع دے رہے ہیں۔ مغربی گزشتہ کم از کم پچاس برسوں میں روس میں بیکاریوں، بھوک مروں اور سڑکوں پر رات بسر کرنے والے عام لوگوں پر زمین تنگ ہونے کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ سماجی اور اقتصادی بحران کی کیفیات ۱۹۸۲ء سے جڑ پکڑ رہی ہیں۔ کنزیومر اور اعلیٰ قسم کی مصنوعات کی قلت اور اور ناپیدگی نے اس وقت اجتہادی شکل اختیار کر لی جب وہاں میکڈانلڈ کے امریکی ساخت کے ہیمبرگر اور پیپسی کولا کو رواج دینے کی ابتدا کی گئی اور بین الاقوامی کارپوریشن کے کئی ادارے اپنا صارفی مال لے کر دکانوں کو سجانے لگے۔

روس کی شکست و ریخت اور اس ابتدائی کیفیت کے پیدا ہونے میں مرکزی منصوبہ بندی اور تقسیم پیداوار کی ناکارہ طریق کار نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ موجودہ حالات میں جب کہ ملک نئے مسائل سے دوچار ہو رہا ہے تو ہمیں یہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کئی سال سے تمام قوت کے ساتھ سیاسی اصلاحات کی جا رہی ہیں حالانکہ مارکسزم کا ہلکا سا شعور رکھنے والے جانتے ہیں کہ ابتدا اقتصادی سطح سے ہونی چاہیے۔

دلوں کا جانا تو ٹھہرا ہے لیکن اس کا انجام کیا ہوگا اس کا فیصلہ باقی ہے اس بارے میں کچھ کہنا شاید قبل از وقت ہوگا۔ ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

• اکادمی کی مطبوعات •

نمبر شمار		قیمت
	۱۹۸۹ء کی مطبوعات	
۱	دلی کی آخری شمع	26
۲	دلی والے (جلد اول)	20
۳	دلی کا آخری دیدار	17
۴	قلعۂ معلی کی تصاویر	17
۵	رسومِ دہلی	28
۶	[illegible]	[illegible]
۷	[illegible]	21
۸	[illegible] داغ دہلوی	11
	۱۹۹۰ء کی مطبوعات	
۹	سواح دہلی	17
۱۰	خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے	20
۱۱	عالم میں انتخاب دہلی	16
۱۲	دلی کی تہذیب	17
۱۳	دیوانِ حالی	24
۱۴	چراغِ دہلی	[illegible]
۱۵	اردو صحافت	13
۱۶	دہلی کے اسکولوں میں اردو تعلیم کے مسائل	23
۱۷	[illegible]	23
۱۸	دلی کی آخری بہار	20
۱۹	لال قلعہ کی ایک جھلک	21
۲۰	[illegible]	50
۲۱	اردو غزل	31
۲۲	[illegible]	19
۲۳	انجمن ترقی کے مضامین کا انتخاب	31
	۱۹۹۱ء کی مطبوعات	60
۲۴	[illegible] اور مباحث	80
۲۵	انتخاب کلامِ داغ	34
۲۶	دہلی کے مشاعرے کی ادبی خدمات	21
۲۷	دہلی اور اس کے اطراف	25

نمبر شمار		قیمت
۲۸	[illegible]	62
۲۹	اردو میں ہاوسا کی روایت	29
۳۰	دلی کی درگاہ شاہ مردان	33
۳۱	دلی والے (جلد دوم)	58
۳۲	دلی کے اکبر قومیہ	98
۳۳	اشاریہ نوائے کل	77
	۱۹۹۲ء کی مطبوعات	
۳۴	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر	25
۳۵	مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	47
۳۶	آزادی کے بعد دہلی میں اردو [illegible]	61
۳۷	رنگ ہزاروں خوشبو ایک	28
۳۸	کتابیات، کاتب اقبال (جلد اول)	170
۳۹	نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس	30
۴۰	انشاء ہادی الصنائع و زائر النساء	22
	۱۹۹۰ء کی مطبوعات	
۴۱	[illegible] دہلی (تین جلدیں)	400
۴۲	آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	48
۴۳	آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم	48
۴۴	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	48
۴۵	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	44
۴۶	انشاء الصنادید (تین جلدیں)	310
۴۷	فوائد الصنادید	88
۴۸	آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	64
۴۹	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	70
۵۰	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	45
۵۱	مہربان جن	25
۵۲	اردو مرثیہ	67
۵۳	[illegible]	80
۵۴	آدمی نامہ	70
۵۵	[illegible]	16

پروفیسر ہربھجن سنگھ

ترانۂ ہندی : زیریں ساخت کا مطالعہ

شاید شروع ہی میں مجھے اپنے مطالعے کے حدود اور سمت کی وضاحت کر دینی چاہیے اقبال کے ہمہ جہتی مذاکرے کے منتظمین نے مجھے میری دلچسپی کے مطابق مطالعے کا موضوع منتخب کرنے کو کہا۔ سچ یہ ہے کہ میں نظموں کے طالب علم کی حیثیت سے مطالعے کے پرانے وسایل کو برتنے کے بجائے نئے خصوصی طریقوں کو برتنے کا قایل ہوں۔ لہٰذا میں نے صرف ایک محدود رقبے تک خود کو محدود کر لیا اور کسی مخصوص ڈسپلن کی اصطلاحوں سے گریز کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ منتخب نظم کے سبھی مسائل کے تمام تر اشاروں پر مجھے دسترس حاصل ہے۔ چونکہ یہ مطالعہ محدود وقت میں مذاکرے میں حاضرین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے لہٰذا میں نے ایک مختصر اور جانی پہچانی نظم کو چنا ہے۔ اس کا موضوع اور سانچے مانوس ہیں اور ان کی طرف عام ردعمل خاصہ متعین اور کسی قدر یکساں ہے۔ مرکزی خیال اور جذبہ حقیقت اور تخیل اس میں گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ لہٰذا میں خود کو صرف ایسے مسایل تک محدود رکھوں گا جو نظم کے پیغام کو سمجھنے کے لیے ہی مرکزی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہماری رسائی ان معانی تک بھی کراتے ہیں جو وہ غیر شعوری طور پر ادا کرتی ہے۔ نظم کے اندر گرد اور اور چھور کا تعلق بھی بہرحال نظم کی مرکزی ساخت سے ہے اور معنوی معنیاتی صداقتیں بھی نظم کی مرکزی وحدت پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس کے پیغام کی صراحت کرتی ہیں۔ آپ میرے اس خیال کو قبول فرمانے کی زحمت

ہیں کہ تھوڑا بہت علم بھی ہمیشہ خطرناک نہیں ہوتا۔ چونکہ نظم کے کنارے بھی اس کی مرکزی ساخت پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے میں نے انھیں زیر بیں ساخت کا نام دیا ہے۔ میرا طریق کار واقعی بیانات کے ساتھ ساتھ ان کے عمودی متعلقات دونوں کی مدد لیتا ہے۔ مثلاً ایک مصرعے میں سے جو سوال پیدا ہوا ہے اس کے جواب کے لیے پوری نظم کو پڑھنے کی ضرورت ہو سکتی ہے دوسرے میں عام طور پر اپنے سارے سوالوں کا جواب نظم کے متن کے اندر ہی ڈھونڈھنے کی کوشش کروں گا اور ان کے آسان جوابات بیرونی ماخذوں مثلاً سوانح، معاصر تاریخ، تہذیبی صورت حال وغیرہ سے حاصل کرنے سے گریز کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں نظم کی چار دیواری کے اندر رہ کر اس کے لسانی ڈھانچے کا مطالعہ کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

آیئے، اب ہم ترانۂ ہندی کا پہلا مصرعہ پڑھیں

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

ہم اس اہم سوال سے دوچار ہوتے ہیں کہ کسی قومی ترانے کے لیے اپنے ملک کی تعریف کرنے کے لیے دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنا کیوں ضروری ہے، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ مصرعہ تناؤ کے ذریعے حب وطن کا اظہار ہے۔ مصرعہ بڑا گٹھا ہوا ہے مگر اس کا گٹھاؤ اور کساؤ دو متضاد عناصر کے توازن پر قایم ہے یعنی ہم اور وہ، ہندستان اور دنیا کے بقیہ ممالک، دو متضاد عناصر کے درمیان اس توازن کو میں نے تناؤ کہا ہے۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے سے پہلے یہ غور کرنا ضروری ہے کہ یہ تناؤ کیا صرف اس مصرعے کی خصوصیت ہے یا یہ طرز پوری نظم کے کردار میں رچا بسا ہوا ہے۔ میں نظم کے باقی اشعار میں بھی اس قسم کے متضاد عناصر کے درمیان توازن تلاش کرتا ہوں۔

پہلے شعر میں ہندستان اور سارے جہاں کے درمیان تضاد

دوسرے شعر میں جسمانی اور ذہنی موجودگی کے درمیان تضاد

تیسرے شعر میں	اپنے وطن کے پہاڑ	اور	دوسرے پہاڑوں کے درمیان تضاد یا تناؤ
چوتھے شعر میں	اپنے وطن	اور	باغ جناں کے درمیان تضاد
پانچویں شعر میں	مذہب	اور	وطن کے درمیان تضاد
چھٹے شعر میں	ہم	اور	یونان و مصر و روما کے درمیان تضاد
ساتویں شعر میں	اپنے وجود	اور	مخالف دنیا کے درمیان تضاد
آٹھویں شعر میں	درد نہاں	اور	نامحرم دنیا کے درمیان تضاد

نو اشعار کی نظم میں واضح طور پر اسی تعداد میں تناؤ موجود ہیں۔ دو الفاظ سنتری اور پاسباں سے غیر مذکورہ مخالف طاقتوں کے خطرناک امکانات کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔

وہ دن ہے یاد تجھ کو

کا سوال مثبت اور منفی توقعات کے درمیان معلق ہے۔ اس سوال کے اثباتی پہلو میں بھی ایک الجھن میں ڈالنے والا تلازمہ چھپا ہوا ہے۔ آیئے پورے شعر کو پڑھیں۔

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

سوال پہلے مصرعے میں دو متضاد ردعمل کے درمیان منقسم ہے مگر دوسرے مصرعے میں وقت کے ایک مخصوص نقطے سے ملک سے وابستگی کا اور اس وقت سے پہلے اس ملک سے وابستہ نہ ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ میں اس تناؤ کو حل کرنے یا اس کی حمایت کرنے یا اس کی کوئی وضاحت کرنے کی کوشش اپنے تصور تاریخ اور یا اپنے تصور مذہب کی مدد سے نہیں کروں گا جس کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص آسمان یا جنت سے بھیجا گیا ہے یا یہ تصور کہ ہر فرد زمان و مکان میں آنے سے قبل وجود نہیں رکھتا تھا۔ یہ شعر سادگی کے ساتھ ابہام کا دلفریب تخلیق پارہ ہے۔ اس کے مختلف عناصر میں سے میں صرف اس حیثیت سے بحث کروں گا جو اس

تناؤ کی ذمہ دار ہے یا جس سے تناؤ پیدا ہوا ہے۔

اب آیئے اس حسیت کو شناخت کریں جو ان تین منفی بیانات میں جاری و ساری ہے کہ یہ بیانات بلاشبہ مخالف سمت کی کسی حقیقت، امکان یا خواہش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

امکان ہم اپنے مذہب کی تعلیمات کے برخلاف اور کبھی بھی مذہب کی وجہ سے برعکس عمل کرتے ہیں۔

(ب) کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

حقیقت ہمیں مٹانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

(ج) اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں

خواہش ہم ہمدرد دنیا میں کسی محرم اور محبت کرنے والے کے خواہاں ہیں

اب زیر مطالعہ نظم میں مندرجہ ذیل باتوں کی پہچان ہوئی ہے:

(الف) متضاد عناصر کے درمیان توازن کی مدد سے قائم کی ہوئی مربوط ہم آہنگی

(ب) دہرے امکانات والے لفظ کا استعمال

(ج) مثبت اور منفی ردعمل کے درمیان جھولتا ہوا استفہامیہ

(د) ایسے منفی بیان جو بلاشبہ کسی مخالف امکان، حقیقت یا خواہش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ نتیجہ نکالنا جلد بازی نہیں ہوگا کہ نظم حسیت کی ایک واضح تشکیل ہے جو سل وزن سے کم پر مطمئن نہیں ہو سکتی اور یہ ایک ایسا وزن ہوگا جو پیش نظر یہ دینے کے جوش میں پس منظر کو نظر انداز نہیں کرے گا اور یہ زمانۂ موجود کی بات کرتے ہوئے غیر موجود کی آگہی بھی جاری و ساری رکھے گا۔ یہ نتیجہ بے حد معقول لگتا ہے مگر جلد بازی اور جذباتیت سے محفوظ رہنے کی خاطر نامناسب ہوگا اگر ہم دوبارہ جانچ پڑتال کریں۔ لہٰذا میں ایک بار پھر پوری نظم پڑھوں گا

اور پیش منظر اور پس منظر پر مصور پر غور کریں گے اور صرف ان جملوں
یا تراکیبوں کا ہو یا تو استعارہ ہیں یا تقریباً استعارہ ہیں جیسے مندرجہ ذیل:

شعر (۱)	سارا جہاں	ہندوستاں ہمارا
	ہم بلبلیں	گلستاں ہمارا
شعر (۲)	غربت	وطن
	جسمانی موجودگی	ذہنی موجودگی (دل ہو جہاں ہمارا)
	پربت	ہمسایہ آسماں
	سنتری	پاسباں
	گودی	ہزاروں ندیاں
	ہمارا گلشن	باغ جناں
	(موجودہ گنگا)	قدیم دور کی گنگا (آبِ رودِ گنگا)
	مذہب	حب وطن
	مٹنے والے یونان و مصر و روما	نہ مٹنے والے ہم
	نہ مٹنے والے ہم	صدیوں کی دشمنی رکھنے والا (دور زماں)
	ہم	نامحرم دنیا

درد نہاں دوست کی نامہربانی (معلوم کیا کسی کو
درد نہاں ہمارا)

مذکورہ چودہ جوڑوں میں سے صرف تین ایسے ہیں جو متضاد نہیں ہیں ان میں ایک (سنتری۔ پاسباں) اس فضا میں اجنبی ہے اور صرف دو مترادفات اور ہم معنی الفاظ کو تکرار سے عبارت ہے جو تناؤ کی کیفیت کے مطابق نہیں ہے باقی (یعنی بلبل اور گلستاں، اور گودی اور ہزاروں ندیاں کے جوڑے) بھی متضاد نہیں ہیں بلکہ دو مختلف شعبوں میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک چودہ میں سے تین کا استثنا مناسب ہے اس لحاظ سے مذکورہ نتیجے کی توثیق آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

اب تک ہم نے نظم کے لسانیاتی طرز عمل کے ذریعے نظم کی کیفیت کے پہچاننے کی کوشش کی ہے مگر نظم کو الفاظ سے عبارت ہے مگر اصلاً زبان سے ماوراء ہے ہم نے غالب وقت نظم کے تشکیلی عناصر کے تجزیے پر صرف کیا ہے اب ہمیں اس کے زیادہ اہم عناصر پر بھی توجہ کرنی چاہیے۔ نظم کی شروعات پندار پارینہ سے ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے بلاشبہ اداسی پر۔ پہلے اور آخری اشعار کے آخری مصرعے یوں ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

بظاہر نظم کا پورا رویہ تناؤ پر مبنی ہے مگر شگفتہ ابتدا والی نظم یا تو شعوری منصوبے کے مطابق یا محض اتفاق سے اداسی پر ختم ہوتی ہے اس کے جذباتی کے درمیانی حصے پر نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے۔

نظم میں ہے:

گلشن ہے جس کے دم سے رشک جناں ہمارا

اور صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور ہم بلبلیں گو وطن سے دور غربت میں ہیں مگر دل وطن ہی میں ہے۔ نظم اندرونی بیر اور لڑائی کا بھی ذکر کرتا ہے (آپس میں بیر رکھنا) اور بیرونی دشمنی کا بھی تذکرہ کرتا ہے (دشمن دورِ زماں)۔ یہ قابلِ توجہ ہے کہ تضادات پر اس قدر ہنرمندی سے ڈھالی ہوئی نظم بیر اور دشمن کے تلازمے استعمال نہیں کرتی یا استعمال نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ واضح طور پر محبت اور دوستی کا کسی بھی شکل میں ذکر نہیں کرتی۔ مختصر یہ کہ جذباتی ہم آہنگی پہلے اور آخری شعر دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک نشاطیہ احساس جو گہری اداسی سے آمیز کیا گیا ہے۔ نشاط کسی کارنامے پر فخر سے نہیں بلکہ نہ ملنے سے یا ملنے سے بچ جانے سے پیدا ہوا ہے اور اداسی بلا سبب دکھ پانے اور بے پروائی کا شکار ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ یہاں بھی تناؤ دو تضادات کے درمیان ہے جن کی مدد سے توازن قائم کیا گیا ہے اور نہ تو تضادات میں ٹکراؤ ہے نہ ان تضادات کو حل کرنے کی کوشش۔ توازن کا ذکر کرتے ہوئے مجھے وہ محتاط لہجہ اور آہنگ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جو آخری دو شعروں میں ملتا ہے۔ فخر و پندار کے لئے (کچھ بات ہے) اور درد (درد نہاں) مبہم چھوڑ دیئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نظم کا جذباتی طرز تضادات سے ابھرتا ہے اور توازن تک پہنچتا ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے ترانۂ ہندی کے مختلف عناصر کے پہچاننے کی کوشش میں میں نے نظم کو فرد کی سی حیثیت دے دی ہے اس کا جواب تو سوال سے ابھرنے والے جبریہ اور لازمی عناصر ہی میں تلاش کرنا ہوگا اسی کے ساتھ مجھے نظم کی متعین اشکال (۱۷، ۲۱، ۲۷، بنتہ) ہوئی صورت کے درمیان توازن میں

ہو جاتا ہوگا۔ مجھے ابتدا میں کیا ہوا اپنا وعدہ یاد ہے کہ میں خصوصی اصطلاحات استعمال نہیں کروں گا۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ دراصل اس وعدے سے مجھے فائدہ پہنچا ہے متعین اور زیر تشکیل یعنی بنی ہوئی اور بنتی ہوئی کی اصطلاحیں یہاں میں نے کسی قسم کے فلسفیانہ معنویت کے بغیر سیدھے سادے عام معنوں میں استعمال کی ہیں مجھے اس فرد جیسی نظم کے صرف ایک رُخ سے غرض ہے۔ کیا اس کا ذہن متعین ہے یا ابھی زیر تشکیل ہے؟ جامد ہے یا نامیاتی؟ سیدھے سادے لفظوں میں کیا وہ وقت کے کسی نقطے پر قائم ہے یا اپنا دائرہ بڑھاتی جاتی ہے۔ میں اس سوال کا جواب پہلے افعال میں تلاش کروں گا۔ نظم میں مختلف مصرعوں میں جو افعال استعمال ہوئے وہ یہ ہیں:

پہلا مصرعہ (ہے) چوتھا ہے آٹھواں ہے
دوسرا ہیں پانچواں (ہے) نواں ہیں
تیسرا بجھو چھٹا ہے دسواں آتا
ہو ساتواں کھیلتی ہیں گیارہواں ہیں۔ ہے

بارہواں ہیں۔ ہے پندرھواں ہے سولہواں رہا ہے
تیرہواں مٹ گئے مٹتی نہیں سترہواں (ہے)
چودھواں ہے اٹھارہواں (ہے)

(نوٹ:۔ بریکٹ میں وہ افعال ہیں جو حقیقتہً استعمال نہیں کیے گئے مگر استعمال کیے جاسکتے ہیں یا موزوں ہیں)

ظاہر ہے کہ نظم میں ایک ہی غالب فعل ہے اور ایک صیغہ ہے وہ ہے صیغۂ حال۔ ۲۲ ٹکڑوں میں سے صرف دو ماضی کے ہیں اور ایک بھی زمانۂ حال کا نہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ نظم میں ذہنی طور پر کچھ ماضی سے وابستگی ہے مگر ہندستان کے مستقبل، اس کے لوگوں اور ان کے مقدرات سے کچھ دلچسپی نہیں

ہے۔ (۲) خود ایک نہایت غیر واضح سا فعل ہے [illegible]
آتا ہے۔ ایسی حسیت جو کسی دوسرے فعل کے غیر ہونے یا حسیت کی طرف [illegible]
کرتی ہے اور کسی کام کے کرنے یا کسی صورتحال کے زیر تشکیل ہونے کے عمل کی [illegible]
کرتی ایسی نظم یا حسیت کو ہونے، ہونے کی نظم یا حسیت کہا ہے (یعنی [illegible]
تعین صورت حال ۔ مترجم) یہاں بھی ہمیں جلدی سے ایک بار پھر حساب لگا کر
پرکھ لینا چاہیے۔ نظم میں ظاہر ہونے والی جامد صورت حال سے بھی ماضی اور حال
کے صیغوں کی مدد سے رفتار کا فریب ہو سکتا ہے۔

ترانہ میں ایک بھی PARTICIPLE نہیں ہے۔ رفتار کا دھوکا صرف استعاروں
کے استعمال سے ممکن ہے۔ ایسی نظم ہیں جو متحرک استعارے ہیں جو جامد صورت حال کو
ظاہر کرتے ہیں۔ ترانہ میں اس قسم کے استعاروں کا کوئی استعمال نہیں ہوا ہے۔ سچ تو
یہ ہے کہ نظم پر ایسی باتوں کا الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے جو نہ اس میں کی گئی ہیں اور
نہ انھیں اپنایا گیا ہے مگر صرف جزوی یا ناکافی معلومات کی بنا پر نتیجے نکالنے کی
ضرورت نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ بنیادی طور پر نظم کے غیر فعالی افعال کے ڈھانچے اور پھر
پارٹی سپل (فعل، اسم، فعل صفت بھی) اور نامیاتی استعاروں کے پیش نظر یہ نتیجہ
نکالا جا سکتا ہے کہ نظم میں جو حسیت سموئی گئی ہے وہ غیر متحرک مناظر سے متاثر
حسیت ہے۔

یہ نتیجہ نظم میں افعال کے استعمال کی نوعیت سے نکالا گیا ہے مگر جیسے پہلے کہا
جا چکا ہے۔ اصل نظم نظم کی مادی ساخت سے ماورا ہوتی ہے۔ انجام کار نظم آوازوں کے
بعد آنے والی خاموشیوں کی طرف جاتی ہے۔ لسانیاتی سانچوں کا تنوع اور رفتار کی
خاموشیوں کے دو بنیادی اصولوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ مشابہت کا اصول اور تداعی
اور پیوستگی کا اصول۔ نظم کا مشابہت کے اصول سے بڑے کام سابقہ رہا ہے۔ نظم کے
بعض عناصر کو استعارے کی شکل میں ڈھالنے کی اکثر کوششیں ہیں مگر واضح طور
[illegible] نظم

[illegible] سے بار بار [illegible] اندر ایک مدھم مگر [illegible] استعارے کی تہہ داری
اور فراوانی کا احساس ہوتا [illegible] بعض اصول نظم کے اندر موجود نظر آتا ہے
[illegible] ربط باہمی [illegible] مگر ان عناصر کو پہچاننے کے لیے مجھے بڑے صبر
اور کاوش سے کام لینا پڑا [illegible] تو ترانہ (ہندی) غزل کی طرح لگتا ہے جس
میں غنا ہے مگر تسلسل نہیں ہے مگر کیا ہم ترانے کے اشعار کی ترتیب اس کے معنی
اور مقصد کو مجموعے کے بغیر بدل سکتے ہیں؟ میں نے اس کی کوشش کی اور مجھے ایسا
احساس ہوا کہ یہ غزل سے مختلف ترتیب ہے۔ میں نے بار بار کوشش کی اور اس نتیجے
پر پہنچا کہ ہم مشابہ اور یکساں کے امتزاج سے بنے ہوئے پیوستگی اور ربط کے اصول [illegible]
سے دوچار ہیں (یعنی یہاں یکساں عناصر کی تکرار نہیں ہے بلکہ مختلف عناصر کے درمیان
ربط سے حاصل کردہ وحدت ہے ــــ مترجم) اس سے قبل ہم تضادات کے درمیان
توازن پیدا کرنے کی مختلف نحوی تراکیب کا ذکر کر چکے ہیں۔ اب میں مختلف عناصر
میں ربط و ترتیب پیدا کر کے ان سب کو ایک ساختیاتی وحدت میں ڈھالنے کے
تصور کے سلسلے میں آپ سے تبادلۂ خیال کروں گا۔ حسب معمول میں پھر شروع سے
بات کی ابتدا کرتا ہوں۔

پہلا شعر استعاراتی اظہار ہے۔ ہندستان گلستاں ہے اور ہندستانی بلبلیں
ہیں (۱) بلبل سے مختلف چیزوں کی یاد آتی ہے ان میں ایک ہجرت کا تصور بھی ہے
دوسرے شعر میں غربت یعنی پردیس کا ذکر ہے۔ بلبل (ہندستانی) غربت میں رہنے
والی اپنے بچھڑے ہوئے وطن کو یاد کرتی ہے۔

(۲) ایک خاموش سوال یہاں ابھرتا ہے۔ کیا بلبل (ہندستانی) اپنے عزیزوں
کو تنہا اور بے سہارا وطن میں خیالی یا حقیقی دشمنوں کے رحم و کرم میں چھوڑ آئی
ہے۔ پھر ہمالیہ ہے جو مستقل سنتری اور محافظ ہے۔

(۳) ہمالیہ کے سلسلے میں نظم اس کی گودی میں کھیلتی ہوئی ہزاروں ندیوں کا
ذکر کرتی ہے۔ یہ گودی میں کھیلتی ہوئی ندیاں چھوٹے بچوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں

کیا بلبل اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے [illegible]
اثبات میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی یہ کہ ٹگوری اور تخلیق کے [illegible] واضح طور پر اشارہ کرتے ہیں پھر شعر کے دوسرے مصرعے میں گلشن [illegible] شعر میں بلبل کے سلسلے میں آ چکا ہے۔

(۴) اب تک نظم ہومر کے [illegible] ہے۔ مونث بلبل ایک اجنبی دیس میں اپنے وطن یا گلشن کو اور [illegible] کو یاد کرتی ہے جنہیں وہ وہاں چھوڑ آئی ہے۔ اس کے اندر اپنے بچوں کی [illegible] کی طرف سے موہوم سا [illegible] ہے تب وہ کسی پدرانہ قسم کے محافظ کے [illegible] ہے۔ ایسا محافظ جس کی نگریں آنکھوں کے سامنے ہزاروں بچے کھیلتے [illegible] وطن اب ایک خوب صورت گلشن اور جنت کی طرح پرسکون لگنے لگتا ہے۔

(۴) یہاں غربت والی بلبل کا استعارہ ختم ہوتا ہے بلبل کا ذکر ختم ہو جاتا ہے مگر غربت (اور اجنبیت) قایم رہتی ہے۔ [illegible] کے ذکر سے نظم اب واحد دریا، دریائے گنگا کی طرف رجوع ہوتی ہے۔

(۶) گنگا کا تلازمہ مذہب سے ہے اور مذہب کا اندرونی خلفشار اور ٹکراؤ سے۔

(۷) اندرونی ٹکراؤ سے یونان و مصر و روما کی تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔

(۸) اس ٹکراؤ سے ذہن اپنے بچاؤ کی طرف جاتا ہے جو ذہنی اور حیاتی عمل میں قدرتی عمل ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ مذہبوں کے پیدا کردہ اندرونی ٹکراؤ اور بیرونی خطروں کے باوجود ہم مٹے نہیں اور ابھی تک ہمارا نام و نشان باقی ہے؟

(۹) غربت میں رہنے والا شہری اجنبیت محسوس کرتا ہے وہ سرزمین جو جنت کی طرح پرسکون ہے اندرونی طور پر ٹکراؤ اور اضطراب کا شکار ہے اور اسے

[illegible] مستقل محافظ [illegible] مذہب کی اخلاقی اقدار سے وابستہ ہندوستانی آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو سکتے ہیں۔ خود وطن ہندوستانی کو اس سے دکھ ہوتا ہے اسے اپنے خلاف پاکر اپنے ہموطنوں کی دشواریوں کے باوجود دشمنے بے فخر ہے مگر وہ اندرونی ٹکراؤ اور بیرونی خطروں سے دکھی ہے وہ ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جو صورت حال اور آئندہ آنے والے تغیرات سے بے خبر اور آگاہی سے خالی ہے

شاید میں جذباتی ہوتا جا رہا ہوں جس میدان کو مجھے روکنا چاہیے کیا میں یہاں ربط و یکسوئی کے زیر میں سانچوں کا نقشہ پیش کر سکتا ہوں جس سے ہم ایک نظر میں واضح طور پر سب کچھ پہچان لیں گے۔

ماضی کی یاد

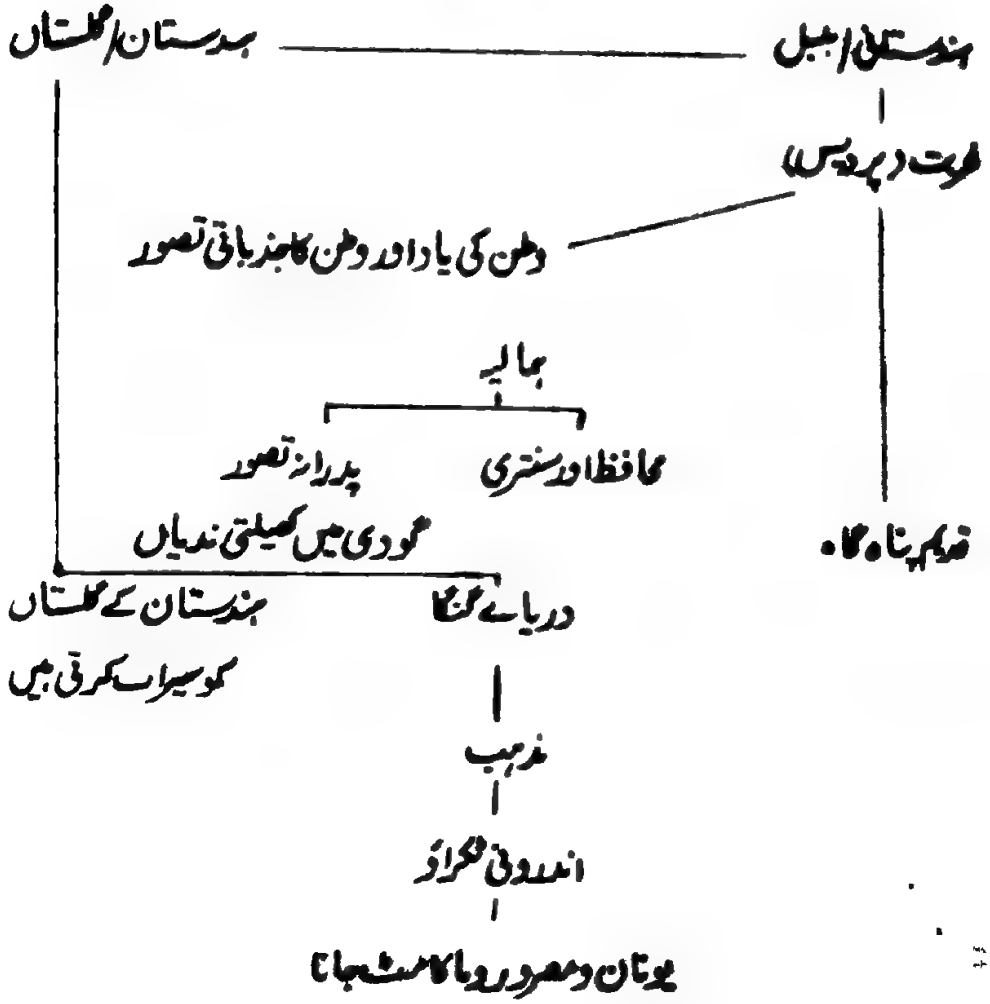

۱

ہندوستان کا نام و نشان باقی رہا

درد نہاں

اب وقت ہے کہ ہم اپنی دلیل کو یہ کہہ کر سمیٹ لیں کہ نظم بنیادی طور پر تناؤ کی حسیت کی پیداوار ہے اور موجود اور غیر موجود کے درمیان اور نشاط اور دکھ کے درمیان توازن قائم کرتی ہے اور مختلف ذہنی صورتوں کو پیش نظر کے طور پر قائم کرتی ہے ایک ایسی حب وطن کی حسیت ہے جو پردیس میں شدید احبیت کا شکار ہے۔ نظم تہذیبی صورت حال کو عہد جدید میں ایک جامد اور متعین صورت حال کی طرح دیکھتی ہے اور اس کے ماضی سے تو کچھ آگہی کا اظہار کرتی ہے مگر اس کے مستقبل سے سروکار نہیں رکھتی۔ یہ ایک ایسی حسیت ہے جو بنیادی طور پر تلازموں کے ذریعے اور محض ثانوی طور پر مشابہتوں کے ذریعے کارفرما ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب میرا کام پورا ہوا البتہ مجھے دو چار لفظ بطور وضاحت کہنے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ میں نے خود کو نظم کی چار دیواری ہی میں محدود رکھا ہے اس عمل میں حسیت کے جن عناصر کی پہچان کی گئی وہ صرف ایک نظم کے ہیں اور اقبال کی تمام شعری تصانیف پر محیط نہیں ان کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے دور پر بھی محیط نہیں۔

اب دو سوال اور ابھرتے ہیں۔ کیا یہ عناصر ہی نظم کے لیے مخصوص ہیں؟ اور دوسرے کیا یہ اس غیر شاعرانہ غیر لسانی ماحول کا نقش ہیں جس میں یہ نظم تخلیق ہوئی؟ ظاہر ہے کہ یہ ان دونوں کے جوابات بالکل مختلف رویے، طریق کار اور وسائل مانگتے ہیں۔ میں ایک مقالے میں دو مطالعے پیش کرنے سے گریز کروں گا مگر نہایت انکساری سے اس موضوع پر مختصر تبصرہ پیش کرنا چاہوں گا اور اس سلسلے میں بھی مطالعے کے اندرونی حد بندی کو ملحوظ رکھوں گا۔ ہر نظم لسانی ترتیب کا ایک ٹکڑا

[illegible] غیر لسانیاتی دنیا سے ہم آہنگ ہوتا ہے ہر نظم اپنے طور پر ایک دنیا ہے اپنی انفرادیت اور اپنی وابستگیوں کا جواب دہی ہے کہ اس کی طرف شاعر کے قابل ہوتی ہے۔ دراصل یہ انفرادیت دوسروں سے اسے علیحدہ کرتی ہے اور وابستگیاں اسے دوسروں میں اور ان کے درمیان رابطہ دو حصل ایک ہی سطح کے دو رخ ہیں۔ اس نظم میں "ہمارا" کی تکرار غیر انفرادی، لہٰذا انوکھے پن کے خلاف ہے سننے والے ہی نظم کے متکلم بھی ہیں اور وہی نظم کے عنصر بھی۔ نظم اور نظم پڑھنے والے کے درمیان کا امتیاز اگر ختم نہیں ہوتا تو بہت مبہم ہو جاتا ہے۔ میں اس تکرار کو ردیف ہونے کی وجہ سے تکنیکی مجبوری سمجھ سکتا تھا مگر "ہم" کی تکرار، "ہمارا"، "ہماری"، "اپنا" آپس میں پوری نظم میں موجود ہے اور نظم کے وطنی غیر امتیازی کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ نحوی شکلوں کی تکرار پر غور کیا جائے تو نظم کا مرکزی موضوع ہندستان کی بجائے ہم ہندستانی ہے۔ نظم کا عنوان بجا طور پر ترانۂ ہند کے بجائے ترانۂ ہندی ہے۔ ہندی (یعنی ہندستانی) اسے محض ایک باہری کردار کی طرح نہیں گاتا بلکہ اس کا اہم عنصر بن جاتا ہے۔

معنیاتی سطح پر نظم میں اصطلاحات یا رویے کی ندرت کی طرف ہلکا سا جھکاؤ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں نہ کوئی اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ نہ جدید ترین ایوان گاردانہ تربیت یافتہ نقاد۔ یہ تو سلامتی اور اتحاد کی مشترکہ کوشش کا ایک ملا جلا اظہار ہے۔ گو ایک شاعر نے اسے لکھا ہے مگر یہ نظم بول چال کے ایسے قدیم دور سے تعلق رکھتی ہے جب الفاظ مخاطب کی موجودگی کے بغیر ادا نہیں کیے جاتے تھے۔ یہ نظم آج کی ضروریات کے مطابق قومی ترانہ کہی جا سکتی ہے مگر اس سے بھی زیادہ ہے یہ نسلی لاشعور کی جادوئی باقیات (کچھ بات ہے) مذہب (مذہب نہیں سکھاتا) آباؤ اجداد (کارواں) قبائلی خواہش کی تکمیل (جہاں) کے ساتھ اتحاد کے احساس کو ظاہر کرتی ہے یہ سب مل کر وحدانی جمالیات کی ہیئت کی تشکیل کرتے ہیں جو میں تم کی دوئی کی گنجائش نہیں رہنے دیتی۔

اس ادبی سفر میں ساتھ دینے کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ میرے [illegible]
دعویٰ کرنا پتنگ مارنے کے برابر ہوگا کہ میں اس حیثیت کی نشاندہی کرنے میں
کامیاب ہوگیا جو میری اپنی حیثیت سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ نسلی گہرائیاں
پوری طرح سطح پر نہیں لائی جا سکتیں۔ ادب میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہوتی ہے
جو خوشگوار طور پر ہماری گرفت سے باہر رہ جاتی ہے۔ کوئی گہرا ادب پارہ کبھی پوری
طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ مانوس فن پارے کبھی کبھی زندگی کے بالکل ہی نامانوس
اور پُراسرار تھرتھراہٹوں سے ہمیں قریبی ربط میں لا کر ہمیں خوش کر دیتے ہیں اور
شاید ناکافی ترسیل یا تفہیم کے احساس سے ہمیں اداس بھی کرتے ہیں۔

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(ترجمہ : م۔ ح)

(انگریزی مقالہ اقبال پر بین الاقوامی مذاکرے کے موقعے پر پڑھا گیا)

"عصری ادب" اگلے شمارے کی ایک جھلک

۱۔ خوشامدی ادب : کیوں ؟ اور کیسے ؟
۲۔ محاسبہ
۳۔ دس سال کی اردو نظموں پر تبصرہ
۴۔ تذکرہ شعرائے ہند (قسط اول)

سید احتشام احمد ندوی

تقابلی مطالعہ کا ارتقا

تقابلی مطالعہ عالمی شاہ کاروں کے درمیان ربط قایم کرتا ہے۔ تنقید میں تخلیقی روح پیدا ہوتی ہے اس تنقید کے اصل اجزاء تقابل، قیاس، مشابہ افکار و آرا یا مغائر انداز، اور توارد جیسے عناصر ہیں۔ تاریخی بھی وجدانی بھی۔ تقابلی مطالعے میں "تاریخی تنقید" کا عنصر لیسن [illegible] نے شامل کیا ہے۔ چونکہ تقابلی مطالعہ بھی عام ادب کی ایک شاخ ہے اسی بنا پر اس میں بھی تاریخ کا عنصر اُسی حد تک کارفرما ہے جس طرح عام تنقید میں ہم کو تاریخ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاریخی انداز سے ادب کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک ادب دوسرے ادب سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ اس اندازِ فکر کے علمبرداروں نے اس پر بحث کی ہے کہ کس طرح یونانی ادب، لاطینی ادب سے مربوط ہے اور کس طرح چینی اور ہندستانی ادب نے ایران اور مشرق وسطیٰ کے ادب پر اثر ڈالا ہے۔ قدیم مآخذ سے ان ثقافتی اور تمدنی باہمی لین دین کا پتا چلایا ہے جو مختلف قوموں میں جاری تھا۔ انھوں نے مختلف تحریکوں اور فکری دھاروں کے پیچھے ان عوامل پر روشنی ڈالی ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں آئے ہیں اور انھوں نے فکر و ادب کو متاثر کیا ہے۔ یہ لوگ ادبی موضوعات، ادبی شہ کاروں، ادبی تخلیقات اور ادبی عوامل کی تفسیر میں تاریخ کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے ارتقا میں مختلف قوموں

[illegible]

کے ارتقائی منازل سے اور ان کے اثرات سے بحث کر کے نتائج اخذ کرتا ہے
کے برعکس ایک دوسرا طریقہ بھی تقابلی مطالعہ کا سامنے آتا ہے اس کو وجدانی طریقہ
کہا جاتا ہے۔

وجدانی نظریہ کے حامل نقاد کہتے ہیں کہ تاریخ ایک علم سازی ہے۔ ہر مورخ
اپنے اندازے سے تاریخ لکھتا ہے بلکہ تاریخ سازی کرتا ہے۔ تقابلی مطالعہ کا اصلی
طریقہ اس گروہ کی رائے میں وہ انسانی نفس سے متعلق جذبات ہیں جو وجدانی طور
پر شعر و ادب میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ کیفیت سارے انسانوں میں عام ہے۔ یہ
مقاصد و موضوعات اصلاً ادبی نہیں ہوتے جو انسانی نفس کی گہرائیوں میں جنم لیتے
ہیں مگر ادیب اپنی ادبی صلاحیت سے ان کو ادبی شکل عطا کرتا ہے اس کا ذوق
انسانی، قلب اور نفس کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاریخ اس کی تائید کرے یا نہ کرے
اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ادیب کو جو کچھ وراثت میں عطا ہوا ہے، جو فکر و
نظر کی دولت اس نے ذاتی مطالعہ و مشاہدے سے حاصل کی ہے اور جو اندرونی
خلش وہ اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے وہ اپنے ذوق و ذہن کے مطابق پیش
کرتا ہے اس اندرونی کیفیت کی تاریخی طریقہ سے تشریح و تحلیل ممکن نہیں یہ
عالم وجدان کا عطیہ ہے جو فکر و فن کو متاثر کرتا ہے۔

نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیا کے مختلف
ملکوں میں جو ادبی و فکری سرمایہ تیار ہوا ہے اس کے اثرات عالمگیر ہیں
یونان کے افکار نے ساری دنیا کو متاثر کیا۔ ہندستان کا علم و ادب سارے
عالم میں پھیلا۔ عربوں کی ترقی کے اثرات سارے میں ظاہر ہوئے جس کی وجہ
سے اب یورپ کی تمدنی ترقی کے جلوؤں سے سارے شہر جگمگا رہے ہیں بلکہ
اب تو یہ عالم ہے کہ آج کوئی اہم ادبی کارنامہ وجود میں آیا اور کل اس کے ترجمے
ساری دنیا کی اہم زبانوں میں پھیل گئے۔ اس بنا پر آج کا ادب دراصل عالمی
ادب کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے اور اب یہ ممکن نہیں کہ اصل انسانی [illegible]

[illegible] محفوظ رہ جائیں۔

تاریخ کے پردہ زنگاری کو دیکھیے کہ کس طرح انسانی افکار نے قوموں اور ملکوں پر اثر ڈالا ہے کس طرح ایک ادب نے دوسرے ادب کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ اس تناظر میں دنیا کی عظیم اقوام کے ادب کا مطالعہ ایک نیا باب کھولتا ہے اور ہمارے ذہنی افق کو وسیع کرتا ہے۔ کس طرح یونانی ادب نے رومانی ادب پر غلبہ پالیا۔ رومن جو یونان کے حاکم تھے۔ مگر فکر و نظر اور ادب و شاعری میں وہ یونان کے محکوم بن گئے۔ ان کے صاحب نظر ناقدوں اور ادیبوں نے اعلان کر دیا کہ یونان کے اتباع کو ڈرامے اور شاعری میں اصل اہمیت حاصل ہے۔

خود عربوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے کہ کس طرح انھوں نے غیر ملکوں کے علمی سرمائے سے استفادہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے ایک رات ایک خواب دیکھا کہ ایک شخص نہایت صاف و سفید لباس پہنے اور سنہری گھنی سفید داڑھی والا سامنے کھڑا ہے۔ اس سے خلیفہ نے دریافت کیا کہ "تم کون ہو" اس نے جواب دیا کہ "میں ارسطو ہوں"۔

صبح کو خلیفہ نے یہ خواب بیان کیا اپنے درباریوں سے، اور ایک وفد بھیجنا طے کیا قسطنطنیہ کو تاکہ وہ ان کتابوں کو لے آئے جن کو دہریت اور بے دینی کے ڈر سے پادریوں نے ایک مکان میں مقفل کر دیا تھا۔ یہ سب یونانی فلسفیوں اور اہل نظر کی کتابیں تھیں جن کو حفاظت سے تالوں کے اندر رکھا تھا تاکہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر مذہب سے بدظن نہ ہو جائے۔

جب یہ وفد قیصر روم کے پاس گیا تو قیصر نے پادریوں سے مشورہ کیا انھوں نے کہا "اے بادشاہ! یہ تو بڑا مبارک قدم ہے اس سے اسلام میں اختلافات پیدا ہوں گے اور اس مذہب میں فلسفہ اور دہریت پھیلے گی [illegible] یونانی کتابوں کے ذخیرے کو مسلمانوں کے حوالے کر دیجیے"۔

چنانچہ ساری کتابیں بغداد آئیں اور ان کے ترجمے کے لیے [illegible]
دارالحکمت قائم کیا اور عیسائیوں کو ترجمے کی خدمت پر مامور کیا [illegible]
زبان سے واقف تھے۔ کہتے ہیں کہ اس نے ترجموں کی کتاب کے وزن کے برابر
سونے سے نوازا۔ ان کتابوں کے ذریعہ عربوں کی عقلی زندگی بالکل بدل گئی۔
معتزلہ کا نیا فرقہ پیدا ہوا جو عقل پر زور دیتا تھا۔ مرجیہ، قدریہ، جبریہ اور کئی
ہی فرقے یونانی فلسفے نے پیدا کیے۔ ان کے اثرات ادب پر بھی بالواسطہ پڑے۔
مثلاً تفسیر پر معتزلہ نے خاص توجہ کی اور بہت سی تفاسیر لکھیں جن میں کشاف
بھی ہے زمخشری کی تفسیر بھی ہے جو آج بھی ہمارے مدارس عربیہ میں رائج ہے
اور تفسیر کی مقبول کتاب تصور کی جاتی ہے۔ خود الجاحظ معتزلی ادیب تھا اور
خود اس کا اپنا ایک فرقہ اعتزال میں تھا جو فرقۂ جاحظہ کہلاتا تھا۔

اس موقع پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ عربوں نے یونانی ادب کی کسی کتاب کا
ترجمہ نہیں کیا ورنہ عربی ادب میں زبردست انقلاب آجاتا اور ڈرامہ نگاری کا
باب کھل جاتا۔ اتفاق سے چند کتابوں کو فلسفہ اور منطق کی کتابیں تصور کرکے
عربوں نے ان کو عربی میں منتقل کیا ان میں کتاب الجدل ہے جو منطق سے متعلق
ہے مگر دوسری بوطیقا (POFTICA) ہے اور ریطوریق (RETORICA) ہے۔
پہلی کتاب کا فصیح ترجمہ کتاب الشعر ہے اور دوسری کتاب کا ترجمہ کتاب الخطابۃ
ہے۔ ان دونوں کے اثرات عربی تنقید پر بھرپور انداز سے مرتب ہوتے ہیں اور
خود ابن سینا نے بھی ان کی شرحیں کتاب الشفا میں لکھی ہیں۔ مگر لطف کی بات
یہ ہے کہ عربوں کے یہاں چونکہ ڈرامے کا فن موجود نہ تھا اسی بنا پر ان کو ٹریجڈی
اور کامیڈی کے تصور کو سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ مثلاً ان کتابوں میں ٹریجڈی
کا ترجمہ مدح نگاری اور کامیڈی کا ترجمہ مرثیہ نگاری کیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے
کہ عرب شعر و ادب میں اپنے آپ کو بہت برتر تصور کرتے تھے۔ اس بنا پر
انھوں نے ادب کی کسی کتاب کا ترجمہ سرکاری طور پر نہیں کرایا۔ جاحظ نے یہ تو

تسلیم کیا ہے کہ یونانی فن خطابت سے واقف تھے اس لیے کہ اس نے بعض یونانی کتابیں پڑھی تھیں مگر اس کا خیال تھا کہ یونانیوں میں کوئی خطیب پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ اس سے یونانی ادب سے جاحظ کی سطحی واقفیت مترشح ہوتی ہے۔

یہی جاحظ لکھتا ہے کہ عربوں نے علم بلاغت ہندستان سے اخذ کیا ہے۔ بلاغت درحقیقت فصاحت کا عنصر بھی اپنے اندر رکھتا ہے یعنی ہر لفظ فصیح ہو تو یہ فصاحت ہے مگر یہ فصیح الفاظ اور جملے اگر مناسب موقع سے استعمال ہوں تب وہ کلام بلیغ ہوگا اگر فصیح کلام کو نامناسب موقع سے استعمال کر دیا جائے تو وہ باوجود فصیح ہونے کے بلیغ کلام تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ عربی بلاغت کی کتابیں ان بحثوں سے پُر ہیں مگر ان کا مرجع ہندستان کو بتایا گیا ہے۔ اب تقابلی مطالعہ کا کتنا اہم پہلو ہمارے سامنے آرہا ہے کہ اس بلاغت نے جو نیا رنگ عربی میں اختیار کیا اور جو بعد میں بلاغی تنقید بن گئی اس نے شعر و ادب پر تو خیر غیر معمولی اثرات مرتب ہی کیے مگر اس نے فارسی ادب، شعر، بلاغت، علم بدیع، معانی، بیان اور ادب کے تمام پہلوؤں پر بھرپور اثرات ڈالے اور اس کے بعد یہ مباحث اردو ادب تک پہنچے اور صنائع و بدائع سے پُر عبارتیں اردو میں بھی لکھی جانے لگیں بقول حالی "اس ابتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں"۔

اگر اس ابتدا کی خبر کا جائزہ لیا جائے تو عرب، ایران، ترکستان اور ہندستان سب پر اس کے اثرات نہایت دیرپا ثابت ہوں گے اور یہی میدان ہے تقابلی مطالعہ کا مثال کے طور پر ایک دوسری بحث کو لیجیے۔ یہ معروف حقیقت ہے کہ عربی میں "کلیلہ و دمنہ" کا ترجمہ پہلوی سے ابن مقفع نے کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک ایرانی بادشاہ نے ایک شخص کو ہندستان بھیجا کہ وہ سنسکرت سیکھے اور اس کتاب کا ترجمہ کرائے۔ وہ شخص ہندستان آیا، یہاں ٹھہرا، سنسکرت زبان سیکھی اور بڑی مشکل سے، مگر اس کو کتاب کوئی نہیں دیتا تھا لہٰذا چرا

لے گیا۔ یہ کتاب ایران پہنچی اور وہاں اس کا ترجمہ ہزار سہلی کے نام سے پہلوی زبان
میں ہوا یعنی قدیم فارسی میں، اور اس کو ابن مقفع نے عربی میں منتقل کیا اور
س شان سے کہ آج وہ عربی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے زبان و
بیان اور اسلوب سکھانے کے لیے پڑھائی جاتی ہے اور درسی کتابوں میں
س کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی اکثر فرماتے کہ عربی اسلوب
کے نکات سیکھنے کے لیے کلیلہ و دمنہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں اور یہ قول وہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے نقل فرماتے تھے کہ وہ عربی کے معروف
ادیب ہیں۔ ان مثالوں سے عربی ادب پر عالمی اثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا
ہے کہ یہ اثرات ہندستان، ایران اور یونان سے مستعار ہیں اور تقابلی مطالعہ
کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتے ہیں۔

عربوں کی تہذیب و تمدن سے ایک مثال اور دی جاسکتی ہے کہ انھوں نے
یورپ میں تمدن پھیلایا اندلس کی راہ سے۔ موسیو لیبان تمدن عرب میں
لکھا ہے کہ یورپ کی شاعری میں قافیہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ یورپ نے
خصوصاً فرانس نے قافیہ کا استعمال شاعری میں اندلس کے عربوں سے سیکھا۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ تقابلی مطالعہ اور ایک قوم کے ادب کی
دوسرے قوم پر اثر انداز ہونے کی دانتے کی ڈیوائن کامیڈی (طربیہ خداوندی) ہے
جس پر ابوالعلائیوں کی کامیڈی رسالۃ الغفران کے اثرات واضح ہیں۔ دراصل
اٹلی نے سب سے پہلے عربوں کے اثرات قبول کیے وہاں عربوں کے طرز پر
یونیورسٹیاں اور درسگاہیں قایم کی گئیں اور عربی کتابوں کے ترجمے وہاں پہنچے۔
س خیال کو تقویت اس امر سے ملتی ہے کہ عیسائیت میں جنت و دوزخ کا تصور
تو ہے مگر "اعراف" کا عقیدہ صرف مسلمانوں میں پایا ہے اسلام میں اور خود
قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اعراف میں ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے ساتھیوں کو
پہچانیں گے۔ دانتے نے اپنی کتاب میں اعراف دکھایا ہے جو رسالۃ الغفران کا اثر ہے۔

ابن المعتز عباسی نے کتاب البدیع تصنیف کی جس میں اس نے ارسطو کی کتاب الخطابت سے مواد اخذ کیا۔ اسی طرح خواجہ بن جعفر نے اپنی کتاب نقد الشعر میں کافی اخذ و استفادہ ارسطو کی کتاب الشعر سے کیا ہے۔ کتاب الجدل سے اسحاق بن ابراہیم کاتب نے نقد النثر میں [illegible] قدیم و وسطی کی تصانیف یونانی، ہندستانی اور فارسی اثرات سے مالا مال تھے ایرانی بادشاہوں کے عربوں میں رائج ہو گئے۔ تقابلی مطالعہ کے لیے عصر عباسی کی تصانیف میں بہت کچھ مواد ہم کو نظر آتا ہے۔

ایمون فحان اپنی کتاب الادب المقارن (تقابلی ادب) کے (صفحہ ۱۸) پر لکھتے ہیں کہ عربوں کے توجہ دلانے سے یورپ والوں نے یونانیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کے ترجمے لاطینی زبان میں گئے جس سے یورپ میں موجودہ ترقی ہوئی اور انقلاب آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ موجودہ یورپ کی ساری ترقی اور یونانی اور لاطینی کی دین ہے۔ عربوں نے صرف ان کو اسی طرف توجہ دلائی یہ ایک بڑا تہذیبی اور تاریخی فریب ہے کہ عربوں کے اس عظیم تہذیبی اور تعلیمی انقلاب کو یونان کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ حق تو یہ ہے کہ خود فرانسیسی اور انگریز مصنفین کے بیان کے مطابق یورپ میں تہذیب و تمدن عربوں نے پھیلایا ہے۔ ۵۰۰ برس تک عربی کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے ہیں عربوں کی کتابیں ۴۰۰ یا ۵۰۰ برس تک یورپ کے نصاب میں داخل رہی ہیں سب سے پہلے اٹلی نے عربوں کے انداز پر یونی ورسٹیاں اور درس گاہیں قائم کیں۔ عرب مصنفین کو اسی طرح سند تصور کیا جاتا تھا جیسے آج ہم یورپ کے علما کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ یورپ سے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے اندلس آتے تھے جو قرطبہ اور اشبیلیہ کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لطف تو یہ ہے کہ بعض ایسی یونانی کتابیں ہیں جن کی اصل دنیا سے فنا ہو گئی اور ان کا علم دنیا کو صرف عربی ترجمے سے ہوا۔ عربوں نے یونانی علم پر اضافہ کیا

نھوں نے ان کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ یہی نہیں اہل یونان نظریات رکھتے تھے مگر انھوں نے ان نظریات کو تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر نہیں پرکھا تھا عربوں نے تجربہ گاہیں قائم کیں اور نئے نئے تجربے کرکے سائنس کی بنیاد رکھی۔ یہی حال دوسرے علوم و فنون کا ہے خصوصاً طب، حساب اور علم النجم میں انھوں نے دنیا کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ یہ سب محض علمی و ادبی لین دین اور اخذ و استفادے کے ذریعہ ممکن ہو سکا۔ اس بنا پر یہ نظریہ قائم کرنا کہ یونانی علوم سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ پیدا ہوئی، حقائق پر پردہ ڈالنا ہے۔ عربوں کے علوم نے جدید سائنسی ترقی کی بنیاد رکھی جس کی طرف مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس میں اشارہ کیا ہے کہ:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

عربوں کے علوم صلیبی جنگوں سے نہیں بلکہ اندلس کے ذریعہ یورپ میں پھیلے۔ عربوں کی سب سے بڑی دین تجرباتی طریقہ (EXPERIMENTAL METHOD) ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں ادبی اقدار کا چرچا بڑھا، ادبی تنقید کے حدود متعین کیے گئے مگر ان اصول و قواعد میں محاکات (IMITATION) کا خیال رکھا گیا جو دراصل ارسطو کا نظریہ تھا۔ کلاسکیت کی روشنی سب سے پہلے فرانس میں پھیلی، چودہویں لوئی کے دربار سے اور پھر اس کی چنگاریاں سارے یورپ میں پھیل گئیں۔ کلاسکیت کے بعد ہی ایک لہر ادبی حلقوں میں بین الاقوامیت (COSMOPOLITISM) کی اٹھی۔ فرانس میں یہ شوق عام ہونے لگا کہ وہ دوسری قوموں کے ادب سے واقفیت حاصل کریں۔ چنانچہ لوگوں نے انگریزی اور جرمن ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ فرانس میں جامع علما پیدا ہوئے اور علم ادب کا چرچا عام ہوا۔ ایسے علما جو جامع العلوم (ENCYCLOPAEDIC) کہلاتے تھے اور وہی وجہ تھی سبب بنے انقلاب فرانس کا جس نے سارے یورپ میں انقلاب کی لہر دوڑا

دیگر اقوام کا ادب کیسے بنا

سب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تقابلی ادب کب سے شروع ہوا؟ اگرچہ اس کے آثار پہلے سے تھے مگر اس علم کا نام صراحت سے ۱۸۳۰ء سے سامنے آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ انگریزوں نے فرانسیسیوں اور جرمنوں اور اہل اطالیہ نے ایک دوسرے کے ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور ان کے مفکرین کے خیالات عام ہونے لگے ہوٹن اور لاک کے خیالات کے اثرات پھیلنے لگے۔ انگریزی شاعری نے فرانس پر جادو کا اثر کیا۔ رات، قبر اور غم پر پر تاثیر نظموں نے دلوں کو متاثر کیا۔ اسی دوران والٹیر نے شیکسپیئر کے ادب کا مطالعہ کیا اور اس کی عظمت تسلیم کی۔ دیدرو (DIDEROT) نے تو صاف اعلان کیا کہ "شیکسپیئر کی شخصیت بلند و بالا ہے اور ہم سب بونے ہیں جو اس کی پنڈلیوں تک ہی پہنچ سکتے ہیں"۔

فرانس میں انیسویں صدی میں بنیادی تغیرات واقع ہوئے۔ پروفیسر پال ہزرڈ (PAUL HAZARD) نے اپنی کتاب تقابلی ادب میں لکھا ہے کہ فرانس نے انگریزی اور جرمن ادب کا مطالعہ کر کے اس سے اپنا فکری و ادبی اُفق روشن کر لیا ہے اور اس میں وسعت و عظمت پیدا کر لی ہے۔

سترہویں صدی کے ادبا اور نقاد، ادب کے قواعد اور خصوصاً جمال مطلق یا حسن محض پر راضی ہو گئے مگر انیسویں صدی کے ادیبوں نے اس سے تجاوز کیا بلکہ ان پیمانوں سے بغاوت کی جو جمالیات اور ادب کے بارے میں گذشتہ دو صدیوں میں قائم کیے گئے تھے۔ انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ حسن مطلق نہیں ہوتا اس کی شکلیں بدلتی ہیں وہ عرفان و مکان، جنس و نسل، عادات و اطوار سے متاثر ہوتا ہے اور رسم و رواج کے اثرات بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ جمال کی سمت و کیفیت اور خصائص و ذوق کے بارے میں مسائل سامنے آئے۔ اس سلسلے میں ہر قوم اور ہر ملک کے جمالیاتی پیمانے بدل جاتے ہیں۔ خود یورپ کے شمالی اور جنوبی ممالک میں بڑا فرق ہے۔ جنوبی یورپ کلاسکی ادب کا گہوارہ بن گیا مگر

شمالی یورپ نے اس سے آزادی حاصل کرکے اور رومانی تحریک چلائی۔

رومانی تحریک نے تقابلی ادب کو ترقی دی۔ اس نے ان بیانوں کو برابر کر دیا جو دو ہزار برس سے قائم تھے اس نے ادب کو انفرادی کوشش اور انفرادی زندگی، مذاق و مزاج کا ترجمان قرار دیا۔ انسان کے نفسی رجحانات و تجربات اور نارسائیوں کی ترجمانی کو اصل قرار دیا گیا۔ رومانی ناقدوں نے بھی ادبی تنقید و تحلیل کی توسیع کی۔ انھوں نے زبان و مکان، جنس و نسل اور معاشرے کو تنقید میں اہمیت عطا کی۔ ان تمام عناصر نے ادب کو مقامیت سے نکال کر آفاقیت کی راہ دکھائی۔ اس آفاقی اور بین الاقوامی مطالعہ کے داعی اور اساطین ادبا میں گیولام (GUILLAUME) شلیگل (SCHLEGEL) مادام ڈی اسٹیل (DE - STAEL) اور ان کے احباب میں جو قصر کاپٹ (COPPET) میں جمع ہوتے تھے اور ادبی بحثیں کرتے تھے جینیوا شہر میں۔

خاص طور سے مادام ڈی اسٹیل وسیع معلومات غیر ملکی زبانوں پر قدرت اور جرمن ادب کے بارے میں وہ اختصاصی مطالعہ کا امتیاز رکھتی تھیں۔ انھوں نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی جو غیر ملکی زبانوں اور ان کے ادب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی جانب سے بے پروائی برتتے ہیں۔ انھوں نے غیر ملکی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا تاکہ وہ دوسرے ادب کو اصل زبانوں میں پڑھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ ڈی اسٹیل نے تقابلی مطالعہ کرکے دو زبانوں کے ادب کے امتیازات واضح کیے، عام اصول بھی بیان کیے جو دوسرے ادب پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔ انھوں نے فرانسیسی ادب کا اس کے پڑوسی ملکوں کے ادب سے موازنہ کیا۔ اغراض و محرکات سے بحث کی۔ ڈی اسٹیل نے جرمن زبان کے متعلق ایک کتاب (DE L'ALLEMAGNE) ۱۸۱۰ء میں شائع کی مگر حکومت نے اس پر پابندی لگا دی اور وہ ۱۸۱۳ء میں لوگوں تک پہنچ سکی۔ اس کتاب نے تقابلی مطالعہ کو پروان چڑھانے میں بنیادی کام کیا۔ انھوں نے اس کتاب میں نقطہ نظر

پیش کیے۔ انھوں نے جرمن ادب سے اخذ کیے تھے۔ انھوں نے جرمن طرز فکر اور نظریات کا موازنہ فرانسیسی انداز نظر اور ادبی تصوروں سے کیا تھا۔ دونوں قوموں کی زندگی، معاشرت اور زبان و ادب کا انھوں نے عمدہ تقابلی مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان امور کا تعلق درحقیقت سیاسی حوادث، نظام حکومت، زبان و سماج کے عوامل سے ہوتا ہے۔ ادب ان سب سے متاثر ہوتا ہے۔ آفاقی انداز انسان کی زندگی میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ دوسروں کے ذہنی سرمایے سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ادب اور عقلی سرمایہ درحقیقت ساری انسانیت کی مشترک میراث ہے۔

تقابلی ادب اپنے اصطلاحی معنی میں انیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں ظاہر ہوا۔ جس طرح سائنس میں حیوانات اور نباتات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کے تقابلی مطالعہ سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اسی طرح دوسرے ادب کے اقدار کو پیش نظر رکھ کر کے نتائج اخذ کیے جائیں تو زیادہ وسیع النظری اور عظمت پیدا ہو سکے گی۔ ادب اسی طرح پنپتا ہے، بڑھتا ہے۔ اگر دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن کا احساس عام حالات میں کسی کو نہیں ہو سکتا۔

جین جاک امپیر (JEANJACQUES EMPERE) نے تمام قوموں کے درمیان فنون و آداب کا تقابلی مطالعہ کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے بعد ایک دوسرے ناقد ویلمین (VILLEMAIN) نے ادبی تقابلی مطالعہ کے میدان میں علمی طریقہ اختیار کیا اور ۱۸۲۸ء میں تقابلی مطالعہ کے موضوع پر خطبات دیے۔ کتاب میں دراصل علمی عظمت ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ان افکار کا جائزہ لیا ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچے اور وہاں انھوں نے ادب کو متاثر کیا۔ تاثر کی مختلف شکلوں کا اس نے بڑا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔

اس دور میں عام طریقہ یہ تھا کہ فرانس سے باہر جو الفاظ رائج تھے ان کا مقابلہ

فرانس کے اندر افکار و الفاظ سے کیا جاتا تھا فرض کیجیے کہ ایک نقطہ نظر
رائج ہے مگر وہ غیر ملکی زبان سے مستعار ہے اس کا مطالعہ بڑی سی لکیروں کی
سے کیا جاتا تھا ابھی سال افکار کا بھی تھا لیکن تقابلی مطالعہ بطور ایک مستقل
کے الگ ہو گیا۔ اس نئے مضمون نے کس طرح ترقی کے مراحل طے کیے اور کس
خود ایک علم بن گیا اس کی داستان مندرجہ تصانیف کے ذکر سے اختصار کے
ساتھ ذیل میں بیان کی جا رہی ہے۔

پوسنٹ (POSNETT) نے ۱۸۸۶ء میں اپنی کتاب تقابلی مطالعہ COMPARATIVE
LITERATURE شائع کی۔ ایڈورڈ راڈ EDOUARD ROD نے تقابلی ادب کے بارے میں
لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ابھی سال نہیں گزرا تھا کہ (MAX KOCH) میکس کوچ
نے ایک رسالہ تقابلی مطالعہ کے نام سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ جوزف ٹیکسٹ
(JOSEPH TEXTE) نے ۱۸۹۵ء میں اپنا مقالہ روسو اور ادب کے عالمی معاد
کے بارے میں پیش کیا اور روسو کی شخصیت کو تقابلی مطالعہ کے تناظر میں
بیٹزیٹ بالڈنسبرگر (BETZET ET BALDENS PERGER) نے تقابلی ادب
بیلوگرافی تیار کی ۱۹۰۴ء تک کی۔ اس میں چھ ہزار تصانیف کا ذکر ہے جو تقابلی
ادب کے موضوع پر تصنیف کی گئی ہیں۔ بل دنسر برگر اور پال ہزرڈ کو تقابلی
مطالعے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں نے
مل کر فرانسیسی میں ایک رسالہ تقابلی مطالعہ شائع کیا۔ اول الذکر کی خدمات
کا دائرہ نصف صدی پر محیط ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے وقفے میں
تقابلی مطالعہ کے میدان میں سب سے زیادہ اہم کام فرانس میں ہوا اور وہاں
نے اپنی امامت و اہمیت قائم رکھی لیکن بعد میں یہ علم رفتہ رفتہ برطانیہ، جرمنی
اور امریکہ میں بھی پھیلنے لگا خصوصاً جرمنی میں اس نے غیر معمولی اہمیت حاصل
کر لی اور وہاں اس میدان میں کورٹ وِیس (KURTWEISS) کی شخصیت ابھر
سامنے آئی۔ اگرچہ پہلے سوویت یونین میں اس طرز کے مطالعہ کو بورژوائی

[illegible] میں اس سلسلے میں جانب توجہ کی جا چکی ہے۔ اس میدان میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ حق یہ ہے کہ اب دنیا کے اہم ملکوں اور یونیورسٹیوں میں تقابلی مطالعہ کے شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی زبانوں کے شعبے اس موضوع پر کام کرتے رہتے ہیں۔

مصادر و مآخذ:۔

۱۔ الادب المقارن از ایمون طحان دار الکتب اللبنانی، بیروت ۱۹۷۲ء (بنیادی مآخذ)

۲۔ حدیث الاربعاء (۳ حصے) از طٰہٰ حسین قاہرہ

۳۔ تمدن عرب از موسیو لیباں

۴۔ الموازنۃ بین ابی تمام والبحتری از بشر بن حسن

۵۔ الموازنۃ از زکی مبارک

اس سہ ماہی کی منتخب تصویر

[illegible] ماہ اپریل [illegible] ریاض

زندگی

ڈاکٹر مصطفیٰ کریم

ہماری زمین جس پر ہم بستے ہیں وہ
اربوں سال کے ارتقا کے بعد وجود میں آئی ہے۔ اور اس ارتقا کا آغاز اختلاجی گرم فولاد کے ظہور سے ہوا۔ فولاد کی طبعی خصوصیتوں نیز اردگرد کائنات میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کی وجہ سے اور خود زمین کے طبعی اعمال سے آخر کار زمین کی وہ شکل نمایاں ہو گئی جسے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی قارئین واقف ہو چکے ہوں گے کہ زمین میں تبدیلیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

زندگی کیا ہے اور اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس سلسلے کی وضاحت سے پہلے یہ جاننا مناسب ہو گا کہ زندگی کی ابتدا سے پہلے کرۂ ارض کی شکل کیا تھی؟ مختصراً یہاں بنجر خطے (جن پر پہاڑ بھی تھے) جہاں مسلسل بجلیاں گر رہی تھیں اور ساتھ ہی بیشمار الٹ بھی اور سمندر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اہم نقطہ یہ ہے کہ سمندر کے پانی اور زمین اور اس کے اوپر جو فضا تھی اس میں وہ تمام عناصر موجود تھے جنہوں نے آخر کار زندگی تخلیق کی۔ ان عناصر میں اہم حسب ذیل کو قرار دیا جاتا ہے' کیونکہ زندگی کا آغاز ان ہی سے ہوا۔ کاربن' آکسیجن' نائٹروجن' ہائیڈروجن' فاسفورس۔

ارتقاء کے اصول کے تحت جوں جوں زندگی پیچیدہ ہوتی چلی گئی' دیگر عناصر بھی زندہ اشیاء میں شامل ہو گئے یا شامل کر لیے گئے۔

زندگی کیا ہے؟

اس کا جواب ہر شخص کے لیے کسی حد تک آسان ہے۔ ہر وہ شے جو متحرک ہے' کھاتی پیتی ہے' افزائش نسل کرتی ہے' اسے زندہ شے تسلیم کرنا چاہیے۔ لیکن حرکت کا ایسی میں بھی ہے۔ ریل

کے انجن میں کوئلہ یا تیل ڈال دیا جاتا ہے تو وہ چل پڑتے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں زندہ شے نہیں کہیں گے۔ ایسے کئی بیج موجود ہیں جو سینکڑوں سال تک مناسب ماحول کے نہ ہونے کی وجہ سے کھلتے پھولتے نہیں ہیں اور جب انہیں مناسب ماحول مل جاتا ہے تو وہ کھلنے پھولنے لگ جاتے ہیں۔ اس لیے ان بیجوں کو بے جان نہیں کہا جا سکتا۔ تمام حیوانات فضاء سے آکسیجن لیتے ہیں اور اسے اپنی نشوونما میں استعمال کرنے کے بعد اس آکسیجن کو کاربن ڈائی آکسائیڈ کی شکل میں اپنے جسم سے خلیات سوڈیم، پوٹاشیم، کلورین، کیلشیم وغیرہ خارج کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جب آگ جلتی ہے تو اس کے جلنے کا انحصار فضاء کی آکسیجن گیس پر ہے۔ جسے آگ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی شکل میں تبدیل کرنے کے بعد دھواں بنا کر خارج کر دیتی ہے۔ لیکن آگ کو زندہ شے نہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ روبوٹ گزشتہ تین دہائیوں کی مشہور و معروف ایجاد ہے اور اب تو جاپان کے بعض تجارتی اداروں میں روبوٹس کو انسانی شکل میں ڈھال کر بہت سارے کام لیے جاتے ہیں۔ ان روبوٹس میں کمپیوٹر کی طرح ہدایتیں جمع کر دی جاتی ہیں اور یہ روبوٹس انسانوں کی طرح مختلف کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی انہیں حیوانوں یا نباتات کی صفوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ یہ روبوٹس نہ تو افزائش نسل کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ آکسیجن یا کاربن ڈائی آکسائیڈ گیسوں کا استعمال اپنی نشوونما کے لیے کر سکتے ہیں۔

ہر زندہ شے کی بنیادی ساخت خلیہ ہے۔ اس کی ساخت اور دیگر خصوصیتوں کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔ یہاں پر اتنا لکھنا مناسب ہوگا کہ اس خلیے کے مرکزے میں جو کروموسومس اور ان کے اندر جو جینیں ہیں وہی دراصل زندگی کی حقیقتیں ہیں یا زندگی انہی سے معنون ہے۔

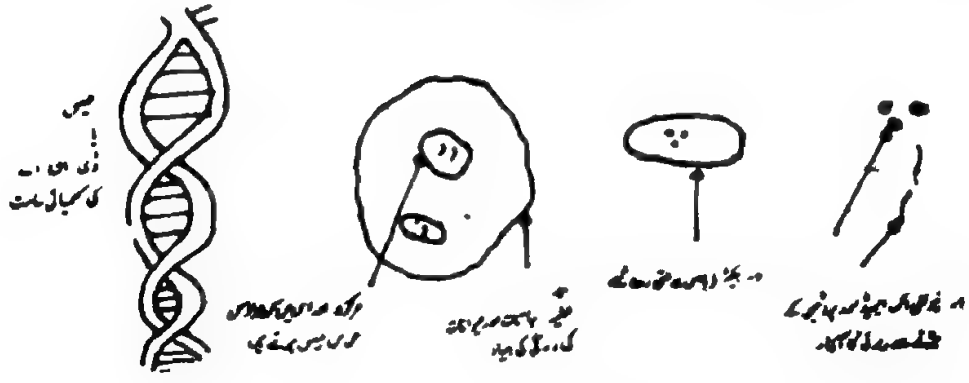

اربوں سال میں زندگی کا ارتقاء

خلیے کی ساری کارگزاریوں کا راز اور اس خلیے کے ارتقاء کی کتاب ہی ان ہی جینیں میں موجود

ہے۔ ان جینیں میں وہ ساری اطلاعات موجود ہیں جن کے تحت خلیے کو زندگی گزارنی ہے۔ جینیں کی عظیم ترین خوبی یہ ہے کہ جب ایک خلیے سے دوسرا خلیہ بنتا ہے تو یہ جینیں بالکل وہی شکل اختیار کر لیتی ہیں جو پہلے خلیے میں تھی اور ان جینیں میں وہ ساری اطلاعات بھی ہوتی ہیں جو خلیے کی ساخت اور کارگزاریوں کو پیچیدہ اور ترقی پذیر رکھتی ہیں۔ مختصراً جینیں سے زندگی عبارت ہے۔

زندگی کا آغاز

سائنٹیفک تحقیق کے مطابق کرۂ ارض پر زندگی کی اولین نمود تین یا چار ارب سالوں کے درمیان ہوئی' اور اس زندگی کے نقوش قدیم چٹانوں پر مرتسم ہیں۔ ان نقوش کو فوسلس کہا جاتا ہے۔ ان فوسلس (FOSSILS) کا حجم' بیکٹریا یا وہ مخلوقات جن کی ساخت صرف ایک خلیے سے ہوتی ہے' کے برابر تھا۔ زندگی کے یہ آثار ان چٹانوں پر پائے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھیں اور اربوں سال پہلے زیر آب تھیں۔ قارئین کا یہ سوچنا درست ہوگا کہ ان نقوش کو فوسلس کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ عین ممکن ہے یہ نشانات طوفانی ہوا یا پانی یا خود چٹانوں کے اندر جو طبعی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کی وجہ سے بن گئے ہوں۔

فوسلس کا مطالعہ ایک وسیع و عریض مضمون ہے۔ اور اس مضمون کے ماہر یہ بتا سکتے ہیں کہ چٹانوں پر یہ نشانات باحیات شئے کی خورد و نوش سے عمل میں آئے ہیں۔ ان فوسلس کو اسٹرومیٹو لائٹ (STROMATOLITE) کہا جاتا ہے۔ کچھ کی شکلیں نیچے دی ہوئی ہیں۔

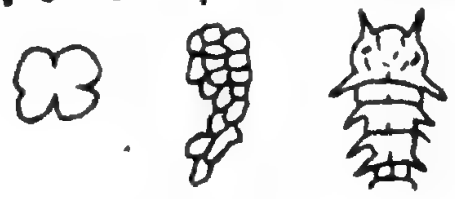

اگر زندگی آج سے اربوں سال پہلے وجود میں آئی تو اس ابتداء کی بابت مفروضے ہی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان مفروضوں میں کسے صحیح کہا جاسکتا ہے یہ بھی سو فیصد ممکن نہیں۔ سائنٹیفک تحقیق کا ایک کام امکانات کا اظہار بھی ہے اور زندگی کے آغاز کے معاملے میں سائنس بس اسی قدر کر سکتی ہے۔ زندگی کی ابتداء کی بابت جو مفروضے متعلق رہے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زندگی کی ابتداء کسی مابعد الطبیعاتی طاقت کے حکم سے وجود میں آئی۔

[illegible] دو ہزار سال پہلے ارسطو نے اپنے مدرسے میں پیش کیا۔ اس وقت سے آج تک اس کے نظریہ پر کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ زندگی کو کسی ماورائی طاقت یا طاقتوں نے اس سر زمین پر نمودار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی کچھ یورپ میں انیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک تمام پیدائش جانداروں کی نشوونما پر بھی صادق تھی۔ انسان کے فکری ارتقاء کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ موجودہ تصورات اور نظریات کی صداقت پر برابر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔

دوسرا مفروضہ ایسا بیان کیا گیا ہے اس کی حقیقت پر آج سے دو ہزار سال پہلے ارسطو نے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ مسئلہ اس کے لیے بالکل فہم تھا کہ ایک انڈے سے ایک چوزا کس طرح بن جاتا ہے۔ اس طرح کی سوچ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انڈے کے اندر ایک طاقت یا ایڈوس (EIDOS) موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے انڈے سے چوزا کی تخلیق ہوتی ہے۔ دراصل ارسطو کا ایڈوس (EIDOS) کا تصور آج کی جینز کی حقیقت سے مختلف نہیں تھا۔ ارسطو کے اس نظریے کو ارتقاء کے اصولوں کا انکار کہنا غلط نہیں ہوگا۔ اس بابت مزید روشنی بعد میں ڈالی جائے گی۔ سردست اتنا لکھنا کافی ہے کہ انیسویں صدی میں لیمارک اور ڈارون نے اپنے اعلیٰ مشاہدوں کے بعد جو مضامین شائع کیے ان کی وجہ سے نباتات اور حیوانات کے ارتقاء کا نظریہ مقبول ہوا اور بہت بڑی حد تک قبول کر لیا گیا۔ اس وجہ سے مابعد الطبیعیاتی طاقتوں کو زندگی کا خالق سمجھنا اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس تصور کو مزید صدمہ انواع و اقسام کی فوسلس کی دریافت اور شناخت سے ہوا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس زمین پر کئی بار ایسی بلائیں آئیں کہ بیشتر زندہ اشیاء فنا ہو گئیں۔

اس لیے اگر کوئی ماورائی طاقت زندگی تخلیق کر دیتی تھی تو اپنی تخلیق کو اس طرح اچانک فنا کر دینا بے معنی تھا۔

۳۔ زندگی کی تخلیق بے جان شئے سے برابر ہوتی رہتی ہے۔

یہ مفروضہ بھی کافی مقبول تھا اور اس کے ثبوت میں مردہ گوشت پر رینگتے ہوئے کیڑوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ یا اس قسم کی کسی اور واردات کو اس مفروضے کی صداقت میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط میں ایک فرانسیسی سائنس داں لوئی پاسچر نے یہ ثابت کر دیا کہ گوشت میں چونکہ مکھیاں انڈے دیتی ہیں اس لیے ان انڈوں سے پلے گوشت پر رینگتے نظر آتے ہیں اور اگر گوشت کو جالی سے اس طرح ڈھک دیا جائے کہ اس پر مکھیاں نہ بیٹھیں تو گوشت میں کیڑے نظر نہیں آئیں گے۔ لوئی پاسچر نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ فضا میں برابر جراثیم اڑتے رہتے ہیں اور کسی بھی سیال شئے کو ان سے محفوظ کرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس سیال شئے کو خاص طرح سے ابالا

جائے۔ اس طرح زندگی کی تخلیق کا یہ نظریہ بھی باطل ہو گیا۔

۲۔ زندگی کے ابتدائی اجزاء خلا سے زمین پر آ گرتے رہے ہیں۔ جن سے ہمارے زندگی تخلیق ہوئی۔

اس نظریہ کو سویڈش سائنسٹ آرہینس (ARRHENIUS) نے اس صدی کی پہلی دہائی میں پیش کیا تھا۔ اس کا تصور یہ تھا کہ خود ترین اجزاء جن میں کاربن اور نائٹروجن شامل ہیں وہ خلا سے زمین پر آ گرے اور ان سے زندگی وجود میں آئی۔ لیکن اس مفروضے کو سائنس دانوں نے جلد ہی رد کر دیا۔ خلا میں اشعاعی اور الٹراوائیلٹ شعاعیں اس قدر تیز ہیں کہ زندگی کے باقی اجزاء کا زندہ رہ جانا ممکن نہیں تھا۔ اسی تسلیم شدہ حقیقت نے آرہینس کے نظریہ کا تابوت زندگی کو رد کر دیا۔

۳۔ زندگی کی نمود اس زمین پر کیمیائی تبدیلیوں کی وجہ سے ہوئی۔ اور تبدیلیاں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں۔

اس نظریہ کو ایک برٹش سائنس داں ہالڈین (HALDANE) اور ایک روسی سائنس داں آپرین (OPARIN) نے ۱۹۲۰ء میں پیش کیا تھا۔ اس نظریے کے تحت یہ بتایا گیا کہ آج سے اربوں سال پہلے زمین اور اس کے اوپر فضاء بہت ہی مختلف تھی۔ فضاء میں اس وقت بجائے آکسیجن کے ہائیڈروجن گیس کی کثرت تھی۔ اور زمین، سمندر اور فضا میں ہائیڈروجن گیس نے دیگر عناصر کے ساتھ کچھ مرکبات بنا رکھے تھے (مثلاً میتھن، امونیا، پانی، فورمل ڈیہائڈ۔ ان پر بجلی اور الٹراوائیلٹ کرنوں کے اثر سے امینو ایسڈ (AMINO ACID) بننا شروع ہو گیا۔

اسی امینو ایسڈ (AMINO ACID) سے پروٹین بنا۔ جس نے نیوکلی اک ایسڈ (NUCLEIC ACID) کے ساتھ مل کر نیوکلیو پروٹین بنایا۔ اس طرح جینز وجود میں آ گئے۔ یعنی نیوکلیو پروٹین، جینز تھے۔ جنہوں نے نہ صرف یہ کہ خود تعمیری (REPLICATION) شروع کی بلکہ ماحول کے زیر اثر نئی نئی اطلاعات بھی جمع کرنی شروع کر دیں اور اس طرح زمین پر زندگی کا آغاز ہوا۔

اس نظریے کو بہت بڑی تقویت ۱۹۵۳ء میں ہوئی، جب کہ ملر (MULLER) اور اوریے (UREY) نام کے دو امریکی سائنس دانوں نے اپنے کاموں میں امینو ایسڈ ڈالا اور جلد ہی امینو ایسڈ پروٹین بنانے کے امکانات بھی واضح ہو گئے۔ اس کے علاوہ لیبارٹری میں فورمل ڈیہائڈ (FORMALDEHYDE) سے وہ اجزاء بھی بنا دیئے گئے جن سے نیوکلی اک ایسڈ یا ڈی۔ این۔ اے (DEOXYRIBO NUCLEIC ACID) بنتا ہے۔ لیکن ابھی تک ڈی۔

ہیں۔ اے کو پروٹین کے ساتھ جوڑ کرنے کیلئے پروٹین یا جینز بننا ممکن نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تصور اب قبول ہو چکا ہے کہ اربوں سال پہلے ایسے کیمیائی حالات تھے جن کی وجہ سے جینز بن گئے اور ان کی خود تعمیری (REPLICATION) اور خود تبدیلی (MUTATION) نے انہیں زندگی کے راز سے آگاہ کر دیا۔

جینز کی سب سے اہم کارروائی انزائمس (ENZYMES) کا بننا تھا۔ ان ہی کے ذریعے جینز زندگی کے کارخانے کو قائم رکھتے ہیں۔ انزائمس دراصل پروٹین کے خورد ترین ذرے ہیں۔ جن کی ساخت کیمیائی طریقوں پر ممکن ہے۔ انزائمس کی تخلیق کے بعد انہیں ضائع ہونے سے بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ کسی طرح جینز اپنے گرد ایک حصار قائم کر لیں۔ اور اس طرح اولین خلیے کی بنیاد پڑی یا اس کی تخلیق ہوئی۔ اس خلیے میں مرکزہ نہیں تھا البتہ جینز ضرور ہوتے تھے۔ آج کے بیکٹیریا اسی قدیم خلیے کی نسل ہیں۔ بیکٹیریا میں مرکزہ نہیں ہوتا۔ جینز ضرور موجود ہوتے ہیں۔ قارئین پر یہ نکتہ واضح رہنا چاہیے کہ خلیے میں جینز کی کیمیائی ساخت جس نیوکلیو پروٹین سے ہوتی ہے اس میں نیوکلی اک اے سڈ یا ڈی۔ این۔ اے میں خود تعمیری (REPLICATION) اور خود تبدیلی (MUTATION) کے اوصاف ہوتے ہیں پروٹین میں یہ وصف نہیں ہوتا۔

زمین پر کیمیائی اور طبعی تبدیلیوں کی وجہ سے جب زمین کے اوپر فضاء میں بجائے ہائیڈروجن کے آکسیجن گیس کی کثرت ہو گئی تو خلیے میں چند انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہو گئیں۔ ان کی وجہ سے جینز نے ایسے انزائمس بنائے جنہوں نے جینز کے گرد ایک حصار تعمیر کر دیا اور اس طرح خلیے میں مرکزہ یا نیوکلیس (NUCLEUS) آگیا۔ اس حصار کی وجہ سے جینز نے خود کو آکسیجن کی کثرت سے محفوظ کر لیا۔ چونکہ آکسیجن کی کثرت بعض اہم کیمیائی کارروائیوں کے لیے مضر ہوتی ہے۔ اس لیے مرکزہ کا خلیے میں نمودار ہونا زندگی کے ارتقاء میں ایک اہم منزل تھی۔

نیز خلیے میں انزائمس کی کیمیائی کارروائیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ آکسیجن کی اور وہ بھی ایک خاص مقدار میں ضرورت برابر رہتی تھی اس لیے جینز کی ہدایت کے تحت خلیے میں مائی ٹوکونڈریا (MITOCHONDRIA) نام کی شئے داخل کر لی گئی۔ یا جینز کی ہدایت کے تحت خلیے میں وہ کیمیائی اور طبعی حالات پیدا کر لئے گئے جن کی وجہ سے خلیے میں مائی ٹوکونڈریا (MITOCHONDRIA) کا داخل ہو جانا لازمی ہو گیا۔ اور اس طرح مائی ٹوکونڈریا (MITOCHONDRIA) کی بقاء خلیے کی بقاء کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئی۔

مالی نوکلوزما بھی زندگی کی قدیم ترین اشیاء کی نمو میں سے ایک ہے۔ اس میں [illegible] پایا گیا ہے۔ نیز ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں خلیے ہوتے ہیں جن میں آکسیجن کے ذرے یا ایٹمس یا مولی کیولس (MOLECULES) قید ہوتے ہیں اور خلیے کو جب بھی آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے تو مالی نوکلوزما انہیں ضرورت کے مطابق اپنی قید سے آزاد کر دیتے ہیں۔

خلیے کی ارتقاء میں ایک اور کارنامہ جینس نے انجام دیا۔ وہ یہ کہ انہوں نے ایک اور اہم نیوکلی اک اے سڈ یا ڈالا جسے آر۔ این۔ اے کہتے ہیں۔ آر۔ این۔ اے یا ری بونیوکلی اک اے سڈ (RIBO NUCLEIC ACID) مرکز میں موجود ہوتا ہے۔

اگر ڈی۔ این۔ اے خلیے میں وہ کلیدات ہیں جس پر لاکھوں ہدایت نامے یا اطلاعات ٹائپ ہیں جو تقریباً اسی حال میں اس مخصوص خلیے کی جینوں کو پہنچ جاتی ہیں۔ تو آر۔ این۔ اے وہ خادم ہیں جن کا کام ڈی۔ این۔ اے کی ہدایتوں کو مرکز کے باہر خلیے میں پہنچانا ہوتا ہے تاکہ خلیے کے انزائمس اپنی کیمیائی حرکتوں کو برابر طے کرتی رہیں۔ ان کی کارروائیوں میں کبھی خلل نہ ہو اور یہ کارروائیاں یا تو کسی خاص حصل پر روک دی جائیں یا اس حصل سے آگے چلی جائیں۔ ارتقاء کی بتدریج پیچیدگی کا راز یہی ہے۔

یوں تو خلیے میں اور بھی اہم اجزاء ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ان کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ یہاں پر اتنا لکھنا مناسب ہوگا کہ خلیہ خواہ وہ نباتات کا ہو یا حیوانات کا اس میں وہی عناصر ہیں جو اس کرۂ ارض پر یا اس کائنات میں ہیں۔

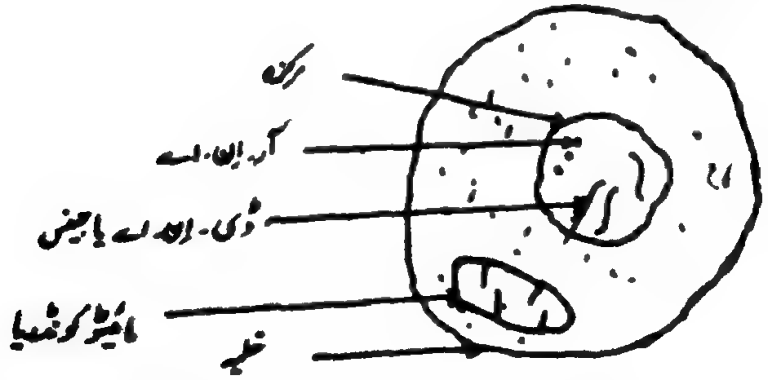

اربوں سال پہلے جب زندگی کی نمو ہو رہی تھی تو اس وقت فضا میں الٹرا وائیلٹ (ULTRA VIOLET LIGHT) بہت تیز تھی۔ اس لیے خشک زمین پر اگر زندگی کی نمو ہوئی بھی تو فوراً فنا ہو گئی ہوگی۔ لیکن یہ نمو جو پانی میں ہوئی اسے پانی نے الٹرا وائیلٹ کے اثر سے بچا لیا۔ یہ روشنی پانی میں جذب کر لی جاتی ہے اور دس بارہ گز سے نیچے نہیں جا سکتی۔ پانی میں جب

زندگی کی تخلیق ہوگئی تو یہ خلیے پانی کی شکل میں رہتے ہوں گے اور پانی میں فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کو اپنی غذا بنانے کے لیے لینا شروع کر دیا اور فضاء میں آکسیجن گیس کا اخراج کرنے لگے۔ جلد ہی آکسیجن گیس کی اتنی کثرت ہوگئی کہ حیوانی زندگی کا آغاز ممکن ہوگیا۔ کیونکہ اس زندگی کا انحصار آکسیجن گیس کے استعمال پر ہے۔ آکسیجن سے فضاء میں اوزون (OZONE) گیس بنی جو الٹرا وائیلٹ شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے۔ اس طرح ان شعاعوں کا مضر اثر حیوانوں پر ختم ہوگیا۔

یہ ظاہر یہ عجیب سا تصور ہے کہ آج کا انسان کروڑوں خلیوں کا بنا ہوا ہے۔ لیکن ہم اگر یہ سوچیں کہ یہ انسان ان ہی اجزاء سے تعمیر ہوا ہے جو اس کائنات میں ہیں اور ساتھ ہی وہ اس کائنات کو کسی حد تک سمجھنے اور تسخیر کرنے کا اعجاز بھی رکھتا ہے تو ہمیں انسان کو اس سرزمین پر عظیم ترین مان لینے میں جھجک نہیں ہوتی۔ وہ اس کائنات کی اہم ترین کڑی ہے اور ساتھ ہی اس جہاں کا سب سے ترقی یافتہ جزو۔

اب انسان اگر بے شمار خلیوں کا مرکب ہے تو اس کے جسم کا کوئی بھی خلیہ کیا ان خلیوں سے مختلف ہے جو نباتات یا دیگر حیوانات کے جسم میں ہیں؟ اس کا جواب ہے نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نباتات کے خلیوں میں بجائے مائی ٹوکونڈریا کے کلوروپلاسٹ (CHLOROPLAST) ہوتے ہیں جن کا کام کاربن ڈائی آکسائیڈ کو استعمال کرنے کے بعد آکسیجن کا اخراج ہوتا ہے۔

جس طرح دو جڑواں بھائیوں کو ہم شکل پانے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے کہ یہ دونوں بھائی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اس طرح تمام خلیوں کی بنیادی ساخت ایک سی ہونے کی وجہ سے یہی قوی امکان ہے کہ زندگی کی ابتداء ایک خلیے ہی سے ہوئی ہے۔ اور اب یہ سوچنا درست ہوگا کہ دور ارتقاء میں ایک خلیے سے مرکب خلیوں کے اجسام کیسے بنے۔ اس کا ثبوت آج بھی ایک خاص قسم کی کائی میں ملتا ہے جسے سلائیم مولڈ (SLIME MOULD) کہتے ہیں۔ اس کی زندگی کا آغاز ایک خلیے سے ہوتا ہے۔ یہ کئی خلیوں سے مل کر ایک جسم بنا لیتی ہے۔ اس کا ایک ننھا سا تنا بھی ہوتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد اس کے سرے پر پودوں جیسے بیج بھی نکل آتے ہیں اور جب یہ بیج ٹوٹ کر الگ ہوتے ہیں تو دوبارہ سلائیم مولڈ کی زندگی ایک خلیے سے شروع ہوتی ہے۔

جینیٹکس کے تذکرے کے دوران خود تبدیلی (MUTATION) کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ خود تبدیلیاں (MUTATION) بدلتے ہوئے ماحول میں لازمی تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زندگی کے آغاز سے لے کر دوبارہ نمودار نہ ہوتے۔ جب بھی دنیا پر ماضی میں ہلاکت آئی تو بعض زندہ اشیاء کے جینز نے خود بخود [illegible] MUTATION [illegible] کر [illegible] کی [illegible] بدلنے کے

قائم رہا لیا۔ اسی طرح زندگی جاری و ساری رہی۔ کرۂ ارض کے ماحول کو زندگی بخش بنانے میں
اس میں خود تبدیلی (MUTATION) کو بھی دخل رہا ہے۔ لیکن یہ دخل بہت کم سمجھا جاتا
ہے اور یہ تصور درست ہے۔ کہ زندگی کی نمو بغیر جنسی رشتے کے بھی ممکن ہے اور یہ نباتات میں
اور بیکٹریا میں پائی جاتی ہے لیکن زندگی کی یہ رفتار کسی جنسی رشتے کے بغیر ممکن ہو سکی ہے کیونکہ
اس طرح دو جدا زندہ اشیاء کے جینز اپنی ساری اطلاعات کے ساتھ اس ایک زندہ شے میں جمع
ہو جاتی ہیں جو اس جنسی رشتے کے بعد وجود میں آتا ہے۔

اربوں سال کے ارتقاء کے بعد نباتات اور حیوانات میں حیرت ناک تغیر آچکا ہے۔ اور کرۂ کے
ماحول میں زندگی کی ان شکلوں نے جس طور پر قرار پالیا ہے وہ بھی کچھ کم حیرت ناک نہیں۔
اس سرزمین پر ایسے بیکٹریا موجود ہیں جو کھولتے ہوئے پانی کے درجہ حرارت پر زندہ رہتے ہیں۔

اور کچھ ایسے بیکٹریا بھی ہیں جو برف سے بھی خشک ماحول میں اپنی نشوونما جاری رکھتے ہیں۔ بعض
ایسے کیڑے اس جہاں میں موجود ہیں جنہیں اگر پانی نہ مہیا کیا جائے تو وہ خشک ضرور ہو جاتے ہیں
اور یہی شبہ ہوتا ہے کہ ان میں جان نہیں رہی لیکن اس حالت میں اگر انہیں کھولتے ہوئے پانی یا
برف جیسے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا جائے تو اس کے بعد بھی وہ زندہ رہ جاتے ہیں۔ کائی کے بارے
میں قارئین کو علم ہوگا کہ یہ نم جگہوں پر اگتی ہے۔ لیکن اسپینش موس
(SPANISH MOSS) نام کی کائی بجلی کے تاروں پر پائی گئی ہے۔ جہاں وہ پانی ہوا سے
حاصل کرتی ہے۔

بعض چڑیاں ۲۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اڑتی ہوئی پائی گئی ہیں اور بعض مچھلیاں اپنی زندگی سمندر
کی تہہ میں کاٹ دیتی ہیں حالانکہ وہاں روشنی نہیں پہنچ سکتی اور فضا کا دباؤ اتنا ہوتا ہے کہ زندہ رہنے
کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زندہ اشیاء کے قد و قامت میں بھی بے انتہا تنوع پن ہے۔
بیورو نمونیاں نام کا بیکٹریا ایک مائیکرو میٹر کا صرف ایک دہائی ہوتا ہے۔ جسے صرف الیکٹرونک
مائیکرو اسکوپ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ایسے بھی درخت دنیا میں موجود ہیں جو تین سو فٹ لمبے
ہوتے ہیں۔

"ارتقاء" کراچی کے شکریے کے ساتھ

مطبوعات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

شاعری

نسخۂ ہائے وفا (کلیات)	فیض احمد فیض	۷۵/-
صبح دو نیم	افتخار عارف	۴۰/-
شوخیٔ تحریر (مزاحیہ کلام)	سید محمد جعفری	۷۵/-
غبار ناقوس	مظفر شکوہ	۳۰/-
مشاعل سطر	جمشید مسعود	۷۵/-
مشعل جاں	بلراج سلطانپوری	۸۰/-
سخن زار (منتخب فارسی اشعار مع اردو ترجمہ)	(ضیاء احمد مایونی)	۱۰۰/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز	۴۰/-
کمیشن	•	۶۰/-
سبھی رنگ کے سادن (۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کی تخلیقات کا مجموعہ)	صلاح الدین پرویز (زیر طبع)	
تازہ ہوا	باقر نقوی (انگریزی)	۵۰/-
غالب کی رہگزر (غالب کی زمینوں میں غزلیں)	واجد سحری	۳۵/-
سنہری آنچ	•	۳۰/-
جادۂ شوق	ماداکرشن گوپال	۶۰/-
دل خاک سر	شفق سوپوری	۵۰/-
صراط منزل	سید عاشور کاظمی	۶۰/-
آب حیاں	فرید پربتی	۱۵۰/-
نغمۂ حیات	ڈاکٹر سید رمانتھ بھنوت سرست مذہبی	
جدید اردو شاعری کا منتخب مجموعہ (انگریزی اردو) ترجمہ: بیدار بخت		۷۵/-
بلراج کومل کی منتخب نظموں کا مجموعہ (انگریزی اردو) ترجمہ: بیدار بخت		۴۰/-

سفرنامہ

سفر آشنا	گوپی چند نارنگ	۱۵/-
سرسید احمد خاں پہلے میں	اقبال کلی	۱۲۵/-

ناول اور افسانے

آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
گردش رنگ چمن	•	۱۷۵/-
چاند بی بیگم	•	۱۲۵/-
الم (یادیں)	ہرچرن چاولہ	۷۵/-
آتے جاتے موسموں کا سچ	•	۶۰/-
ناروے کے بہترین افسانے	•	۶۰/-
مار گوئی	سریندر پرکاش	۷۵/-
پہلی نسل کا گناہ	سعید صدیقی	۷۵/-
آئیڈینٹٹی کارڈ	صلاح الدین پرویز	۸۰/-
وہی قتل بھی کرے ہے	حیدر جعفری رضوی	۷۵/-
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آدھے چاند کی رات	•	۷۵/-
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری	۶۰/-
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/-
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶۰/-
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	•	۶۰/-
موج ہوا پیچاں	ساجد زیدی	۶/-
آخری آدمی	انتظار حسین	۹/-

Educational Publishing House

3108, Vakil Street, Dr. Mirza Ahmad Ali Marg, Lal Kuan, DELHI-110006

مطبوعات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

ادب و تنقید

تاریخ ادب اردو جلد اول — جمیل جالبی — ۳۰/-
جلد دوم (دو حصوں پر مشتمل) • ۳۰/-
ارسطو سے ایلیٹ تک (اضافہ شدہ ایڈیشن) • ۳۰/-
محمد قلی سیتر • ۹۰/-
ایلیٹ کے مضامین • ۷۵/-
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ • ۷۵/-
ادب کلچر اور مسائل • ۱۰۰/-
نئی تنقید • ۱۰۰/-
تنقید اور تجربہ • ۱۰۰/-
میراجی ایک مطالعہ • ۳۰/-
امیر خسرو کا ہندوی کلام مع لغت و برن
(دیرۂ اشپرنگر اضافہ شدہ ایڈیشن) گوپی چند نارنگ ۱۲/
ادبی تنقید اور اسلوبیات • ۱۲۰/-
انیس شناسی • ۵۰/-
اقبال کامل • ۷۵/-
اسلوبیات میر • ۳۵/-
سانگو کر بلا بطور شعری استعارہ • ۳۵/-
اقبال سب کے لئے — فرمان فتحپوری — ۱۵۰/-
اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے • ۹۰/-
شعر و حکمت دور دوم کتاب — مغنی تبسم و شہریار — ۱۵۰/-
ارمغان فاروقی — ظہیر احمد صدیقی — ۷۵/-
قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ — ڈاکٹر ارتضیٰ کریم — ۳۰/-
ابتدائی کلام اقبال — پروفیسر گیان چند جین — ۱۲۵/-
کھوج • ۱۲۰/-
پرکھ اور پہچان • ۱۲۵/-
ترقی پسند ادب
پچاس سالہ سفر — قمر رئیس و ماشور کاظمی — ۱۲۰/-

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی — [illegible] — ۳۰/-
آگہی کا سفر — پروفیسر وہاب اشرفی — ۲۰/-
تاریخ ادبیات عالم (جلد اول) • ۳۰/-
فکر اکبر الہ آبادی کی فکری سطحیت — حسین [illegible] — ۱۰/-
انقلاب و ادبیات
(مولوی امام بخش صہبائی) مرتبہ [illegible]
برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ
(حبیب [illegible]) ۱۵/-
رہ و رسم آشنائی • ۳۰/-
تناظر اور تجزیہ — ابوالخیر کشفی — ۹۰/-
علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی
(حافظ سید حامد جلالی) ۹۰/-
اردو میں طنزیہ سوانح نگاری کا ارتقا — [illegible] — ۱۰۰/-
ہندی ادب کی تاریخ (زیر طبع) پروفیسر قمر رئیس
اقدار و افکار — پروفیسر قمر رئیس (زیر طبع)

اسلامیات

ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت
عزیز احمد، جمیل جالبی ۱۲۰/-
ہند و پاک میں اسلامی کلچر • ۱۵۰/-
رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم — [illegible]
آخر اسلام ہی کیوں — عبدالاحد خاں (زیر طبع)
قالب اور تصوف — سید محمد [illegible] صابری ۷۰/-
آسان لغات القرآن — مولانا عبدالکریم پاریکھ ۱۲۰/-
معلم اعظم (سیرت النبی) منورہ نوری علیگ ۱۰۰/-

Educational Publishing House
3908, Ward Sheet, Dr. Ahmed Ali Marg, Lal Kuan, DELHI-110006

اقبال بھٹی [illegible]

"کہانی بگیا سے آڑی کو کیلا کی"

امی کہتی تھیں کہ سروجنی دیوی کا رنگ کم تھا لیکن چہرے پر ایسی موہنی نمک اور ملاحت تھی کہ نواب خاندان کی گوری چٹی بیگمات انھیں دبی نظروں میں چوری چوری بھر لیتیں ـــــ امی عمر میں سروجنی دیوی سے بہت چھوٹی تھیں لیکن ان کی جوانی کی قسم کھاتی تھیں۔

میرے تایا بیرسٹر اکبر علی خاں کے گھرانے سے سروجنی دیوی کے اس درجہ مشفقانہ تعلقات تھے کہ سروجنی نائیڈو کے اس التفات کو مادرانہ تعلق خاطر کہا گیا۔ تایا ابا کے گھر آتیں تو اپنائیت کا یہ حال کہ بیگم اکبر علی خاں سے کبھی یہ بھی پوچھ لیتیں کہ "بیٹا تو نے کیا کیا پکایا ہے ـــــ لے آ ـــــ بھوک لگی ہے مجھے ـــــ" اور وہ باورچی خانے کی طرف لپکتیں۔

بیرسٹر صاحب جو پہلے یوپی کے پھر اڑیسہ کے گورنر رہے ان کا کہنا ہے کہ اخلاص و محبت کے جذبات کی تشکیل و تجسیم کا نام سروجنی نائیڈو ہے۔ وہ انھیں ماں کہتے تھے ـــــ ایسی ماں جس نے اپنے بچوں کو شعور و آگہی کے راستے سجھائے ضرور لیکن جبراً متعین نہیں کیے ـــــ آزادی فکر و نظر پابجولاں نہیں ہوئی۔ وہ بلاشبہ جمہوریت کی علم بردار تھیں۔ ان کی بیٹی پدماجا نائیڈو کے ساتھی، رفیق کار، ہم نوا و ہم پیالہ بیرسٹر اکبر علی خاں، سروجنی نائیڈو کے بیٹے تو تھے [illegible] سیاست میں ایک ایسی بدلاؤ لیے ہوئے تھا جو تینوں میں مشترک تھی ـــــ سروجنی نائیڈو

میں کی پدماجا نائیڈو بھی [illegible]
محبت و شیرینی کی رنگینی کے معالجے لیکن [illegible]
اور اس اطلاق سے آیا تھا کہ شاہی کا سب گئی تھی۔ جمہوری انداز [illegible]
کرنے مسلمانوں کی اقلیت کے باوجود انہیں کے اقتدار کی [illegible]
جب سروجنی نائیڈو کے سامنے میں پہنچا تو سروجنی دیوی نے [illegible]
بیٹھیں کیں، سمجھایا، لیکن وہ چرب زبان بھی دماغ ـــــ سروجنی دیوی کی
ماتا میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا ـــ محبت کے رشتے اٹوٹ ہیں، سیاسی
راستے بالکل جدا۔ یہ جواں سال بہادر یار جنگ تھے۔ صدر اتحاد المسلمین
تقریر کرتے تھے تو زبان سے موتیاں جھڑتی تھیں۔ اپنی منہ بولی ماں سروجنی
نائیڈو کی فصاحت و بلاغت کے مداح تھے۔ بیرسٹر اکبر علی خاں کے عزیز ترین
دوست تھے ـــ پدماجا نائیڈو سے چھنتی تھی گویا قبیلہ و خاندان ایک ہی
تھا لیکن راستے اتنے مختلف تھے کہ ان دوستوں نے پشت کو پشت دکھا کر
زندگی کا سفر طے کیا۔

دارالسلام میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار بہادر یار جنگ نے کہا تھا کہ
"آج میرے منہ میں میری ماں جائی سروجنی نائیڈو کی زبان ہے"
یہ باعث افتخار، انداز اظہار، بہادر یار جنگ کا سروجنی نائیڈو کو خراج
عقیدت ہے۔ اب کتنے رہ گئے ہیں جو میدان سیاست میں اس عزت
نفس کی تکریم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں ـــ

سروجنی نائیڈو کی رنگا رنگ شخصیت کا میں نے ایک پہلو بتایا لیکن
اس اکہرے پہلو میں دیکھیے کہ کتنی تہہ داریاں ہیں۔ کبھی مکتبۂ خیال، کبھی

فکر، سیاست پر تعمیر کی کندیں نہیں پھینکیں۔ کسی آزاد روی کو زنجیر نہیں کیا۔ جس قدر تعمیر کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں، اٹھایا ـــــ پیار سے بھایا، پچکار کر، دلار سے بھایا۔ دسانے تو کیں کیں لیکن اپنے گھر کا دروازہ کبھی کسی پر بند نہیں کیا۔ اس کے لیے وہ مجبور نہیں تھیں ـــــ دل کا دروازہ کھلا رکھ کر گھر کے دروازے بند نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ پدماجا بھی ان کی اکبر علی خاں بھی ان کے جیسور نائیڈو بھی ان کے بہادر یار جنگ بھی انھیں کے۔

اسی رنگا رنگ شخصیت کا یہ پہلو بھی دیکھیے۔ اندازہ کیجیے کہ عمر کی کس منزل سے سروجنی نے ذات پات کے بندھن توڑ رکھے تھے۔

دردِ نِ خاد ہنگامے تھے کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر تھی

موقع محل سے شعر میں تھوڑا سا تصرف، زباں کا تقاضہ ہے کہ بات ماضی کی ہو رہی ہے۔

سروجنی دیوی اونچی ذات کی برہمن تھیں۔ یہ بات بیرسٹر صاحب نے بہت وثوق سے بتلائی اور نائیڈو کمتر درجے کی ایک کاسٹ ہے۔ چنانچہ سروجنی کے خاندان والے ناراض تھے کہ تم کمتر آدمی سے شادی کر رہی ہو۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں ذات پات اور اونچ نیچ جاننا نہیں چاہتی۔ ڈاکٹر جی آر نائیڈو مجھے پسند ہیں اور انھوں نے میری یہ شرط بھی بہت محبت سے مان لی ہے کہ وہ میری سیاسی و ثقافتی زندگی میں حائل نہیں ہوں گے ـــــ مجھے اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے۔" اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں انھوں نے شادی کر لی جب کہ وہ ۱۹ سال کی تھیں۔

مجلس جاگیرداران کی انتظامی کمیٹی میں بہادر یار جنگ اور اکبر علی خاں سر جوڑ کر بیٹھتے تھے ـــــ یہ یگانگت، یہ تعلق خاطر، یہ سیاسی اقدار سے انسانی قدروں کو تیز کرنے کا شعور دین تھی سروجنی نائیڈو کی، جن کے گھر کانگریس

مسلم لیگ جن سے بھی مکتبۂ خیال کے سیاست دان تھے سب نے
اپنے اذہان کو صیقل کرنے کی سبیل نکال لیتے۔ سروجنی نائیڈو کو
بڑے پیارے بھی پیش آئیں۔ صاف صاف دو ٹوک باتیں کرتیں
مبحث کا شکار نہ خود ہوتیں نہ کسی کو ہونے دیتیں ـــ فرماتیں اس لیے
مستزاد۔ انھوں نے کہا کہ میرا سیاسی شعور پدماجی کی رفاقت میں سروجنی
نائیڈو کی ودیعت ہے۔ میں نے کبھی انھیں غصے میں بحث و تکرار کر کے
مسائل کو سمجھنے، سمجھانے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا۔ سیاسی روش پر یہ طرز
یہ تحمل سروجنی نائیڈو کا ہی عطا کردہ ہے ـــ چنانچہ جب گاندھی جی کا
تعزیتی جلسہ میں نے نظام کالج گراؤنڈ پر منعقد کیا تھا تو میری گزارش پر
اکبر یار جنگ نے اس کی صدارت کی تھی۔ عثمان علی خاں کا یہ دور دراصل
قاسم رضوی کا دور تھا۔ لہٰذا قاسم رضوی آئے تقریر کرنی چاہی سائنک سنبھالا
اور وہی اپنی گھسی پٹی یک طرفہ سیاست کا پرچار شروع کر دیا ـــ میں نے
بہت انکسار سے ان کو سمجھانا چاہا کہ یہ جلسہ تعزیتی جلسہ ہے، آپ کی تقریر آپ
کا حق ہے لیکن یہ محل نہیں ہے۔ جلسہ ختم ہوا تو رضا کاروں نے میرا گھیراؤ کر لیا
اور مجھے پیٹا۔ کچھ دوسرے ہم خیال نوجوانوں نے بیچ بچاؤ کر کے مجھے اٹھایا اور
کار میں بٹھایا، نہیں سمجھیے کہ کھوس کر رکھ دیا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک میرے
گھر کے سامنے نعرے لگائے جاتے رہے ـــ غدار وطن ٹھہرایا جاتا، عقوبت
سے ڈرایا اور قتل کی دھمکیاں دی جاتیں۔ میں تو صبر کر کے بیٹھا رہتا لیکن
بیوی اور بچوں کی حالت پر ترس آتا مجھے ـــ یہ داستان کچھ اور طول ہے
اسے یہیں چھوڑتا ہوں ـــ بس اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا اسے حیدرآباد میں
قاسم رضوی کے دور نے مسلمانوں سے ان کی شرافت نفس بھی چھین لی اعتماد
و ایقان بھی۔

سروجنی نائیڈو نے حیدرآباد کی سیاست کے تیور سمجھ لیے تھے چونکہ

[illegible] ہندوستان بھر کی سیاسی زندگی کی دو عظیم شخصیتیں اور ان کے
[illegible] وقت نہیں تھا سو انھوں نے نئے موقع
[illegible] کی آمیزش کر دی اور قومی یکجہتی کے لیے ایک [illegible]
[illegible] کر دیا جس کی شعاعوں نے کئی اذہان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔
پہلا نائیڈو، بی رام کشن راؤ، اکبر علی خاں، ہرنگ راؤ، جے سوریہ نائیڈو، کاشی ناتھ
ویدیہ، راما چاری اور پھر احمد علی خاں ——— اس ٹیم نے پہلا نائیڈو کی رفاقت
میں سروجنی نائیڈو کے بیٹے کی ہمیشہ آبیاری کی جس کا نام حیدرآباد ہے۔
وہ زمانے اور تھے جب مسلمان نوجوانوں سے لے کر ضعیفوں کے لبوں پر بھی
حیدرآباد کے شاہ عثمان علی خاں کا یہ شعر ورد کی صورت اختیار کر گیا تھا کہ

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

کو بہادر یار جنگ نے ضلع ورنگل میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مسلمانو!
عثمان علی خاں سے تم نہیں ہو، تم سے عثمان علی خاں ہیں۔" حضور والا کو یہ بات بہت
ناگوار ہوئی تھی۔ انھوں نے غیظ میں آ کر کہا تھا کہ "سروجنی کو ہم نے اعلیٰ تعلیم کے
لیے انگلستان بھیجا تھا اور ڈاکٹر نائیڈو ہماری ہی سرکار سے وابستہ رہے ———
اس "ہم" میں گویا اپنے والد محبوب علی خاں کی عنایات کا ذکر ہے۔ بہادر یار جنگ
خود کو سروجنی نائیڈو کا منہ بولا بیٹا بولتا ہے اور ہمارے ہی خلاف زہر اگلتا ہے
اور دیکھو تو ایک بیٹا بنا پھرتا ہے۔ اکبر علی خاں، جمہوریت کا علم بردار ——— اسے
حاضر کیا جائے ——— طلبی ہوئی ——— اکبر علی خاں پہنچے۔
ارشاد ہوا کہ "ہم نے سنا تھا کہ تم میں اور بہادر یار جنگ میں ٹھن گئی ہے اور
تم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے ہو ——— ہم نے سوچا سروجنی کے
ان بیٹوں سے ذرا بات تو کریں۔"
اکبر علی خاں نے دست بستہ عرض کیا کہ "حضور! جس شخصیت کا آپ نے میری

[illegible] سے [illegible] ہے۔ میں [illegible] سے [illegible]
[illegible] نفرت ہی کا [illegible] جس [illegible] کے پاس [illegible]
تھیں سیاسی و نظریاتی اختلافات کا [illegible] — انس و انسانیت کے [illegible]
جذبے کے آگے کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ تف ہے اس کی اولاد و ذریت پر اگر وہ
آپس میں نفرت کرے — ہے سوریا تیلو جوں کہ بہادر یار جنگ کہ اکبر علی
خاں، ہم آج بھی بھائی بھائی ہیں — سیاست میں بہادر یار جنگ سے میرے
نظریاتی اختلافات ہیں اور رہیں گے لیکن ہم دوست ہیں اور رہیں گے۔"

شاہ نے ورنگل کی تقریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہارا بھائی تو ہماری
ہی جڑیں کاٹنے کے درپے ہے۔ اس کو سمجھا دو۔"

اکبر علی خاں نے دست بستہ پھر عرض کی کہ "حضور! یہ تو مسلمانوں کو شاہ
سے قریب لانے ہی کا ایک طریقہ ہے کہ ان کے دل میں یہ احساس پیدا کیا جائے
کہ وہ شاہ عثمان ایک روح دو قالب ہیں — یوں سمجھیے کہ تو من شدم من
تو شدی والی بات ہے — ورنہ وہ تو آپ کا ہی خواہ ہے، آپ کا وفادار
ہے میں اور اس میں اختلاف یہی ہے کہ وہ آپ کو صرف مسلمانوں کا بادشاہ
سمجھتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ آپ نے ہر جگہ علی الاطلاق، بارہا یہی فرمایا ہے کہ
ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں — ایسے میں حضور والا جب میری ماں کی
طرف سے سیاست درمیان میں آتی ہے اور نہ ہی میرے شاہ کی طرف سے تو
میں بہادر یار جنگ سے کس طرح نفرت کر سکتا ہوں۔"

شاہ کے دل میں کیا تھا یہ تو وہی جانیں یا پھر ان کی شاہی — وقتیہ
خوشنودی کا اظہار کیا اور اکبر علی خاں لوٹ آئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن کچھ ہی عرصے بعد گھروں کی چار دیواریوں سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی
سسکتی آوازیں ڈھونک پر زمانے تک حیدرآباد کے لوگوں نے سنیں۔

دیے حقے پہ دم بہادر جنگ — گئے ملک عدم بہادر جنگ

سروجنی شاہ عثمان ہیں جن کے بارے میں بعد نوں بعد کمیونسٹ پارٹی
کا دور دورہ کے زمانے میں ایک دوسرے نے اپنا سر تھیلی پر رکھ کر زبان
صاف اور واضح الفاظ میں نعرۂ مستانہ لگایا تھا — اور — یہ تھے
مخدوم محی الدین۔

بنا رہا ہے نئی اک سحر تلنگانہ
بڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک بار تایا آبا بیرسٹر اکبر علی خاں نے اس بات
کا اعتراف کیا کہ سروجنی دیوی نے اپنے نزدیک یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی بھی
حیدرآباد کی سیاست میں خود کو ملوث نہیں کریں گی — وہ کہتی تھیں کہ
"جمہوریت میرا ایقان بھی ہے میرا ایمان بھی اور ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد کی
تہذیب سے، حیدرآباد کی فضاؤں سے اور حیدرآباد کے در و دیوار سے مجھے
پیار ہے۔ یہاں کی اچھی بری سیاست میں شخصی طور پر دخیل ہونا نہیں چاہتی
کہ مجھے اپنے ہی گھر میں کسی ایک کا ہو کر رہ جانا اور کسی ایک سے منہ پھیر لینا اتنا
آسان نہیں لگتا — میں نے راستے سجھا دیئے ہیں، اب یہ کام تم لوگوں پر
چھوڑتی ہوں کہ دھیرج سے، نرمی سے، بغیر کسی اُلجھاؤ، ٹکراؤ اور جھگڑے کے
جمہوریت کا بول بالا کریں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آصفِ سابع شاہ عثمان کے پاس
سے سروجنی نائیڈو کے پاس بھی کبھی کبھی خاصہ بھجوایا جاتا تھا۔ یہ خاصہ بھی اپنی
اُن شاہی خصوصیات کی بنا پر جو آصف سابع کے نام سے مختص تھیں مضحکات
کے کئی ڈھکے چھپے پہلو رکھتا ہے۔

بڑے سے خوان پر زرین خوان پوش اندر ایک پلیٹ میں کسی
موسمی میوے کا ایک دانہ مثال کے طور پر، یوں سمجھیے کہ ایک عدد آم یا ایک عدد

فوں کے بے حد چہیتے۔ بیرسٹر صاحب بیلا منی سے ایک دن پہلے وہ سب
یستر مہمان پرزیان آشنا لڑکوں سے انصاف کرتیں۔ یہ کا نگرت، یہ رقص
س، یہ مدارات، اس خاندان کا مزاج بن گئی تھی۔

پدما جا نائیڈو نے شادی نہیں کی۔ عظیم ماں کی بڑی بیٹی۔ لوگ جب قوم کا
بن جاتے ہیں تو ان کی نجی زندگی بھی اتنی نجی نہیں رہ جاتی۔ لوگ غلو تو
ں کر آتے ہیں ـــــ اور اتنے خلوص سے غلو تی بن جاتی ہیں کہ ان کے جذبہ
سا پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی ـــــ پدما جا نائیڈو اور سالار جنگ میں لگاوٹ
اور اس لگاوٹ نے شاید محبت کی منزلیں اس درجہ طے کر لی تھیں کہ جب
میاں ہاتھ لگیں تو نہ پدما جانے کسی سے شادی کی اور نہ سالار یار جنگ نے
ں یہ بات کہ ان دونوں کو ان کے اپنے سہروں کے پھول پرونے والے
ں نہیں ملے کہ حیدرآباد تو بس محبتوں کا شہر تھا ـــــ سو بات اتنی گمبھیر
ں، صاف ہے۔

پدما جا نائیڈو کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کی طرح
ب ایک ہی ذات کو جانتی تھیں، ایک ہی ذات کی پوجا کرتی تھیں، عبادت
ق تھیں اور وہ ذات تھی انسانیت اور اس کے اوتار تھے انسان ـــــ
رجنگ کو ان کی جاگیرداری، شاہ کی پاس داری اور حکومت کے لاتعداد
انعات نے اس دشت میں آبلہ پائی کی توثیق نہیں دی ہوگی ـــــ وہ
تھے جنھوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں۔

حیدرآباد سے دور دور رہ کر بھی حیدرآباد کی روح بنی رہنے والی سروجنی
یڈو نے جب وہ یو پی کی گورنر تھیں، ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر پولیس
ن کے بعد تاسف سے یہ کہا کہ "مجھے افسوس ہے کہ آج میرا حیدرآباد ہار گیا"
سردار پٹیل نے سروجنی نائیڈو کے سیکولر ذہن پر وار کیا اور اس افسوس
وازمانگا۔

[illegible] میرے سیکولرزم کی تقریر جو یہاں سے وہاں
[illegible] میری زندگی ہے تو میں اسکی اجازت نہیں کر سکتا ـــــ دنیا
جانتی ہے کہ میں نہ صرف سیکولرزم کی حامی ہوں بلکہ گاندھی جی کی بھگت بھی
ہوں۔ ان گاندھی کی جنھوں نے انگریز جیسی قوت کو اہنسا کے بل بوتے پر
ہندوستان سے کوڑے کرکٹ کی طرح نکال پھینکا ـــــ حیدرآباد تو بہت
ہی چھوٹی سی چیز ہے ـــــ وہ میرا باغ بھی نہیں بغیچہ ہے۔ لیکن میں کہہ سکتی
ہے کہ فوجی کارروائی نے میرے حیدرآباد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ـــــ
پولیس کارروائی کی جو باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں انھوں نے مجھے یہ سوچنے
پر مجبور کر دیا ہے کہ میں کس منہ سے حیدرآباد جا کر اپنے بچوں کا سامنا کروں گی
اگر میرے یہ جذبات میری سرکار کو گراں گزرتے ہوں تو گورنری سے میرا
استعفیٰ حاضر ہے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے پولیس کارروائی کی جب
تک سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن ایک مجذوب کی بڑ نے جس کا نام قاسم
رضوی تھا اور جو ہذیان بکنے پر آجاتا تو کہتا تھا کہ:

"مسلمانو! میں دیکھ رہا ہوں کہ پرچم آصفی لال قلعہ پر لہرا رہا ہے۔"

اس دیوانے کی بڑ نے سردار پٹیل کے غصے کو مہمیز لگائی اور اس طرح ایک
ہذیان اور ایک غیظ نے حیدرآباد کی اس داستانِ پارینہ کو خونچکاں کر کے
رکھ دیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کس دفتر کی کن الماری میں یہ باتیں محفوظ ہیں کہ نہیں
ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ چند سینوں میں آج بھی وہ دل دھڑکتے
ہیں جن میں یہ راز ہائے سربستہ دفن ہیں اور انھیں سینوں میں میرے تایا
[illegible] سر اکبر علی خاں کا بھی سینہ ہے ـــــ یہ وہی اکبر علی خاں ہیں جنھیں
[illegible] کی گورنری دی گئی تو انھوں نے آنجہانی اندرا گاندھی کے اصرار پر اسے

امرود یا پھر بادام کی لذیذ طشتری کا ایک حصہ [illegible] چاندی کے تھوڑی کی طرح ـــــ گویا بے شاہ [illegible] تناول کے وقت آپ یاد آئے ـــــ اب اس یاد کی [illegible] جو بھی آتا بسر و چشم آپ اس کو قبول فرماتے اور ایک اشرفی خالی [illegible] میں رکھ دیتے ـــــ وہ تھا آپ کا یادانہ ـــــ اور یہ تھا آپ کا [illegible] نعمت سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ تھوڑا سا شوربہ، اس میں دو بوٹیاں ـــــ ایک روغنی روٹی یا میٹھی سوندھی کھیر کی مٹکی [illegible] کھیر کی مٹکی ہو تو چاندی کا ورق لازم ہوا ـــــ وہی تصور کی طرح۔

پدماجا نائیڈو ہوں کہ لیلامنی نائیڈو، دونوں ہی اپنی ماں کی طرح اسی خمیر سے اٹھی تھیں جسے انس و انسانیت کی عظمتوں نے گوندھا تھا ـــــ سروجنی نائیڈو کی اس تقریر کے اقتباسات ان پر لکھے گئے مضامین میں اکثر مل جاتے ہیں۔ اس اقتباس سے جو ان کا اعتراف ہے انھیں آئینے میں نہیں ان کی روح میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کبھی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ـــــ

"میں نے بہت سفر کیا ہے بہت دنیا دیکھی ہے سوچا اور سمجھا ہے، امید و بیم کی منزلوں سے گزری ہوں، محبت کی دنیا کو وسیع بنایا ہے اور ہمدردیوں کے سمندر کو اتھاہ ـــــ مختلف فرقوں، مذہبوں، نسلوں اور تہذیبوں کے لوگوں سے ملی ہوں۔ اس لیے میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میرے ذہن میں اصل فرقہ ذات یا رنگ کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔"

لیلامنی نائیڈو حیدرآباد کے ایک کالج میں لکچرار تھیں۔ یہاں سے [illegible] مرس منسٹری میں پی ایس سکریٹری ہو کر چلی گئیں ـــــ وہ ویسٹرن کورٹ میں [illegible] تھیں۔ بیرسٹر اکبر علی خاں بھی ویسٹرن کورٹ ہی میں مقیم تھے۔ جب بھی حیدرآباد

ملکیا — اور جب قبول کرو تو کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں اس اسٹیٹ کا گورنر بنایا جا رہا ہوں جہاں میری ماں گورنر تھیں — اس طرح میری ذمہ داریاں انسانی اور روحانی دونوں لحاظ سے بہت بڑھ جاتی ہیں — میرا خدا میری مدد کرے کہ میں اپنی ماں کے نقش قدم پر چل سکوں۔"

سروجنی نائیڈو نے یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو اس ڈرامائی انداز سے اس بھری دنیا سے آنکھیں پھیر لیں جیسے کوئی زندگی کا مذاق اڑاتا ہے۔

تیرہ سال کی عمر میں انگلستان جانے سے قبل ۱۳ سولائنس کی LADY OF THE LAKE جیسی طویل نظم لکھنے والی یہ ذہین اور باشعور لڑکی سولہ سال کی عمر میں مسز اینی بیسنٹ کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلی گئی۔ اس طرح ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک تین سال انگلستان میں گزارنے کے بعد وہ اپنے وطن حیدرآباد لوٹ آئی اور اسی سال دسمبر میں خاندانی رکاوٹوں کو پس پشت ڈال کر اپنی شادی رچالی۔

زندگی کے ساتھ اس طرح آن بان کا سلوک کم ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے کہ وہ قوم اور وطن کا ورثہ بن کر امر ہو جائے۔

بستر مرگ پر نرس سے گیت سنتے سنتے اس کو گواہ رکھ کر یہ کہنا کہ اب میں کسی سے نہ بولوں گی اور پھر کسی سے نہ بولنا، ہندستان کی اس بلبل کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس نے ۴۴ سال کے بعد بھی اپنی آواز کی ہوک کو ان سبھوں کے سینوں میں بسا رکھا ہے جنھوں نے کبھی اس کی چہکار سنی تھی۔

گولڈن تھرشولڈ جیسی نفیس عمارت، جو قلب شہر میں واقع ہے اور جہاں سروجنی نائیڈو مالکن بن کر رہتی تھیں — جہاں پدماجا نائیڈو، لیلامنی نائیڈو، راجن اور جے سوریہ نائیڈو نے ڈاکٹر جی آر نائیڈو کے سایۂ عاطفت میں بچپن گزارا تھا، اسی عمارت کو، اس میں بسی بسی یادوں سمیت پدماجا نائیڈو نے حیدرآباد یونی ورسٹی کے لیے گورنمنٹ کو تحفۃً نذر کر دیا — اس طرح اس

خاندان کا کوئی نشان حیدرآباد میں نہیں [illegible]

جب بیرسٹر اکبر علی خاں نے ڈاکٹر چنا ریڈی [illegible]
زمانے میں خواہش کی کہ سروجنی نائیڈو کی یاد [illegible] کے نام سے سنٹر
کھولا جانا چاہیے تو چنا ریڈی نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس [illegible]
خریدنے کے فوری احکام جاری کر دیئے۔ چنانچہ دفتر [illegible]
ایک عمارت ۹ یا ۱۰ لاکھ روپے میں خریدی گئی اور ایک لاکھ [illegible]
کا کرنٹ اکاؤنٹ میں ڈاکٹر چنا ریڈی نے جاری کر دیا۔ بیرسٹر اکبر علی خاں کو
اس سنٹر کا چیرمین بنایا گیا۔ آنجناب اعزازی سکریٹری ہوئے اور راج کرن آئی۔
اے۔ ایس اس کے تنخواہ دار سکریٹری۔ اس حسنِ اتفاق کا کیا کہنا کہ مابعد یہ بات ثبوت
کو پہنچی کہ سروجنی نائیڈو اسی گھر میں پیدا ہوئی تھیں جس کو ان کے والد گرو ناتھ
چٹو پادھیائے نے کرائے پر لے رکھا تھا اور جہاں آج سروجنی نائیڈو کلچرل سنٹر
قائم ہے۔ سکندر علی وجد نے کہا تھا: ؎

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

(ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ کے زیر اہتمام سروجنی نائیڈو
کل ہند سے می نار میں ۳۰ جون ۱۹۹۰ء کو چنڈی گڑھ میں
پڑھا گیا)

پانچویں قسط

بلراج ساہنی

امریکہ کا دوسرا سفر

کنول نین پرواز (چیکر)

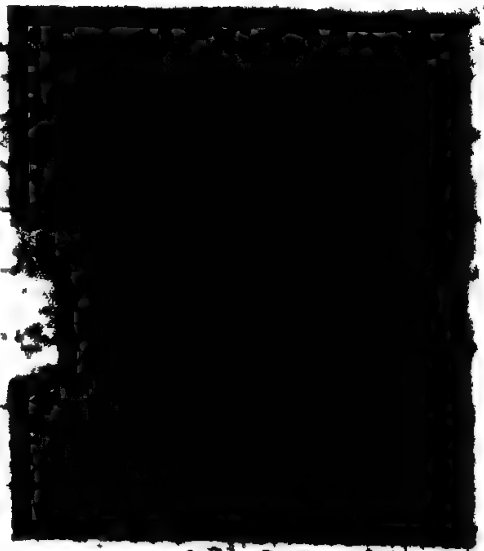

بلراج ساہنی اور متوش ساہنی

۱۹۵۰ء — اپریل کے پہلے ہفتے میں میں پھر بمبئی میں تھا۔ راستے میں دہلی کے روزنامے ترقی پسند ماہنامہ "شاہراہ" میں میرا پہلا رپورتاژ چھپنے کے بعد اس کے مدیر پرکاش پنڈت نے جو میری حوصلہ افزائی کی تھی اس کے پیش نظر اُن سے ملنا ضروری تھا۔

بلراج ساہنی کے بھانجے اشوک کشیپ بھی اس وقت دہلی ہی میں تھے بلراج جی کے بارے میں انھوں نے جو خبریں دیں وہ سن کر میرا دل بہت پریشان ہو رہا تھا۔

سرینگر سے روانہ ہونے سے پہلے یہ خبر تو مل ہی چکی تھی کہ ان کی گرفتاری کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے انھیں خارج کر دیا گیا تھا لیکن بمبئی میں ایک اور افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی۔ عوامی تھیٹر کے کئی کارکن جو اپنے ترقی پسند سیاسی خیالات کی وجہ سے گرفتار ہوئے تھے، اُن میں سے اکثر جیل ہی میں تھے لیکن بلراج جی کو تھوڑے عرصے میں ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ ادبی حلقوں اور عوامی تھیٹر میں ہلچل بھی ہوئی تھی۔ چترنجن چوپڑہ نے بتایا کہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی جسونت ناتھ

جو خود بڑے اچھے افسانہ نگار تھے انھوں نے اس سلسلے میں ایک افسانہ بھی لکھا تھا "غدار" جو کسی رسالے میں چھپا تھا۔ اس کا کچھ ہی سال بعد اچانک ہی گرفتاری اور پھر ان کی رہائی پر منتج تھا۔ افواہ یہ تھی کہ اپنی ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے خاص طور پر نئی بچی کی پیدائش کے بعد انھوں نے حکام کو اس بات کی ضمانت دی کہ وہ رہا ہونے پر ترقی پسند تحریکوں میں خاص طور پر سیاسی تحریکوں میں حصہ نہیں لیں گے۔

میرا دل یہ سب کچھ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ افواہیں اس شخص کے بارے میں تھیں جس نے اب تک زندگی کے ہر دور میں اور ہر قدم پر نہ صرف انسان دوستی کا ثبوت دیا تھا بلکہ انسانیت کا یہ متوالا ہر اس لڑائی کے لیے آمادہ تھا، جس سے عوام کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ وہ نہ صرف سیاسی نظام بلکہ سماجی امتیاز کے خلاف بھی بغاوت کر چکے تھے۔

سنا تھا وہ آج کل اکثر گھر پر ہی ہوتے ہیں۔

ایک روز صبح ہی صبح میں جو ہو پہنچ گیا۔

گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ گھر کے برآمدے میں پہنچ کر جب میں نے "ہیلو، ہیلو، کوئی ہے" کا نعرہ لگایا تو ایک خاتون نے کمرے سے باہر آکر میرا خیر مقدم کیا۔ طویل قامت، لمبے لمبے سیاہ بال، گندمی رنگ، آپ ساڑی میں ملبوس تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سنتوش جی ہیں۔ انھوں نے میرے ذہن کو زیادہ الجھن میں نہیں رکھا فوراً بولیں "آپ کنول جی ہیں؟ آپ کی تصویر میں نے دیکھی ہے۔ میں سنتوش ساہنی ہوں۔"

"ساہنی" کے لفظ پر انھوں نے قدرے زور دیا۔

مجھے قریب کے کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بولیں "بلراج جی کی طبیعت روز سے ناساز ہے، وہ کمرے میں آرام کر رہے ہیں، تھوڑی دیر میں [illegible]

انھوں نے اندر سے شاید گفت و شنید سن لی تھی۔ باہر آنے کی دعوت ان میں ہمت نہیں تھی، وہیں سے اونچی آواز میں بولے "توشی! انھیں اندر آنے دو، میں ٹھیک ہوں، چلنے کا انتظام بھی ہو جائے، پلیز۔"

توشی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "لگتا ہے آپ کی آواز سن کر ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے، آپ امریکہ سے حال ہی میں آئے ہیں، وہ اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔"

کمرے میں قدرے اندھیرا تھا۔ وہ بستر سے اٹھے نہیں، لیٹے لیٹے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بڑی ہی ہلکی آواز میں بولے "سرینگر سے کب آئے تم، دوستوں کا کیا حال ہے، کشمیر کا کیا حال ہے، وہاں کے سیاسی حالات بھی کافی بدل رہے ہیں۔"

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی بلراج ساہنی ہیں جنھیں میں نے پہلی بار سوگر اور پھر عوامی تھیٹر اور پھر اکثر جو ہو بینچ اور کئی بار ان کے گھر پر دیکھ چکا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کے کس سوال کا جواب پہلے دوں۔ وہ اچانک خاموش ہو گئے تھے۔ نظریں جیسے چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سامنے ایک جنگ کا منظر ہے اور لڑائی ختم ہو گئی ہے اور انسانیت کی شکست ہو چکی ہے، انقلاب ناکام ہو گیا ہے اور بغاوت کا پرچم زمین پر بکھرا پڑا ہے۔

اتنے میں سنتوش چائے لے کر اندر آئیں، وہ بولیں "آپ اس اندھیرے میں یہاں کنول جی کو لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، باہر برآمدے میں آئیے۔"

"تو آپ کا تعارف ہو چکا ہے۔" ان کے چہرے پر جیسے مسکراہٹ دبے دبے قدم رکھ رہی تھی "چلو کنول، توشی کہتی ہیں تو برآمدے میں ہی چلتے ہیں۔"

برآمدے میں چائے پر بیٹھتے ہوئے میں نے انھیں بتایا کہ کشمیر کی ترقی پسند تحریک اب عروج پر ہے، ریڈیو اسٹیشن کے قائم ہونے سے ادیبوں اور فنکاروں کے لیے اور بھی لکھنے کے وسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں دوبارہ

امریکہ جا رہا ہوں اور میرا جہاز "ڈیڑھ" ہفتے میں لندن کے لیے روانہ ہو رہا ہے تو انھوں نے بڑے اشتیاق سے میری طرف دیکھ کر کہا "لندن ـــــ بڑے خوش قسمت ہو یار!"

اب ان کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جس کا میں کب سے منتظر تھا۔

ان کی آواز میں جیسے ایک نئی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ جب توشی اندر سے باہر باہر آئیں تو بڑے جوش سے بولے "آپ سن رہی ہیں یہ امریکہ لندن ہو کر جا رہے ہیں۔ لندن میں میرے دو بڑے اچھے دوست ہیں۔ بی بی سی کے پریم بخشی اور سرین صاحب، توشی بھی جب لندن تھیں تو بی بی سی میں جایا کرتی تھیں وہ بھی ان سے واقف ہیں۔

توشی نے چائے کا کپ منہ سے لگا کر محض سر ہلانے تک ہی اکتفا کی۔

بلراج جی بولے "توشی! پلیز اندر سے ذرا کاغذ قلم لا دو، میں سرین صاحب کے لیے کنول کو ایک خط لکھ دیتا ہوں، تم ان سے ضرور ملنا، یہ دونوں تمھیں بی بی سی کے بش ہاؤس میں مل جائیں گے، پریم بخشی کا تو اکثر وقت بش ہاؤس کی کینٹین ہی میں گزرتا ہے یا بی بی سی کے کلب کے بار میں، پٹھا پورا پشاوری ہے پٹھان کا پٹھان، بہت پیارا آدمی ہے۔"

بلراج جی کی اس نئی توانائی کو دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔

توشی اندر کاغذ قلم لینے گئیں تو وہ بولے "اس بیکاری کے زمانے میں اگر توشی میرے ساتھ نہ ہوتیں تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا، بڑی محبت والی خاتون ہیں۔"

مئی ۱۹۵۰ء میں میرا جہاز اٹلی کے لیے روانہ ہوا۔ میں جہاز سے اٹلی میں نیپلز کی بندرگاہ پر ہی اتر گیا۔ ایک رات نیپلز کی سیر کی۔ راستے میں ایک رات کے لیے روم رکا، پھر جنیوا میں دو تین روز گزارنے کے بعد پیرس کے راستے لندن پہنچا۔ لندن میں اس وقت کسی سے جان پہچان نہیں تھی۔ سنا تھا کشمیر میں کالج

کے پرانے ایک دوست انڈین ہائی کمیشن میں کام کرتے ہیں۔ یہاں سے ایک ہفتے میں میرا جہاز نیویارک کے لیے روانہ ہو رہا تھا اس لیے میرے پاس یہاں گھومنے کے لیے خاصا وقت تھا۔ انڈین ہائی کمیشن میں پتہ چلا کہ وہ اب کسی اور دفتر میں کام کرتے ہیں۔ انڈین ہائی کمیشن اور کنٹرول ہاؤس (بی بی سی) کی عمارتیں ایک دوسرے کے ساتھ لگتی ہیں۔ میں نے سوچا چلو سرین صاحب اور پریم بخشی کو ڈھونڈا جائے۔

خوش قسمتی سے سرین صاحب اپنے دفتر میں ہی تھے۔ بھاری بھرکم جسم، دھیمے لہجے میں بولتے ہیں، میرا استقبال کیا۔ میں نے بلراج جی کا خط انھیں دیا۔ ان کے چہرے پر ایکدم سے رونق پیدا ہو گئی۔ خط کھولتے ہوئے بولے "کیا حال ہے ان کا۔ ان کے بارے میں کئی پریشان کن خبریں ہم تک پہنچی ہیں!"

اور پھر وہ خط پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ خط میں پریم بخشی کا ذکر کیا کہنے لگے "وہ اس وقت بی بی سی کی کینٹین میں ہوں گے ورنہ قریب ہی بی بی سی کے بار میں ـــــ چلو پہلے کینٹین چلتے ہیں، چائے کا ایک آدھ کپ ہو جائے۔"

ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ کمرے میں ایک صاحب داخل ہوئے "ارے سرین دوست رات بھر نیند نہیں آئی، معلوم نہیں آج کا پروگرام کیسے ہوگا۔"

یہ پریم بخشی تھے۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، طویل قد، گٹھا ہوا جسم، کلارک گیبل کی سی مونچھیں ـــــ واقعی ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

سرین صاحب نے میرا تعارف کرایا اور میرا خط بھی انھیں دیا۔ وہ خط لیتے ہوئے انھوں نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے "کیا حال ہے میرے یار کا!"

ان کے بولنے میں پشاوری زبان جیسے ان کی اردو میں گھل مل گئی ہو۔ ان کے وجود سے شمال مغربی سرحدی صوبے کے جغرافیے کا احساس تو ہوتا ہی تھا لیکن ان کی زبان سے ایک ایسی محبت اور خلوص ٹپک رہا تھا جو پشاوریوں کا خاص حصہ ہے۔

جب سرین صاحب نے کینٹین میں چائے کی دعوت دی تو قہقہہ لگا کر بولے "پہلے چائے کی باتی ہے، یہ تو بار میں جانے کا وقت ہے، کیوں پرواز صاحب، ایک

کا اس بیئر کا ہو جائے؟"

سرین صاحب ہنس کر بولے "رات بھر سوئے نہیں لیکن شراب ان کے [illegible] سے اترنے کی نہیں۔"

بار میں وہ کہہ رہے تھے "بلراج ساہنی یاروں کے یار ہیں، خدا نے ریڈیو کے لیے اتنی خوب صورت اور پیاری آواز تو دی ہی لیکن ان کے لطیفے اور [illegible] کی کینٹین اور بار کی زندگی کا ایک اہم جزو تھے۔"

سرین صاحب بولے "دمینتی ساہنی بھی اس سلسلے میں ان سے کم نہیں تھیں۔"

بخشی صاحب نے پھر سنتوش ساہنی کا ذکر کیا "وہ بھی تو ایک بڑی اچھی ادیبہ اور براڈ کاسٹر ہیں۔ جناب نے دوسری شادی کر لی اور ہمیں دعوت نامہ بھی نہیں بھیجا۔"

میں نے انھیں بتایا کہ ان کی شادی کے حالات بڑے غیر معمولی سے تھے ہر طرف پریشانی تھی۔

جہاں تک میرے لیے بی بی سی کے لیے کوئی پروگرام لکھنے کا سوال تھا انھوں نے معذرت چاہی "ہمارے پروگرام پہلے سے ہی ریکارڈ ہو جاتے ہیں، لگتا ہے آپ کے پاس وقت کم ہے؟"

میں نے انھیں بتایا کہ چند مہینوں میں واپسی پر لندن ایک مہینہ ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے، پہنچنے سے پہلے تم ایک خط ڈال دینا، آپ اپنے بیرونی ملکوں کے تاثرات کے بارے میں ایک مضمون لکھ ڈالنا، ہم ضرور اسے براڈ کاسٹ کریں گے۔ اس میں آپ ضرور بلراج ساہنی سے اپنے رابطے کا ذکر بھی کریں۔"

۱۹۵۱ء، فروری کے آخر میں ہندستان لوٹتے ہوئے اگرچہ میرے پاس ایک مہینے کا وقفہ تھا لیکن زیادہ وقت کاروبار کے سلسلے میں ہالینڈ، بلجیم اور فرانس میں

میں صرف ہوا۔ لندن میں صرف دس دن کا پروگرام تھا۔ سرین صاحب اور پریم بھٹی سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔

امریکہ کی اس سیاحت کے دوران بلراج جی میرے خط کا جواب دیا تھا۔ اب انھیں فلموں میں کام مل رہا تھا۔ سرحدی کی بنائی ہوئی فلم "ہم لوگ" ریلیز ہونے والی تھی اور اس کی کامیابی سے ان کی کئی امیدیں اور خواب وابستہ تھے۔

خط میں اس بات کا بھی تذکرہ تھا کہ حال ہی میں ان کی منجھلی بھانجی پربھا کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے بیٹا رگھوناتھ کا نام میں نے سن رکھا تھا، وہ سرکاری ماہنامہ "آج کل" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔

خط میں انھوں نے پہلی بار کھل کر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ مجھے اپنے رشتہ داروں کے دائرے میں لانے کے متمنی تھے لیکن ـــــ قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

میں نے انھیں اپنے خط میں اس بات کا یقین دلایا کہ انھیں اس سلسلے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، یہ رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی وہ میرے عزیز دوستوں کی فہرست میں اول درجہ پر ہیں۔ آنے والے دنوں میں میں صرف ان سے قریبی رابطہ بلکہ رہبری کا محتاج بھی رہوں گا۔

واپسی میں لندن سے ہالینڈ جاتے ہوئے ایک ڈچ نوجوان سے ملاقات ہوئی جس نے پچھلی بڑی لڑائی میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی قربانی کے ساتھ ساتھ اپنی ایک ٹانگ کی بھی قربانی دی تھی۔ ہٹلر کے فاشزم کے خلاف ان لوگوں نے ان گنت قربانیاں دیں۔ ہٹلر کی شکست تو ہوئی لیکن اس کی پہنچائی ہوئی تباہی کے آثار ہالینڈ کے ہر شہر میں ابھی تک نمایاں تھے۔

ہندستان لوٹنے پر بلراج جی کی پہلی ملاقات میں، ان کے سوال میں کہ کوریا کی لڑائی کی وجہ سے دنیا میں جنگ ہوئی یا نہیں؟ میں نے اس نوجوان سے ملاقات کا قصہ سنایا تو وہ کہنے لگے "جنگ کرنے یا نہ کرنے کا اصل اختیار عوام کے ہاتھ

میں ہوتا ہے، مگر ان کتنے ہی جنگ کرنے کے لیے پریشان کیوں نہ ہوں
ہوئی ترقی پسند تحریکیں ـــــ ان کے ہاتھ دھونے میں اکثر کامیاب ہوئی
کی خاطر کے نام سے تم جو اس نوجوان کے بارے میں رپورتاژ لکھ رہے ہو، ہمیں
ادب اور فن کو ایسی تخلیقوں کی بے حد ضرورت ہے۔"

امریکہ روانہ ہونے سے پہلے میں نے جن افسردہ حال اور شکستہ دل بلراج
کو دیکھا تھا وہ تصویر امریکہ میں اکثر میری آنکھوں کے سامنے گردش کرتی رہی۔ امریکہ
میں ان کا خط پڑھ کر دل کو تسلی ہوئی تھی۔ اب وہ پھر زندگی کی ایک نئی اور کامیاب
راہ پر گامزن ہیں۔ انھیں دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی۔ ان کے چہرے پر پہلے کی سی رونق
تھی، جسم پھر سے جیسے بھر گیا تھا اور آنکھوں میں حسب معمول ایک نئے عظیم مستقبل کی
چمک تھی۔

بغاوت کا پرچم جیسے پھر بلند ہو گیا تھا۔

ان کے گھر میں اب ایک نئی رونق تھی۔ فلموں میں بے حد مصروفیت کے باوجود
وہ اتوار کو سنتوش جی اور بیلی صنوبر کے قریب رہنا پسند کرتے تھے۔

کشمیر میں میرے والدین بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن بمبئی میں
کچھ ذاتی اور کاروباری کاموں کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ کشمیر کے مصوروں کی
تصویریں اب دہلی اور بمبئی کی آرٹ گیلریوں کی زینت بن رہی تھیں۔ بٹ کا شو
کے بعد اب تربوک کول کی نمائش جہاں گیر آرٹ گیلری میں ہو رہی تھی۔ اس
افتتاح ڈاکٹر ملک راج آنند کر رہے تھے۔ تربوک سے ملاقات ہوئی تو اس نے
زور دیا کہ بلراج جی کو بھی اس روز ساتھ لاؤں۔

میں نے ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے "مجھے یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں
جب ان مصوروں کو ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ
کا موقع ملے گا۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ اس تقریب میں شامل نہیں ہو

انھوں نے سنتوش جی کو ساتھ لے جانے کے لیے کہا لیکن انھیں بھی اس روز کچھ ضروری کام تھا۔ نمائش کچھ دنوں کے لیے تھی اس لیے فیصلہ یہی ہوا کہ ایک روز میں سنتوش جی کو کم سے کم یہ نمائش دکھلا لاؤں۔

بمبئی کے چرچ گیٹ کے علاقے میں میرے ایک قریبی دوست بیسری صاحب کا بہت بڑھیا ریستوران تھا جہاں خالص پنجابی، کشمیری اور پشاوری کھانا ملتا تھا ـــــ بمبئی میں پہلی بار بیری صاحب نے ہی چنے اور بھٹورے کے لنچ کا رواج قایم کیا تھا۔ میں نے سنتوش جی کو صلاح دی کہ بیری صاحب کے ریستوران میں ہی لنچ کیا جائے۔ وہ مان گئیں۔ ہمیں ڈیڑھ بجے وہاں ملنا تھا۔

بیری صاحب کو میں نے پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ مسز بلراج ساہنی میرے ساتھ ہوں گی۔ لنچ کے اس موقع پر ریستوران کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔ کہنے لگے "فکر مت کرو، تمہارے لیے الگ سے میز کا انتظام ہوگا، بلکہ تم جلدی چلے آؤ گپ بازی ہوگی۔"

بیری صاحب مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے ان کی بیوی کے چھوٹے بھائی میرے ساتھ اسکول اور پھر کالج میں تھے۔ ان کے واسطے سے کافی دوستی ہوگئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے فلموں میں ایکٹ کرنا چاہیے۔ ان کے ریستوران میں اکثر ایکٹروں کے علاوہ فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر بھی موجود ہوتے تھے۔

میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا اس لیے کہ میں نے سوچا بیری صاحب سے کچھ باتیں ہو جائیں گی۔ بیری صاحب اس وقت اپنی خاص ٹیبل پر کچھ لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور فوراً اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے ان لوگوں میں سے ایک صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے "چوپڑہ صاحب یہ میرے کشمیر کے ایک جوان دوست ہیں دیکھنے میں ایکٹر لگتے ہیں نا؟"

چوپڑہ صاحب نے ایک دوسرے کے لیے میری طرف دیکھا، پھر سنتوش [illegible]
بغیر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

بیری صاحب کہہ رہے تھے "کنول! یہ بی آر چوپڑہ ہیں، بہت بڑے [illegible]
میں ان سے تمہاری سفارش کر رہا ہوں کہ تمہیں فلموں میں کچھ کام دیں [illegible]
انھوں نے چوپڑہ صاحب کو جیسے مرغ مسلم کی ٹانگ توڑنے میں مداخلت کرتے ہوئے
کہا "یہ ویسے کافی فارغ البال ہیں، ان کا امریکہ میں دفتر ہے ان کے چچا صاحب
کا، آپ دو بار امریکہ ہو آئے ہیں؟"

اب سنتوش جی ریستوران میں داخل ہو چکی تھیں۔ میں نے کہا "سنتوش جی
آ گئیں، بیری صاحب ہماری میز کہاں ہے؟"

بیری صاحب ایکدم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا نہ تو سنتوش جی اور نہ ہی بلراج
جی سے تعارف تھا۔ چوپڑہ صاحب سے معذرت کرتے ہوئے بولے "کنول نے مسز
ساہنی، مسٹر بلراج ساہنی کو لنچ پر بلایا ہے۔ بلراج ساہنی ان کے بہت بڑے
دوست ہیں۔"

یہ سن کر ـــــ جیسے چوپڑہ صاحب کی ایکدم سے آنکھیں جاگ گئی ہوں۔
مرغ مسلم کو وہ ابھی تک ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ اٹھتے ہوئے بولے
"ان سے کہوں یہاں آ جائیں، اور ہاں بیری صاحب اپنے دوست سے کہہ دو کہ
کسی اچھے اسٹوڈیو سے اپنی ایک تصویر کھنچوا کر آپ تک پہنچا دیں۔ میں اسکرین
ٹیسٹ کا انتظام کر لوں گا۔"

اس دوران میں سنتوش جی ہماری ریزرو کی ہوئی میز پر پہنچ گئی تھیں۔
بیری صاحب نے ویٹر کو اشارہ کیا اور پھر ہمارے ساتھ میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میں
نے تعارف کرایا۔

"کھانے کی بالکل فکر نہ کرنا کنول، جو جی میں آئے آرڈر دو۔ سنتوش جی
یہ کھانا آج میری طرف سے ہے۔ میری بیوی کا نام بھی سنتوش ہے۔ میں اسے تو شی

کہہ کر چلا جاتا ہوں" اور پھر انھوں نے خالص پنجابی قسم کا قہقہہ لگایا اور اٹھ کر چوپڑہ صاحب کی میز پر چلے گئے۔

کھانا کھانے کے دوران وہ میرے امریکی دورے کے بارے میں پوچھتی رہیں اور خود اپنے لندن کے دورے کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اب بلراج جی نہ صرف ذہنی طور پر بحال ہو چکے تھے بلکہ مالی طور پر بھی قدرے خوشحال تھے۔ انھیں اب ایک نئے مکان اور ایک موٹر کار کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، خاص طور پر بچوں کے لیے اور پھر کار کے ذریعے اسٹوڈیو تک سفر کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے لیے ابھی انھیں کچھ اور برس انتظار کرنا پڑے گا۔

اگرچہ "دھرتی کے لال" فلم کا ادبی اور فلمی تاثر بہت تیز تھا لیکن "ہم لوگ" کا سماجی عنصر عام لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تھا۔ ہر راہ گیر، ہر تانگے والا، ہر مزدور یہ سمجھتا تھا کہ یہ فلم صرف اسی کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔

خواجہ احمد عباس اور رامانند ساگر نے انھیں کام دیا تھا لیکن ضیا سرحدی کے ساتھ "ہم لوگ" بناتے وقت ان کا ان کے ساتھ ایک اور ہی رابطہ تھا۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اس فلم میں ہر طرح سے بلراج ساہنی کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ فلم کی کامیابی کے بعد باکس آفس پر کامیابی اور موسیقی کی جو جھنکار ہندستان کے ہر شہر میں گونج رہی تھی ـــ اس کا مالی فائدہ زیادہ تر ضیا سرحدی کو ہی ہوا۔ خواجہ احمد عباس اور کچھ اور دوسرے پروڈیوسر بھی تھے جنھوں نے ابھی پہلی فلموں کے بھی بلراج جی کو پورے پیسے نہیں دیے تھے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "ہم لوگ" کی کامیابی کی بدولت اب کئی فلم پروڈیوسر جیسے ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اس وقت وہ چیتن آنند کی فلم "بازی" کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔

کھانے کی میز پر وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ اگرچہ یہ دعوت میں نے انھیں مسز ساہنی ہونے کی وجہ سے دی تھی لیکن جب گفتگو ادب، آرٹ اور سیاست پر

چلی تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم دونوں میں ایک رابطہ قائم ہو گیا ہے۔
ان کی بچی صنوبر کی پرورش کی وجہ سے ان کے لکھنے پڑھنے میں حرج ضروری تھا لیکن اب وہ پوری طرح سے لکھنا شروع کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں موسیقی میں بے حد دلچسپی تھی۔ وہ پیانو خوب بجاتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک فلمی مضمون بھی لکھا ہے جسے وہ شائع کرانا چاہتی تھیں۔

پچھلی ملاقات میں میں نے "شاہراہ" کے ایڈیٹر پرکاش پنڈت کو مشورہ دیا تھا کہ اس میں ایک فلم سیکشن بھی ہونا چاہیے جس میں ملکی اور غیر ملکی فلموں میں ادبی اور تکنیکی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے۔ وہ مان گئے تھے لیکن اس کے لیے میرا بمبئی میں رہنا ضروری تھا۔

اس وقت خواجہ احمد عباس بمبئی سے ہندی میں ایک بڑا فلمی اور ادبی معیاری رسالہ "سرگم" نکال رہے تھے۔ وہ اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ پنڈت سدرشن کے نوجوان صاحب زادے کل بھوشن اس کے ایڈیٹر تھے۔ میرے دوست ڈاکومنٹری پروڈیوسر پی ڈی گارا اور فلم جرنلسٹ وی۔ پی ساٹھے اس کے فلم سیکشن کے ذمہ دار تھے۔ یہ لوگ مجھ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ میں "سرگم" کے لیے کچھ لکھوں۔ "سرگم" کے دفتر میں ایک روز خواجہ احمد عباس سے بھی ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "دوست ایک آدھ افسانہ ہی ہمارے لیے لکھ ڈالو۔ ہم لوگ لکھنے والوں کو پیسے بھی دیتے ہیں۔"
ادیبوں کو رسالوں میں لکھنے کے لیے معاوضہ دینے والی بات مجھے بہت پسند آئی۔

میں نے سنتوش جی سے کہا کہ میں ان کا مضمون ہندی سے اردو میں ترجمہ کر کے "شاہراہ" کو بھیجوں گا اور میرا ایک افسانہ جو کچھ برس پہلے "سبزی فروش" کے نام سے لاہور کے "شاہکار" میں چھپا تھا اور کافی پسند کیا گیا تھا وہ اسے ہندی میں میرے لیے ترجمہ کریں۔ وہ مان گئیں۔

جب ہم دونوں جہانگیر آرٹ گیلری پہنچے تو معلوم ہوا کہ بدقسمتی سے نریوکول

کی رنجش ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے قریب ہی مدراسی ریستوران "چیتنا" جانے کا فیصلہ کیا۔ بلراج جی کو بھی یہ جگہ کافی وغیرہ کے لیے کافی پسند تھی۔

"چیتنا" میں کافی پیتے ہوئے ہماری گفتگو اب ذاتی سطح پر اتر آئی تھی۔ انہیں بلراج جی اپنی منجھلی بھابھی پربھا کے رشتے کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا جب میں نے خود ان کی اپنی اس "انوکھی" شادی کا تذکرہ کیا تو وہ بولیں:

"بلراج جی کے لیے میرے دل میں محبت کی چنگاری جو کالج کے دنوں سے ہی سُلگ رہی تھی وہ ان کی شادی ہو جانے پر ختم نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی میری شادی ہو جانے پر ـــــ لیکن جب میں ولایت سے واپس آئی تو انہیں اکیلا دیکھ کر یہ آگ پھر سے بھڑک اٹھی۔"

وہ کہہ رہی تھیں:

"اس زمانے میں راولپنڈی یا سارے پنجاب کے متوسط ہندو گھرانوں میں بھی لڑکیوں کی آزادی کے آداب و اطوار وہی تھے جو مسلمان گھرانوں میں صدیوں سے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے یہاں پردے کا ظاہرے رواج نہیں تھا لیکن بالغ لڑکیوں کو دوپٹہ سر پر ٹھیک طرح سے اوڑھنے کی ہدایت دی جاتی تھی اور یہ بھی کہ جب تک شادی نہیں ہوتی، محلے کے ہر نوجوان کو اپنا بھائی سمجھنا ضروری ہے۔

لیکن کون لڑکی تھی جو بلراج جی کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتی ـــ طویل قامت، گورا چٹا رنگ، کشادہ کندھے، گھنگریالے بال، چہرے کے حسین نقش و نگار کسی یونانی مجسمے کی طرح۔ وہ جب محلے کی گلیوں سے گزرتے تو دروازے کے دریچوں سے جھانکتی ہوئی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن جب تیز ہوتی تو، صرف ان کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا بلکہ ان کے پاؤں تلے کی زمین بھی!!"

بلراج جی، سنتوش جی کی علمی اور ادبی قابلیتوں سے بخوبی واقف تھے ان کے دل میں بھی ایک ایسا دروازہ تھا جہاں سے وہ جھانک کر سنتوش جی کو کسی اور رنگ میں بھی دیکھتے تھے لیکن اس زمانے میں پھوپی کی لڑکی سے شادی کے بارے

میں سوچنا بھی ایک گناہ سے کم نہیں تھا ابھی وہ زندگی کی اس منزل تک نہیں پہنچے تھے جہاں وہ بغاوت کے لیے آمادہ ہو جاتے۔

ان کی دمینتی سے شادی ہوئی۔

اب وہ ہندستان میں نہیں تھے بلکہ لندن میں بی بی سی کی ملازمت میں تھے سنتوش جی کی ہندی کے مشہور ادیب و نسائن سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ناول "ندیا کے دیپ" کی اس وقت چاروں طرف دھوم تھی۔ تھوڑے عرصے میں ہی اس ملاقات کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ لیکن ـــــ حالات کو کچھ اور ہی منظور تھا ـــ چند مہینوں کی شادی کے بعد طلاق ـــ اور وہ بھی ہندستان چھوڑ کر ولایت چلی گئیں۔

ولایت سے لوٹنے پر وہ بلراج جی کے یہاں ٹھہریں۔

جو ہو کی فضاؤں نے جیسے اس سوئے ہوئے رومانس کو پھر سے بیدار کر دیا جو حواب کئی برس سے سوئے پڑے تھے وہ پھر سے اب جاگ گئے۔

چرچ گیٹ اسٹیشن سے گھر کے لیے روانہ ہونے کے لیے ہم لوگ جب گاڑی میں بیٹھے تو مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی گرفتاری اور پھر رہائی کی بات چھیڑ ہی دی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر بڑی زوردار آواز میں بولیں "یہ صرف ہماری دلی اور مالی مجبوریوں کا سوال نہیں تھا بلکہ اس وقت ساری ترقی پسند تحریک اور خاص طور پر عوامی تھیٹر میں ایک تلاطم برپا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں فلموں میں زیادہ کام نہیں مل رہا تھا اور جب کام ختم ہو چکا تھا اس کے پیسے پروڈیوسر نہیں دے رہے تھے ـــ کمیونسٹ پارٹی میں بمبئی سرکار کے دباؤ سے ہلچل مچی ہوئی تھی ـــ ہمارے یہاں ایک نئی زندگی کی آمد آمد تھی میرا مطلب منوہر کی پیدائش سے ـــ جب میں ان سے جیل میں ملنے گئی تو وہ بے حد پریشان تھے لیکن یہ بات بالکل صاف ہے کہ میں نے ان پر اس سلسلے میں کوئی دباؤ ڈالا تھا اور نہ ہی انھوں نے

پولیس یا سرکار کو کوئی ذمّی گارنٹی دی تھی کہ وہ آئندہ کسی بھی ترقی پسند تحریک میں شریک نہیں ہوں گے۔"

یہ کہتے کہتے جیسے ان کی آواز جذبات سے بھر گئی تھی۔

وہ صحیح معنوں میں نہ صرف ایک ترقی پسند فن کار ہیں بلکہ انسانیت کی جدوجہد کرنے والے ایک سیاسی کارکن بھی۔ جس شخص نے "جادو کی کرسی" جیسا ڈراما حکومت کے خلاف لکھا، وہ اس حکومت سے کیسے سمجھوتہ کر سکتا تھا؟

مجھے یاد آیا کہ ان کا ڈراما "جادو کی کرسی" الہ آباد کی سالانہ کانفرنس (عوامی تھیٹر) میں اسٹیج ہونے کے بعد سارے ہندستان میں دھوم مچی تھی۔ اس ڈرامے سے نہ صرف انھوں نے ایک اسٹیج کے ایک عظیم اداکار بلکہ ایک بہت پائے کے ڈراما نگار ہونے کا ثبوت بھی دیا تھا۔ طنز و مزاح کے ادبی ہتھیاروں کی مدد سے اس ڈرامے کے ذریعے انھوں نے ESTABLISHMENT کی دھجیاں اڑائیں۔

۱۹۵۱ء کی سردیاں اور گرمیاں میں نے سرینگر میں بسر کیں۔ اب کشمیر میں ریڈیو کے قیام سے، ہم لکھنے والوں کو نئے مواقع میسّر ہو رہے تھے۔ نئے ڈراما نگاروں میں علی محمد لون سب سے آگے آگے تھے۔ میں نے خود پہلی بار ریڈیائی ڈرامے لکھے مغربی ڈراموں سے ماخوذ دو کھیل "گریز" اور "تلافی" بہت کامیاب ہوئے۔ اب میں ماہنامہ "شاہراہ" کے لیے باقاعدگی سے لکھ رہا تھا۔ امریکہ کے بارے میں بڑا طویل رپورتاژ "جہاں آزادی کا بت ہے" "شاہراہ" کے خاص نمبر میں شائع کرتے ہوئے پرکاش پنڈت نے میرا تعارف کراتے ہوئے لکھا:

"کنول نین پرواز نے اردو ادب کو ایک نیا طرزِ بیان اور ایک نیا اسلوب دیا ہے۔"

یہی دن تھے جب ایک روز ریڈیو اسٹیشن پر ایک صاحب سے تعارف کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ سلام مچھلی شہری اب ریڈیو کشمیر (سرینگر) میں تعینات ہوئے ہیں۔

عرصے سے ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھ رہا تھا اور ان کی شاعری سے بے حد متاثر تھا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو ادب میں آزاد نظم میں میراجی، ن۔م۔راشد کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی لینا بہت ضروری ہے۔ جب ایک روز کافی ہاؤس میں اس بات کا تذکرہ ہوا تو وہ ہنس کر بولے "ن۔م۔راشد نے آزاد نظم کے ذریعے یورپ سے اپنے ملک کی بدحالی کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ میراجی نے لوہے کے تین گولے کندھے سے لٹکتے ہوئے جھولے میں ڈال کر شاید اپنی ذاتی اور دنیا کے تھیلوں کو اس میں سمیٹ لیا تھا لیکن میرے پاس سوائے ادب کے کچھ نہیں۔"

مجھے خوب یاد آیا کہ عوامی تھیٹر میں بلراج جی نے ایک بار میراجی سے تعارف کراتے ہوئے ان کے اس کندھے سے لٹکتے ہوئے جھولے میں تین لوہے کے گولوں کا بھی تذکرہ کیا۔

سلام بولے "تو آپ بلراج جی کو جانتے ہیں! بہت بڑے فنکار ہیں۔"

میں نے انھیں بتایا کہ "وہ دسمبر میں اپنے بھانجے کی شادی پر یہاں آرہے ہیں ان سے آپ کو ملواؤں گا۔"

وہ سرینگر تھوڑے عرصے کے لیے آئے تھے۔ کہنے لگے "یہ میری بدقسمتی ہوگی اگر ان کے آنے سے پہلے میرا کسی اور اسٹیشن پر تبادلہ ہو گیا تو۔"

۱۹۵۲ء کے شروع میں ان کے بھانجے اشوک کی شادی مقرر ہوئی۔ یہ شاید جنوری یا فروری کا مہینہ تھا۔ سلام پچھلی شہری سرینگر سے چلے گئے تھے۔ کمال احمد صدیقی تو سرینگر اپنے علاج کے لیے آئے تھے اب ریڈیو کشمیر میں کام کر رہے تھے۔

اس عرصے میں اشوک سے کافی ہاؤس میں اور ان کے گھر پر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اب وہ میرے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

بلراج جی بہت ہی کم عرصے کے لیے سرینگر آئے تھے۔ اب وہ لندن بی بی سی

بلراج کا شمار اعلیٰ تھیٹری فلم "دھرتی کے لال" کے ہیرو ہی نہیں تھے بلکہ ہندستانی پردۂ سیمیں کے ایک بہت ممتاز اداکار ـــــ ہندستان کے ہر شہر میں "ہم لوگ" کی دھوم تو تھی ہی لیکن سرینگر جیسے چھوٹے شہر میں ہر بچہ، جوان، خاص طور سے تانگے والے "ہم لوگ" کا مکالمہ "اپنے کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے" بار بار دُہرا رہے تھے۔ یہ تو ابھی بات تھی کہ وہ ایسے موسم میں آئے جب بازاروں میں جلدی اندھیرا پڑنے سے رونق کم ہوتی ہے اور بازار جلدی بند ہو جاتا ہے ورنہ شاید ان کا لال چوک سے گزرنا محال ہو جاتا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے وزیر باغ میں ہوئی۔ ان کے اکثر مہمان یہاں موجود تھے۔ ان کے یہاں شراب کا اچھا خاصہ دور بھی چلا وقت کم ہونے کے باوجود انھوں نے ریڈیو اسٹیشن کے ایک ڈرامے میں بھی حصہ لیا اور پران کشور کے ہاں کشمیری کھانے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔

وہ کشمیر کے اکثر نئے ادیبوں اور مصوروں سے ملنا چاہتے تھے خاص طور پر ٹ کاشمیری سے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ پران کشور کے یہاں کھانا کھانے سے پہلے "لب کول" کے بار پر چند دوستوں کے ساتھ شراب کا پروگرام ہو۔ "لب کول" کا بار اس وقت سرینگر کے فن کاروں سے بھرا رہتا تھا۔ ریذیڈنسی روڈ پر انگریزی فلمیں دکھانے والے ریگل سینما کے یہ بالکل سامنے تھا ـــ پران کشور کے ریڈیو کشمیر والے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا پینے پلانے کا دور دیر تک چلے گا اور اس وقت سواری وغیرہ کا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بلراج جی کو دوسرے روز اپنے ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں اسٹیشن جانا تھا اسٹیشن کی گاڑی انھیں لینے آئی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا وہاں سے ہم لوگ پران کشور، بشیر بٹ وغیرہ اسٹیشن کی گاڑی سے ہی "لب کول" کے بار میں آئے اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور عبدل کی اپنی ہی ایک خاص شخصیت تھی وہ بھی کسی

یکطرے سے کم نہیں تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے پروگراموں میں حصہ لینے والے کئی نامور لوگوں کو وہ اپنی گاڑی میں سوار کر چکا تھا۔ ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے وقت وہ بڑے احترام سے سر کو نیچے جھکاتا۔ ملراج جی کے لیے دروازہ کھولتے وقت احترام سے سر جھکانے کے ساتھ وہ ان کی فلم "ہم لوگ" کا مکالمہ بھی دہراتا ——

"ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے" اور ملراج جی پھر اسے گلے سے لگا لیتے۔

"لب کول" کے بار میں ہمیں چھوڑتے ہوئے عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ وہ دو تین گھنٹے میں گاڑی لے کر آئے گا اور ہم گاڑی میں ہی پران کشور کے یہاں جائیں گے۔ پران کشور نے کھانے کے لیے اسے بھی دعوت دی تھی۔

کئی دنوں سے بڑے زور کی برفباری ہو رہی تھی خاص طور پر اس روز سڑکوں اور عمارتوں پر چاروں طرف جیسے ایک طویل سفید چادر چھائی پڑی تھی۔ ہم لوگوں کے پہنچنے سے بار اور بھی بھر گیا تھا۔ اس شدید سردی میں سب کو وہسکی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

ملراج جی سے جب ہم نے پوچھا کہ وہ کیا پئیں گے تو بولے "بی بی سی کے زمانے سے ہی WINE (بیئر) پینے کی عادت سی پڑ گئی ہے اگر یہ مل جائے تو کیا بات ہے۔"

انگریزوں کو ہندستان سے گئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ BEER بھی وہاں ایک LAGER تھی جو وہ چھوڑ گئے۔ "لب کول" کے اسسٹنٹ محمود نے WINES کی دو بوتلیں میز پر رکھ دیں اور انھیں ملراج جی کے لیے گلاس میں ڈالتے ہوئے بولا "ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے۔"

محمود کی عمر مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ وہ بار کی میزیں وغیرہ صاف کرنے اور سب کول کے لیے خرید و فروخت کا سامان باہر سے لانے کے علاوہ اس میخانے کا ساقی بھی تھا۔

شراب کے دور کے ساتھ ہی ادب اور آرٹ پر گفتگو شروع ہوئی پھر سیاست کا احاطہ کرتے ہوئے ساری دنیا کی سیاست تک جا پہنچی۔ اس میز کے گرد

بیٹھے ہوئے ہم اور ہم کار جیسے ساری دنیا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ وہ بھی اس بحث میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے اس جوش و خروش کو صرف ہمارے نوجوانی کے "گرم خون" بلکہ شراب کے نشے سے بھی متعلق سمجھ رہے ہیں۔

اور پھر بیئر ختم ہو گئی۔ لب کول پریشان تھے۔ بلراج جی نے کہا "کوئی بات نہیں، بس دو بوتلیں کافی تھیں"

مگر ہمیں معلوم تھا کہ وہ اور پینا چاہیں گے لیکن وہ کسی اور چیز پینے کے لیے رضامند نہیں تھے۔

محمود کے کانوں میں اس بات کی بھنک پہنچی تو ایکدم سے اچھل کر بولا:

"اگر بلراج جی کو بیئر چاہیے تو ہم اس کو بیئر لا کر دے گا، ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے"

"سالے تو کہاں سے بیئر لائے گا" لب کول نے اسے ڈانٹا "رات کے نو بج چکے ہیں، سارا بازار اب بند ہو چکا ہے"

لب کول کے بار کے قریب "آف لائسنس" شراب کی دوکان تھی جہاں سے ہم اس کی سپلائی آیا کرتی تھی لیکن یہ سردیوں کے دن تھے اور لب کول نے بتایا کہ پنڈت جی کی حال ہی میں دوسری شادی ہوئی ہے، ادھر سردیوں میں دوکانیں اکثر جلدی بند ہو جاتی ہیں، لیکن دوکان وقت سے پہلے بند کرنے کی پنڈت جی کو ایک اور شہ بھی جیسے مل گئی تھی۔

"نئی شادی ہوئی ہے تو کیا؟" محمود نے بڑے اعتماد سے کہا "ہم اس سے بولے گا کہ بلراج جی کو بیئر چاہیے، ہم پنڈت جی کو اس کے بستر سے آج نکالے گا، ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے"

بلراج جی نے اپنا خالی گلاس اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "ہاں محمود، ہم کو تو یار کی یاری سے مطلب ہے"

میں محمود کے ساتھ پنڈت جی کی دوکان تک جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ باہر چاروں طرف تاریکی تھی۔ برفباری اور تیز ہو گئی تھی۔ شائیں شائیں کرتی ہوئی ہوا چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی چادر کو اڑانے کی بیکار کوشش کر رہی تھی۔ بجلی کے کھمبوں سے لٹکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بلب اپنی کمزور روشنی پر جیسے شرمسار تھے۔

پنڈت جی دوکان کے اوپر ہی رہتے تھے۔ دوکان کے سامنے وسیع برآمدہ سا تھا۔ محمود نے برآمدے میں جا کر زور سے اوپر کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔

محمود نے دو تین بار دروازے پر دستک دینے کے بعد برآمدے سے باہر آ کر زور سے چلانا شروع کیا "پنڈت جی، پنڈت جی دروازہ کھولو۔"

لب کول نے ٹھیک کہا تھا۔ پنڈت جی اپنی نئی بیوی کی آغوش میں جیسے کسی اور دنیا میں ہی تھے اور پھر اس شدید سردی میں گرم رہنے کے لیے اس سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی تھی پہلے تو محمود بڑبڑایا "پنڈت جی مزے لے رہے ہیں۔" اور پھر ایکدم چیخ کر بولا "پنڈت جی! ہم بلراج ساہنی کے لیے آیا ہے، پنڈت جی ہم کو بیئر چاہیے۔"

فلیٹ کی کھڑکی ایکدم سے کھلی۔ تیر ہوا سے جیسے کھڑکی بار بار بند ہو رہی تھی پنڈت جی اپنے بھاری "فرن" ملبوس تھے۔ انھوں نے منہ تک ـــــ (گرم ٹوپی) چڑھا رکھی تھی۔ ٹوپی کو منہ سے اٹھاتے ہوئے بولے "کمبخت اتنی رات گئے کیا چلا رہا ہے؟ کس کو بیئر چاہیے؟"

"بلراج ساہنی کو بیئر چاہیے" محمود نے چلاتے ہوئے کہا "بلراج ساہنی ہمارا یار ہے "ہم لوگ" پھلم (فلم) کا ہیرو ہے۔ ہم کو یار کی یاری سے مطلب ہے۔"

کھڑکی بند ہو گئی۔ ہم دونوں بے حد مایوس تھے۔ پھر نیچے کا دروازہ کھلا اور پنڈت جی بولے "بیوی نے کئی بار کہا "ہم لوگ" دیکھنے چلو، مگر مجھے وقت ہی نہیں ملی۔ وہ کہتی ہے بہت اچھی پھلم (فلم) ہے۔"

اور پھر پنڈت جی نے دوکان کھولی اور بیئر کا ایک کیس ـــــ یعنی بارہ بوتلیں دیں۔

پران کے یہاں کھانا کھاتے ہوئے بلراج جی ایکدم سے بولے "یہ محمود آن کی نئی کشمیری پود کا نمائندہ ہے۔ اس بچے میں اس کا اعتماد اس راستے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو آنے والے دنوں میں کشمیر کی تعمیر کی ترقی کا ضامن ہوگا"

محمود نے ان سے ایک آٹوگراف کی ہوئی تصویر مانگی تھی۔ وہ دوسرے روز صبح بمبئی واپس جا رہے تھے۔ میں نے کہا "یہ تصویر مجھے دے دیجیے، میں اسے دے دوں"

دوسرے روز معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی صبح روانہ ہونے سے پہلے یہ تصویر ٹب کول کے بار پر دے آئے تھے!!!

فارم ۴

نام رسالہ:-	عصری ادب
زبان:-	اردو
وقفہ:-	سہ ماہی
نام مالک:-	سید بہاء الدین احمد
قومیت:-	ہندستانی
نام ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر:-	سید بہاء الدین احمد
قومیت:-	ہندستانی
پتہ:-	ڈی، ماڈل ٹاؤن۔ نئی دہلی ۹

میں سید بہاء الدین احمد اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔ سید بہاء الدین احمد

انور خاں

خوشبو

اندھیرے سنسان راتوں سے گزرتے ہوئے بس مسلمان علاقوں میں داخل ہوئی تو منظر بدل گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ، دکانوں پر تیز چمچماتے قمقمے، مٹھائیوں، کبابوں کی خوشبوئیں، مسجدوں میں چراغاں۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ لوگ تراویح پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ بشر اپنے اسٹاپ پر اترا تو گلی کے نکڑ پر اسے دوست کھڑے نظر آئے۔ سفید کرتے، سفید پائجامے، سروں پر ٹوپیاں۔

گھر جانے کی عجلت تھی لیکن دوستوں سے علیک سلیک کیے بغیر کیسے گزر سکتا تھا۔

"ابھی آ رہے ڈیوٹی سے؟" ایک دوست نے پوچھا۔

"ہاں یار، نائٹ شفٹ تھی۔" بشر نے جواب دیا۔ "تراویح پڑھ کر آ رہے ہو تم لوگ؟"

"ہاں یار، ویسے تو کبھی توفیق نہیں ہوتی۔" اس نے جواب دیا۔ "کم از کم رمضان میں کچھ عبادت کر لیں اور نمازوں کے بغیر روزے رکھنے کا لطف ہی کیا۔"

"آفس سے چھٹی لے لی ہے کیا؟" بشر نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں کنپٹیوں کے بال تو سفید ہو چلے۔" بشر نے دوست کو چھیڑا۔ "اب موت کا خوف ستا رہا ہوگا، کیوں؟"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا کیا؟" اس نے پوچھا۔

بشر چپ ہو گیا، پھر چند ثانیوں بعد بولا:

"واقعی یار ہم لوگ بھی عجیب ہیں۔ نوجوانی میں خوب گل چھرے اڑاتے ہیں، بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں خدا تک کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، کسی کو خاطر میں نہیں لاتے مذہب، اخلاق، انسانی رشتے، ہر چیز کا مذاق اڑاتے ہیں پھر معلوم ہوتا ہے کہ زیر نماز میں پڑھ رہا ہے، سعید تبلیغی جماعت میں شامل ہو گیا، ظفر کو تصوف ہو گیا ہے، مظفر درگاہوں کے پھیرے کر رہا ہے۔"

"ہاں یار یہ بات تو ہے" اس نے کہا "پر کیا کریں، پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے سب کچھ بیکار معلوم ہونے لگتا ہے۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مائل لکھنوی مسجد سے برآمد ہوئے۔ سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مائل بڑے اچھے شاعر تھے۔ رٹل میں ان کا جواب نہ تھا۔

"کیا مائل صاحب آپ بھی؟" بشر کے ایک دوست نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

مائل مسکرائے، عادتاً دائیں بائیں دیکھا اور پھر گویا ہوئے۔

"میاں ـــــ معبود کی طاعت کوئی آسان نہیں۔"

دوسرا مصرع رٹل کا تھا جو عشا کی سترہ رکعتیں اور تراویح کی بیس رکعتوں کے پیش نظر کہا گیا تھا۔ ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ دو ایک راہ گیر جو مائل کو دیکھ کر رک گئے تھے وہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔

"آئیے پان کھاتے ہیں" مائل نے کہا۔

بشر کے دوست ان کے ساتھ ہو لیے، بشر اجازت لے کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔

گھر میں داخل ہوا تو بیوی ٹی۔ وی پر لیٹ نائٹ فلم "آئی ہو یو رو ز" دیکھ رہی تھی۔ جی میں تو آیا کہ بیوی کو ڈانٹے کہ رمضان میں

یہ خرافات، لیکن چند سال قبل یہ فلم اس نے ایک بیسٹوں میں دیکھی تھی اور اس کی ہیروئن اسے بہت پسند آئی تھی۔ خوبصورت، کدرا یا بدن، جسے دیکھ کر کچھ ہونے لگے، زبان خواہ مخواہ خشک ہو جائے۔

اس فلم کا موضوع بھی وہی ہے جو بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کا ہے بشر نے بیوی سے کہا۔

"کون بیدی؟ جنھوں نے دستک فلم بنائی تھی؟" بیوی نے جو کھانا گرم کرنے جا رہی تھی پوچھا۔

"ہاں وہی" اس نے جواب دیا "یہودیوں میں رسم ہے کہ بڑے بھائی کا انتقال ہو جائے تو اس کی بیوہ سے چھوٹے بھائی کی شادی کر دیتے ہیں۔"

"توبہ اللہ" بیوی نے کانوں پر ہاتھ رکھا "فلم والوں کو بھی ایسے ہی گندے موضوع ملتے ہیں فلمانے کے لیے۔"

بیوی نے کھانا پروسا اور دن بھر کی روداد سنانے لگی۔ بچوں کی بڑکیوں کی باتیں، رشتہ داروں کی باتیں۔

"یا تو باتیں بند کر دو یا ٹی۔ وی۔" بشر زچ ہو کر بولا۔

بیوی خاموش ہو گئی۔ دونوں خاموشی سے فلم دیکھنے لگے۔ فلم میں اس کا جی نہیں لگا۔ اس چھوٹے سے اسکرین پر ہیروئن کے خدوخال میں وہ بات کہاں سے پیدا ہوتی جو فلم کو بڑے اسکرین پر اسے محسوس ہوئی تھی۔ دور کے شاٹ میں خدوخال قریب قریب غائب ہو جاتے۔

وہ بستر پر لیٹ گیا۔ بیوی نے اسے لیٹتے دیکھا تو ٹی۔ وی بند کر کے پہلو میں آ لیٹی۔ بچے بچھونوں میں گہری نیند سو رہے تھے۔

"ارے میں آپ سے کہنا بھول گئی، شبو آیا تھا۔"

"کیوں؟" بشر نے پوچھا۔

"پولے والی خالہ کا انتقال ہو گیا۔"

بشر کے ذہن میں قبرستان کا منظر گھوم گیا۔ روزانہ آتے جاتے اس کی بس ایک قبرستان سے گزرتی تھی قبرستان کے دروازے کے پاس ہی پھولوں کی دو دکانیں تھیں جن پر بیٹھے خمیدہ کمر، پوپلے منہ والے دو بوڑھے پھوس وہ برسوں سے دیکھتا آرہا تھا۔ ماحول سے بے نیاز، لاتعلق جیسے دو گٹھے رکھ دیئے ہوں۔ نان کے ٹکڑوں پر گرتے فقیروں کے بچے اور عورتیں، وضو کے لیے دوڑتے کسی میت کے لواحقین یا سگریٹ، پان کی دکان پر ہجوم کرتے لوگوں سے جیسے انہیں واسطہ ہی نہ تھا۔ کل وہ ان بوڑھوں کو بالکل پاس سے دیکھے گا اس نے سوچا ڈبل ڈیکر بس کی کھڑکی سے اس نے انہیں دیکھتے ہوئے کئی بار یہ بات سوچی تھی۔

"میت کب جائے گی؟" بشر نے پوچھا۔

"صبح جائے گی تو دس بجے۔ پونے میں ان کے میکے والوں کو خبر کر دی ہے بتا رہا تھا صبح پہنچ رہے ہیں وہ لوگ۔"

"ٹھیک ہے، پھر کل صبح دیکھا جائے گا۔" اس نے سوچا کل دفتر میں اسے ایک اسٹیٹمنٹ بھی دینا تھا شام تک کسی بھی حالت میں مکمل کرنا تھا۔

"بڑی نیک عورت تھیں" بیوی نے کہا

"ہاں" اس نے تائید کی۔

سچ مچ بڑی نیک عورت تھیں۔ سب سے قریب اسی کا گھر تھا۔ دو محلے چھوڑ کر۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ گجرے کی بھینی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔

"گجرا لگایا ہے؟" اس نے نادرہ کے سر کو پہلی بار غور سے دیکھا۔

نادرہ ہنس پڑی۔

"آپ تو کبھی لاتے نہیں، آج گجرے والا دروازے پر آیا تو میں نے خرید لیا۔" واقعی اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی گجرا خریدا ہو۔ اس کی مہک سے ہی

اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں نادرہ پابندی سے گجرا لگایا کرتی تھی۔ جب وہ پاس پاس لیٹتے تو بشر کا عجیب حال ہوتا۔ خوشبو اس کی تمام حسوں کو جگا دیتی۔ کانوں کی لو میں آنچ دینے لگتیں، سانسیں تیز ہو جاتیں، ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے اور سب کچھ اتنی تیزی سے ہو جاتا کہ وہ تجل رہ جاتا۔ بیوی سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ رہتی۔ ابتدا میں تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بعد کو اندازہ ہوا کہ یہ ساری آفت پھولوں کی ہے۔ نادرہ سے کیسے کہتا کہ گجرا مت لگایا کرو۔ جب کچھ بے تکلفی بڑھی تو اس نے اپنی مشکل نادرہ کو بتائی۔

وہ حسب عادت ہنس پڑی۔

"رہنے دیجیے، ہمیں یونہی اچھا لگتا ہے، ہم نے تو آپ سے کبھی شکایت نہیں کی۔"

وہ کچھ دیر یونہی پڑا رہا۔ رابعہ خالہ کی موت نے اسے اداس کر دیا تھا۔ لیکن یہ کم بخت گجرے کی خوشبو۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ نادرہ کو بھی آج ہی گجرا خریدنا تھا۔ شبّو دیر سے آیا ہوگا، ورنہ وہ یقیناً گجرا نہ خریدتی اور یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ نادرہ گجرا خریدے اور نہ لگائے۔ پھول اسے بے حد پسند تھے۔

شاید اس کا بدن آنچ دینے لگا تھا۔ نادرہ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کیونکہ اس نے کروٹ لے کر اپنا بازو بشر کی گردن میں حمایل کیا اور سر سینے میں دھنسا دیا۔ اب گجرا عین اس کی ناک کے نیچے تھا۔

"تو کل آپ میت میں جائیں گے نا؟" نادرہ نے اچانک کہا۔ "بڑی نیک تھیں بیچاری۔ کتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ مل آؤں پر وقت ہی نہ ملا بچوں میں دن کہاں گزر جاتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔"

بشر کو بڑی کوفت ہوئی۔ یہ عورتیں اس قدر بدذوق کیوں ہوتی ہیں بھلا یہ وقت ان باتوں کا تھا؟ قبرستان کے پوپلے منہ کے بڈھے جیسے یاد

آگئے ہوں۔ اس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی جھنجلا کر کچھ کہنے کے ارادے سے اس نے منہ کھولا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ ایک لمبی سانس لی۔ گھرے کی مہک دماغ میں جا کر لگی اور وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔

اس بار بھی وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ مجالت اور غصہ۔ غصہ دراصل اسے خود پر آتا ہے اس نے سوچا وہ چاہتا ہے ان لمحات کو طول دے لیکن اس کا بس نہیں چلتا۔ جسم و دماغ کی اس کشمکش میں فتح ہمیشہ جسم کی ہوتی ہے اور سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ اس نے اٹھ کر بتی جلائی۔

"بہت جلدی ہو گیا؟" اس نے نادرہ سے کہا۔

"نہیں تو" نادرہ نے کہا۔

بشر کو صاف محسوس ہوا کہ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ رہی ہے۔

بلڈنگ کے سامنے فٹ پاتھ پر حنارہ رکھا تھا۔ بتیاں بجھ گئی تھیں۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لوگ دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ سب نے ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ چہرے سوگوار تھے۔ زینے طے کر کے وہ رابعہ خالہ کے کمرے پر پہنچا۔ ان کے بیٹے کے رشتہ دار نظر آئے۔ بشر نے رابعہ خالہ کے لڑکوں کو پرسہ دیا اور سوگوار صورت لیے کھڑا ہو گیا۔ ذہن میں کہیں بار بار یہ خیال کچوکے دے رہا تھا کہ اسے آج اسٹیٹ منٹ بنا کر دینا ہے۔

"میت کب جائے گی؟" ایک پڑوسی نے آکر پوچھا۔

"دس بجے" خالو نے جواب دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قبرستان تک پہنچنے تک پونے گیارہ تو بج ہی جائیں گے وہاں آدھ پون گھنٹہ اور رکنا ہوگا۔

وہ پیچھے اتر آیا۔ بلڈنگ سے آتے باہر ہی اس کی ملاقات اپنے چچازاد

بھائی حسین سے ہوئی۔ "آؤ چائے پیتے ہیں" اسے دیکھتے ہی حسین نے کہا۔ "ابھی کافی وقت ہے۔"

حسین سے اس کی بے تکلفی تھی، دونوں ساتھ ہی پڑھے تھے چائے پیتے ہوئے اس نے حسین سے اپنی مشکل کا ذکر کیا۔

"تم آفس فون کیوں نہیں کر دیتے" حسین نے کہا۔

"یار! اسٹیٹ منٹ تو مجھے ہی بنانا ہے۔"

"تم فون کر کے بات تو کرو۔"

بشر نے دفتر فون ملایا، سپرنٹنڈنٹ تو نو بجے دفتر پہنچ جاتا تھا، اس نے کہا "فکر کرنے کی ضرورت نہیں، ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ کل شام دلی سے ٹیلیکس آیا تھا چیرمین صاحب سویرے ہی دلی روانہ ہو گئے اب دو روز بعد لوٹیں گے، تم چاہو تو اتفاقیہ رخصت لے لو یا پھر دوپہر میں آجاؤ۔"

بشر کے سر سے ایک آفت ٹلی۔ وہ بالکل نارمل ہو گیا۔ ہوٹل سے واپس ہوئے تو جنازہ تیار تھا۔ قریبی رشتہ دار آخری دیدار کے لیے جا رہے تھے۔ دبی دبی سسکیوں، آہوں اور چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں وہ اور حسین کمرے میں داخل ہوئے۔

رابعہ خالہ کی لاش رکھی تھی۔ سرہانے اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ چہرہ کھلا تھا، پُرسکون چہرہ۔ آخری سفر کے لیے تیار، ہنستا مسکراتا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر انھیں ٹکٹکی جمائے دیکھتا رہا پھر بے ساختہ آنسوؤں کا جھرنا بہہ اٹھا۔ حسین اسے سنبھال کر باہر لے آیا۔

جنازے کو کندھا دینے میں وہ پیش پیش رہا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے اسے وہ پوپلے منہ کے بوڑھے یاد آئے۔ جنازہ رکھ کر جب لوگ سستانے، وضو بنانے لگے تو وہ پھولوں کی دکان کی طرف چلا گیا

اس نے قریب جاکر دیکھا ان بوڑھوں کے چہروں پر عجیب اطمینان تھا وہ واقعی بڑے مطمئن اور ماحول سے بے نیاز تھے گویا کہہ رہے ہوں کہ ہم تو دنیا کے سارے سرد و گرم دیکھ چکے ہیں دنیا سے کیا لینا دینا، جب بلاوا آئے گا چلے جائیں گے۔

نماز جنازہ اس نے بڑے خشوع و خضوع سے ادا کی۔ دفنانے میں عزیزوں کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ فاتحہ پڑھ کر لوگ رخصت ہوئے۔ بشر رک گیا اس نے سوچا اب وہ آیا ہے تو والدین کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جائے گا۔

والد کی قبر تلاش کرنے میں اسے دقت نہیں ہوئی۔ اس نے قبر پر پڑا جھاڑ جھنکار صاف کیا۔ بھشتی گزر رہا تھا اسے آواز دے کر پانی منگوایا۔ جتنی دیر میں اس نے فاتحہ پڑھی بھشتی پانی لے آیا۔ والد کی قبر کے برابر میں والدہ کی قبر تھی۔ اس نے دونوں قبروں پر پانی بہایا۔ بھشتی روپے لے کر چلا گیا۔ بشر قبر کی پائینتی بیٹھ کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ فاتحہ پڑھ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اطراف میں نظر دوڑائی۔ ویران قبرستان میں دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا صرف ہوا کی شائیں شائیں سنائی دے رہی تھی۔ درختوں سے گزر کر آتی شفیق ٹھنڈی ہوا کی تھپکیوں سے اس پر غنودگی چھانے لگی پیر بوجھل ہوتے چلے گئے، زمین نے پیر پکڑ لیے۔ کیسی اپنائیت تھی یہاں۔ اسے اپنے بچپن کا گھر یاد آیا۔ والدین کے زیر سایہ وہ کتنا خوش تھا کچھ ایسی ہی کیفیت اسے اب محسوس ہوئی۔ فضا میں خالی پن تھا مگر کسی قدر سکون بخش۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ہوا کی شائیں شائیں سنتا رہا پھر پیر موڑ کر ماں کی قبر کے سہارے لیٹ گیا اور تھوڑے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہوا کی شائیں شائیں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ اس طرح لیٹا رہتا شاید وہ سو جاتا لیکن خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

دور کچھ فاصلے پر ایک تازہ قبر کے نزدیک اسے چند لوگ کھڑے نظر آئے۔ قبر پھولوں کی چادر پڑی تھی۔

رفعت نواز

خواب سراب

دن تو جیسے تیسے گزر جاتا لیکن رات کو تھک کر بستر پر لیٹتا تو لگتا جیسے بستر پر کانٹے بکھرے ہوں، کسی کروٹ چین نہ ملتا، نیند اُڑ جاتی اور بُرے بُرے خیالات لیٹنے نہ دیتے، بار بار اٹھ کر پانی پیتا، سگریٹ پر سگریٹ پھونک جاتا لیکن اس کے خیال سے چھٹکارا نہ ملتا۔ کئی دنوں سے یہی کیفیت تھی۔ بیوی تو اس سے زیادہ ہی پریشان تھی، رات میں بھی وہ ٹہلتی رہتی، بار بار اس کے پلنگ کے پاس آتی اور بڑبڑانے لگتی، رندھے گلے سے پہلے تو التجا کرتی جواب نہ پاکر اسے سنگدل، بے حس اور ظالم تک کہہ دیتی۔ اسے بیوی سے ہمدردی تھی۔ اس کے جذبات کو سمجھتا تھا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ تسلی دیتا تو وہ بگڑ جاتی اور ساری ذمہ داری اس پر ڈال دیتی۔ بیوی کا خیال تھا کہ یہ سب اس کی ضد کی وجہ سے ہوا تھا اگر وہ بیٹے کی بات مان لیتا تو ایسا نہ ہوا ہوتا۔ وہ خود کو حق پر سمجھتا تھا۔ بیٹے کی بات وہ کیسے مان لیتا۔ اگر مان بھی لیتا تو اس کا کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹا سیڑھی سیڑھی چڑھ کر سب سے اوپر والی منزل پر پہنچے۔ اسے محنت کرنا پڑے تو منزل پر پہنچ کر احساس ہو کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت لگتی ہے۔ لیکن بیٹا تو لفٹ کے ذریعہ ایک منٹ میں سب سے اوپر والی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا لیکن ایسا ہونا ممکن کہاں تھا۔ وہ بیٹے کو پیار سے سمجھاتا، اپنی جدوجہد کی کہانی سناتا اور چاہتا کہ وہ بھی ایسی ہی جدوجہد کر کے منزل پر پہنچے۔ اس کی باتیں بیٹا بڑی سے سن لیتا لیکن اس کا ردعمل ایسا ہوتا کہ اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ بیٹا اس کی

باتوں کو داستان سے زیادہ اہمیت دیتا تھا کہ وقت گزاری کے لیے سن لی جاتی ہے۔ برسوں سے بیٹے کو آپ بیتی سناتا آرہا تھا، اس نے قسمیں کھا کر یہ بات بیٹے کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس کی آپ بیتی میں ذرا سی بھی جھوٹ کی ملاوٹ نہیں ہے، ایک بات بھی غلط نہیں ہے، ماں باپ جب مرے تو وہ چھ سال کا تھا اور اس کی بہن آٹھ سال کی تھی۔ ماموں نے مجبوراً اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ بہن گھر کے کاموں میں ممانی کا ہاتھ بٹاتی اور وہ ماموں کے بھائیوں کی گالیاں سنتا مار کھاتا تھا اور ان کے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اسکول جاتا تھا۔ دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی لیکن بڑی مشقت کرنے اور ذلت اٹھانے کے بعد جوں توں کر کے ہائی اسکول پاس کر لیا تو روٹی ملنا بھی بند ہو گئی اور گھر سے نکال دیا گیا، بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں سوار ہو گیا۔ پکڑا نہ گیا تو بمبئی پہنچ جائے گا، اگر پکڑا گیا تو کچھ دنوں تک روٹی کا سہارا تو ہو جائے گا۔ دو دن سے بھوکا تھا جسم پر میلے کپڑے تھے۔ دادر ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا، ٹکٹ چیکر کی نظر چوکی اور ہجوم کے ریلے میں باہر نکل گیا۔ تین ہوٹلوں میں کام کی تلاش میں گیا، ضمانت مانگی گئی۔ ایک مندر کی سیڑھیوں پر نڈھال ہو کر گر گیا۔ ایک مہربان نے محبت سے احوال پوچھا، روٹی کھلائی، اپنی کھولی کے سامنے سونے کو جگہ دی اور کیپسول بنانے والی فیکٹری میں کام بھی دلایا۔ دن بھر فیکٹری میں کام کرتا رات میں دو گھنٹے ایک ٹائپ رائٹنگ انسٹی ٹیوٹ میں ٹائپنگ سیکھتا چار سال یوں ہی گزر گئے۔ وطن کی یاد ستانے لگی، بہن کی محبت نے کلپایا گھر بسانے کی دھن لگی۔ وطن لوٹا تو پورٹیبل ٹائپ رائٹر بغل میں تھا اور پانچ روپے جیب میں۔ دو وکیلوں کے یہاں جز وقتی کام مل گیا۔ سول کورٹ کے سامنے [illegible] کیبن حاصل کر لیا۔ دن بھر وہاں بے تکان ٹائپنگ کا کام کب [illegible] ہی گئی۔ پھر شہر کے گنجان علاقے میں ٹائپ رائٹنگ انسٹی [illegible] ٹائپ رائٹر خریدے، ٹیوٹر رکھا، انسٹی ٹیوٹ رجسٹرڈ کرایا۔ کاروبار

چل نکلا۔ اچھے گھرانے میں شادی رچائی، چھوٹا سا گھر بنایا۔ زندگی میں پہلی بار شکر ملا، بیٹا پیدا ہوا تو جیسے خوشیوں کی تکمیل ہو گئی۔ بیٹا چار سال کا ہوا تو شہر کے سب سے اچھے اسکول میں ایک ہزار روپے بلڈنگ فنڈ میں دے کر داخلہ دلوایا۔ پانچویں کلاس سے ہی ٹیوشن دلانے لگا۔ بیٹے کو ڈاکٹر بنانے منصوبے باندھنے لگا۔ بیٹا اچھے قد اور کاٹھی کا تھا گیہواں رنگ، سر پر گھنے گھنگریالے بال، اس کے ہاتھوں پر بھی گھنے بال تھے۔ اسے یقین تھا کہ لڑکا ڈاکٹر بنے گا۔ بچپن میں سرکاری اسپتال کے ڈاکٹروں کو دیکھا تھا وہ بڑے وجیہہ ہوتے تھے اور ان کے ہاتھوں پر گھنے بال ہوتے تھے اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ڈاکٹر وجیہہ ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں پر گھنے بال ہوتے ہیں۔

بیٹا ایس۔ ایس۔ سی میں سیکنڈ کلاس پاس تو ہو گیا تھا لیکن کالج میں اس کی توجہ کورس کی کتابوں سے ہٹتی گئی فلم اور ڈراموں میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ اچھے اچھے اور قیمتی کپڑوں کا شوق بڑھا، اسکوٹر کے لیے ضد کرنے لگا۔ وہ ان فرمائشوں پر روک لگانا چاہتا تھا، اسے محنت کا عادی بنانا چاہتا تھا اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ آرام طلبی علم کی راہ کا بڑا روڑا ہے یہی وقت ہے کہ دل لگا کر پڑھے فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرے۔ لیکن بیٹا اس کی باتوں پر دھیان ہی کہاں دیتا تھا پھر ماں کی حمایت بھی اسے حاصل تھی اور چاہتے ہوئے بھی اسے بیٹے کی فرمائشوں کی تکمیل کرنا پڑتی تھی، وہ کڑھتا رہتا اور بیوی اسے ڈراتی رہتی کہ بے جا سختی کی گئی تو لڑکا باغی ہو جائے گا یا گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، جیسا وہ چاہتا تھا ویسا ہو نہیں رہا تھا۔ بیٹا کالج چھوڑ دینا چاہتا تھا اور کاروبار میں تبدیلی چاہتا تھا۔ ٹائپ رائٹنگ انسٹی ٹیوٹ بند کر کے آفسٹ پرنٹنگ پریس لگانے کا مشورہ دے رہا تھا، اخبار نکالنا چاہتا تھا اور کتابیں چھاپنا چاہتا تھا، بینک اور فنانس کارپوریشن سے قرض لے کر کاروبار پھیلانے کا مشورہ دے رہا تھا

وہ ان اُلجھاؤں میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ جب بھی بیٹا کاروباری بات چھیڑتا وہ بھڑک اٹھتا تھا۔ اس مسئلہ پر دونوں میں اکثر جھگڑا ہوا کرتا۔ ماں بیٹے کی طرف داری کیا کرتی تھی۔ وہ ذرا اونچی آواز میں اختلاف کرتا تو بیٹا اس سے بھی اونچی آواز میں جواب دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بیٹے کو جھڑکتا تو بیوی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور بیٹا غصہ میں بڑبڑا کر باہر چلا جاتا۔ یہ ڈرامہ کئی دنوں سے چل رہا تھا۔ لیکن اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس دن ناشتے کی میز پر لڑکے نے پرنٹنگ پریس کی بات چھیڑ دی تھی، ہمیشہ کی طرح اس نے مخالفت کی تھی، بات بڑھ گئی تھی اور وہ غصہ میں انسٹی ٹیوٹ چلا آیا تھا۔ کام زیادہ تھا اس لیے دوپہر کو بھی گھر نہیں گیا تھا۔ رات کو گھر پہنچا تو لڑکا غائب تھا۔ بیوی نے بتایا کہ دوستوں کے ساتھ کسی تفریحی پروگرام میں گیا ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے لڑکا آیا تو اس نے دروازہ کھولا تھا اور دیر سے آنے پر ڈانٹا بھی تھا۔ بیٹے نے بدتمیزی سے جواب دیا تو دو طمانچے بھی لگا دیئے تھے اور لڑکا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو لڑکا غائب تھا۔ الماری کا لاکر کھلا پڑا تھا اور چار ہزار روپے اڑا لیے گئے تھے۔ بیوی نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ وہ بیٹے کے دوستوں سے پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ کہیں سے پتہ نہ چل سکا۔ قریب کے دیہاتوں میں اپنے ملنے والوں کے یہاں بھی جا کر دیکھ آیا تھا۔ بیوی کو روتا دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتا۔ لڑکے سے بچھڑنے کا اسے بھی دکھ تھا لیکن بیوی کی طرح وہ رو تو نہیں سکتا تھا۔ رات میں بستر پر لیٹے لیٹے بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے کبھی اس کے تصور کی آنکھ دیکھتی کہ بڑا شہر ہے لوگوں کا ہجوم ہے کہ بیگانہ وار گزرتا جا رہا ہے، پریشان، حیران بیٹا کھڑا ہے چہرے پر نقاہت ہے، بھوک سے چکرا کر گر رہا ہوتا ہے کہ کوئی تھام لیتا ہے، محبت کے بول بولتا ہے، روٹی کھلاتا ہے، رہنے کو جگہ دیتا ہے، کام دیتا ہے

بیٹا من لگا کر کام کر رہا ہے، رات دن کسی انسٹی ٹیوٹ میں بھی جاتا ہے، فریڈ کو رس کر رہا ہے کہ تصور ٹوٹ جاتا ہے اور حقیقت کا سامنا ہوتا ہے جو تصور سے یکسر مختلف تھی۔ کبھی کبھی عود کے اور بیٹے کے فرار ہونے کے حالات کا موازنہ کرتا تو اس بات سے تسلی ہوتی کہ بیٹے کے پاس روپے ہیں، وہ تو خالی ہاتھ تھا۔ بیٹا اس کے مقابلے میں صحت مند اور وجیہہ ہے، فرفر انگریزی بولتا ہے، کسی بھی جگہ فٹ ہو سکتا ہے۔ جب محنت کر کے کمانے لگے گا تو اسے احساس ہوگا کہ روپیہ کمانے میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے اور جسمانی مشقت کے بعد روٹی کھائی جائے تو اس کا ذائقہ ہی بدل جاتا ہے۔ روپے جانے کا اسے غم نہیں تھا بلکہ وہ روپیوں کو بیٹے کو راہ راست پر لانے کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ حقائق کی بھٹی میں آگ سے تپ کر نکلے گا تو وہ کندن ہو جائے گا۔

لیکن بیوی کو وسوسوں نے ہلکان کر دیا تھا۔ کسی نے چاقو گھونپ کر اسے ہلاک نہ کر دیا ہو، جیب کترے نے روپے نہ اڑا لیے ہوں، بیٹا بھوکا پیاسا بھٹک رہا ہوگا، اس کا چہرہ کمہلا گیا ہوگا، گھبرا کر خودکشی نہ کر بیٹھے۔ ملاؤں اور نجومیوں کے گھروں کے پھیرے لگا رہی تھی، ٹونے ٹوٹکے کرنے والوں کو بلا رہی تھی، درگاہوں پر جا کر منتیں مانگ رہی تھی، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

اس رات بھی بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ لپک کر دروازہ کھولا، لڑکا ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری لیے کھڑا تھا۔ بیٹے نے جھک کر سلام کیا تو وہ اس سے لپٹ گیا۔ بیوی بھی دوڑتی ہوئی آئی اور بیٹے کو لپٹا کر رونے لگی۔ بیٹے نے رک رک کر کہا "سوری ممی، سوری پاپا! آپ لوگوں کو بتائے بنا ہی بمبئی چلا گیا تھا۔ دراصل میں یہاں کے ماحول سے اکتا گیا تھا سو چلا گیا تھا۔ پاپا! بمبئی میں میں نے ایک اچھی آفسٹ پرنٹنگ مشین دیکھی ہے۔ اس کے بارے میں لٹریچر بھی لے آیا ہوں اور کچھ ٹریننگ بھی لے چکا ہوں۔ اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔" "میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں بیٹے" اس نے رندھے گلے سے کہا اور آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گیا۔

شہر حیات

خلیفہ

کتنی عجیب ہے یہ زندگی۔ نہ جانے کتنے روپ ہیں اس کے کبھی عالیشان محلوں، تفریح گاہوں میں اپنی تمام رعنائیاں لٹاتی، قہقہے بکھیرتی نظر آتی ہے تو کبھی رنج و الم سمیٹے کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید ہو جاتی ہے کبھی مسکراہٹوں تو کبھی آنسوؤں میں ڈھل جاتی ہے یہ زندگی۔ اب آپ ہی دیکھیے نا کچھ لوگ کس چین سے ایرکنڈیشنڈ کمروں میں زندگی کا لطیف احساس کرتے ہوئے اپنی عمر کے حسین لمحے گزارتے ہیں تو چلچلاتی دھوپ میں ــــ تیز بارش کے درمیان یا سخت سڑکوں پر ــــ تپتے ہوئے کھیتوں کھلیانوں میں لڑتے لڑتے گزرتی ہے کچھ لوگوں کی زندگی۔

اب یہی دیکھیے، سورج پہاڑیوں کے پیچھے نہ جانے کب کا چھپ چکا ہے پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ چکے ہیں، دن بھر کے دکھڑے دھندے کے بعد تھکے ہارے انسان بھی اپنے گھروں میں واپس آ گئے ہیں، شام گہرا چکی ہے رات شروع ہونے والی ہے مگر ابھی تک اس چھوٹے سے شہر آرہ کے ریلوے سٹیشن پر ڈٹا ہوا ہے خلیفہ ــــ جب تک شٹل نہ آجائے وہ یہاں سے ہلے گا ہی نہیں ــــ بس انتظار کرتا رہے گا کسی پسنجر کا ــــ مگر کیوں؟ آخر کیوں؟ تاکہ وہ زندگی سے لڑنا چاہتا ہے۔ اپنی محنت کے سہارے اپنی زندگی کے تاریک گوشے روشن کرنا چاہتا ہے۔

آپ خلیفہ کو جانتے ہیں؟ ضرور جانتے ہوں گے، وہ آپ کو آرہ کی ہر

سڑک پر نظر آسکتا ہے اپنے جھجاتے ہوئے رکشے کی پیڈل پر تیزی سے پیر مارتے ہوئے شہر کے بازاروں، دفتروں، اسکولوں اور کالجوں تک بھاگتا ہوا۔ گورا رنگ، مگر دھوپ سے جل کر ماند پڑ گیا، چہرہ، دراز قد، دبلی پتلی کایہ، چوڑے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی، بے ترتیب بال — یہی تو ہے اس کا پورا حلیہ — ایک پرانی نیکر اور بوسیدہ سی گنجی میں ملبوس وہ ہر وقت بھاگتا رہتا ہے۔ شاید بھاگتے رہنا ہی اس کی زندگی ہے — بھاگتے رہنا بھاگتے رہنا —

آج گرمی شباب پر ہے۔ اس نے اپنے گمچھے سے پسینہ پونچھ کر پلیٹ فارم کی طرف نظر دوڑائی، شاید ٹرین آنے میں ابھی دیر ہے۔ تھوڑا آرام کر لیا جائے اس نے سوچا اور اپنے کے بجائے رکشے کی نئی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا تھوڑی دیر میں ہی اس کے کانوں کے بالکل قریب کسی دوسرے رکشے کی گھنٹی جھنجھنا اٹھی۔ اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں سامنے گنیش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"کا ہو کھلیپھا بھیا سو گئے تھے کا ہو؟" گنیش نے مسکرا کر سوال کیا تھا اُس سے۔

"نا ہو گنیش بھائی، ایسے ہی آنکھوا بند کیے تھے۔" مسکرا کر ہی جواب دیا تھا خلیفہ نے۔

"تنی کھینی بناؤ نا بھیا" گنیش نے تمباکو کا مطالبہ کیا۔

خلیفہ نے نیکر کی گانٹھ سے کھینی اور چونے کی ڈبیہ نکالی اور اپنی ہتھیلی پر کھینی کے چھوٹے چھوٹے چونے کے ساتھ ملنے لگا۔

"اَوَر، نا گنیس کا حال چال ہے؟" اس نے گنیش کی خیریت دریافت کی۔

"کا حال بتائیں ہو — حالو تو کھرابے ہے، ہمکی سسری روج رکھ

بڑھتی جا رہی ہے۔ چاول، دال، آٹا، مسالہ سب تو مہنگے ہو گیا ہے بھائی کا کھائے آدمی، کا پیئے کا کرے ——"

"ہاں ہو بھائی۔ ٹھیک کہتے ہو، جینا مشکل ہو گیا ہے اب تو —— ایک تو ای مہنگائی برداس سے باہر ہے دوسرے روج روج دنگا فساد۔ سن سن کے جی گھبرا گیا ہے۔" خلیفہ نے گنیش کے خیال کی تائید میں اپنی بات رکھی۔

"کا بھائی! کا گھر پر چل رہا ہے؟" پاس آتا ہوا ہردیا آہستہ سے بولا۔

"کچھ نا ہو، ایسے ہی دکھ سکھ بتیا رہے تھے۔" خلیفہ نے کھینی ٹھونکتے ہو جواب دیا پھر چٹکی بھر کھینی ہردیا اور گنیش کو بانٹنے کے بعد باقی بچی کھینی اس نے اپنے ہونٹوں تلے دبا لیا۔

"کھلیپا بھائی، بچیا کا کا حال ہو —— کچھ سدھار ہوا کہ نہیں؟" ہردیا نے اس کی بیمار بچی کی خیریت دریافت کی۔

"ابھی تک بخار نا اترا بھائی، دھیرے دھیرے کمجور ہوتی جا رہی ہمری حالت کھرابے ہوتی جا رہی ہے —— کا بتاویں —— اتنا پیسہ بھی نہیں کہ جم کر کوئی بڑا ڈاکٹر سے علاج کراویں" —— اچانک خلیفہ کی اداس آنکھوں کی اداسی مزید گہری ہو گئی اور چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔

"نا بھیا! جیسے بھی ہو، بڑھیاں ڈاکٹر سے دکھاؤ نا تو لڑکی ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائے گی۔" گنیش نے اس بچی کے لیے اپنی تمام ہمدردیاں اُنڈیل کر رکھ دیں۔

"ہاں" خلیفہ نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا "اچھا ڈاکٹر سے دکھانے کے واسطے پیسو تو ہونا چاہیے بھائی —— کوسس تو بہت کر رہے ہیں، بجا اور باہر کے دکان سے کچھ کھانا پینا بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ اوہی پیسوا بچے تو بچے کے کام آوے۔ کچھ پیسا اکٹھا بھی ہو گیا ہے، آج ڈاکٹر بدلنے کا کھیال ہے بھائی

اور بولتے بولتے خلیفہ کی اداس آنکھوں میں بخار سے تپتی پانچ سال کی [illegible]
سی بچی منی کا چہرہ ابھر آیا ـــــ "بابا! ہم کب اچھا ہوں گے؟" کتنی بار [illegible]
چکی تھی منی یہ سوال اس سے، اور ہر بار اس معصوم سوال نے اس کو اندر
تک ہلا دیا تھا۔ کتنا درد چھپا تھا اس سوال میں، کتنی تڑپ تھی اس [illegible]
تو وہ اور صرف وہ ہی کر سکتا تھا۔ مگر اندر سے تڑپ کر پھر بھی خاموش رہ جاتا
تھا خلیفہ ـــــ کوئی جواب نہیں دے پاتا تھا اپنی معصوم بچی کو جو پچھلے بیس
دنوں سے بخار سے مسلسل تپ رہی تھی ـــ جسم لگاتار جلتا اور تپتا رہا تھا بیس
دنوں سے آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں، چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔
ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور ان پر پپڑیاں جم گئی تھیں، سارا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ
بن گیا تھا ان بیس دنوں میں۔ اور وہ محلے کے باہر سڑک پر ہومیو پیتھک ڈاکٹر
بنرجی صاحب کی دکان کی دو روپے والی پڑیا سے کام چلائے جا رہا تھا کیا
کر سکتا تھا بیچارہ، اگر دن بھر کی کمائی منی کی بیماری میں لگا دیتا تو گھر کے
سب لوگ کیا کھاتے ـــ بھوکوں نہیں مرنا پڑتا سب کو۔ اسی لیے دو روپے
کی پڑیا پر اب تک اکتفا کرتا رہا تھا وہ۔ ڈاکٹر بنرجی بتلا رہے تھے کہ منی کو ٹائیفائڈ
ہو گیا ہے۔ کڑی سے کڑی دوا دے رہے تھے ڈاکٹر بنرجی، مگر کوئی فرق نہیں
پڑ رہا تھا۔ مرض کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہا تھا اور روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی
تھی اس کی بچی۔

"اے جی! بڑھیاں ڈاکٹر سے دکھا دے بنا نا اچھی ہوگی ہری بچی۔" کہہ رہی
تھی بیوی اس سے۔ تب وہ کیا کرے ـــ شہر کے کسی بڑے انگریزی ڈاکٹر
سے دکھا دے منی کو ـــ مگر شہر کے بڑے ڈاکٹروں کو دکھانے کے لیے تو تھیلی
کی بڑی تھیلی بھی چاہیے نا۔ اس کی بیوی لاڈلی تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ بس
ایک بار کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جاؤ، اور ایک سلسلہ بن جاتا ہے [illegible]
کراؤ، پیشاب پاخانہ کی جانچ کرواؤ، ایکسرے کراؤ، بیوٹی [illegible]

جانچ وانچ کے چکر میں خرچ کرو تب جاکر نسخہ لکھیں گے ڈاکٹر صاحب، اور تب جاؤ بازار میں دوائیاں خریدنے اور دیکھو دوائیوں کی قیمت ـــــ خدا کی پناہ ـــــ سو روپے سے کم میں دوائیاں مل ہی نہیں سکتیں بازار میں۔ روپیوں سے جیب بھری ہو تب جاکے بات بنتی ہے۔ ایک چھوٹی سی شیشی کے بھی پندرہ بیس روپے لگ جاتے ہیں۔ اب بھلا اس کے پاس اتنے سارے پیسے ایک ساتھ کہاں سے آئیں گے۔ پھر وہ کیا کرے؟ اپنی پھول سی بچی کو یونہی موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھتا رہے؟

"کا ہو کھلیپا بھیا کہاں پہنچ گئے کچھ سوچے گے کا بھائی؟" ہردیا نے ٹوکا تو چونک پڑا خلیفہ۔

"اوں ـــــ ہاں ہو نہی سوچنے لگے تھے" اس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

تبھی اسٹیشن کے مائیکروفون سے پٹنہ صاحب بکسر شٹل کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ ہردیا اور گنیش دونوں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"اچھا ـــــ اب ہم چلتے ہیں کھلیپا بھیا، بھگوان تیری بچیا کے جلدی اچھا کرے" اور دونوں اپنے اپنے رکشوں کی طرف بڑھ گئے۔

کچھ ہی منٹوں میں شٹل پلیٹ فارم نمبر دو پر آ لگی تھی۔ ٹرین سے اتر کر لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

"کیوں بھئی، گوپال چوک چلو گے؟" ایک مسافر خلیفہ سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں مالک، جرور ـــــ جرور چلیں گے"

"کتنے پیسے لوگے؟"

"بس تین روپے"

اور مسافر رکشے پر بیٹھ گیا تھا۔ رکشے کو اسٹینڈ سے باہر نکال رہا تھا خلیفہ۔ کبھی بھی سواری ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا رکشہ سب سے

صاف ستھرا اور سجا سجایا رہتا ہے۔ مسافر خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ رکشے کا مالک ہمیشہ ایک نیا رکشہ اس کے ذمے لگائے رکھتا ہے اور وہ بھی تو بڑی تندہی سے رکشے کی صفائی اور دیکھ بھال کیا کرتا ہے۔ رکشے کے پیڈل، فریم، گھنٹیاں، سیٹ اور پردے سب چم چم چمکتے رہتے ہیں۔ بہت محنتی ہے خلیفہ، یہ بات مالک اچھی طرح سمجھتا ہے۔

اس نے رکشے کو موڑا۔ اب اس کا رکشہ اسٹیشن سے شہر کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہا تھا۔

آج گرمی بھی کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھی اور ہوا چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ عجیب حبس اور گھٹن کا احساس فضا میں گھل گیا تھا۔ پسینہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سچ مچ برسات کی گرمی بڑی پریشان کن ہو جاتی ہے۔ آدمی ایکدم سے بے چین ہو جاتا ہے۔ بار بار اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ رہا تھا خلیفہ۔ کبھی پسینے سے ایسے شرابور ہو چکی تھی جیسے وہ ابھی دھو دی گئی ہو۔ نچوڑ دو تو ڈھیروں پانی نکل آئے۔ ایسے میں رکشہ کھینچنا بڑی جانفشانی اور دل گردے کا کام ہو جاتا ہے۔ اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں مگر آج بھی اسٹیشن سے سواری لے کر چل پڑا تھا خلیفہ۔ اس کے پیر پیڈل پر تیز تیز چل رہے تھے ماتھے سے نکلتا پسینہ آنکھ اور منہ میں داخل ہونے لگتا تھا۔

"پانی نہیں برس رہا ہے، ای گرمی تو جانے لے لے گی" وہ خود ہی بڑبڑایا تھا۔

آج ہر حالت میں وہ اپنا کام جلد ہی نپٹا کے گھر جانا چاہ رہا تھا۔ شاید آج منی کو ڈاکٹر سے دکھانا تھا اسے۔ لاڈلی بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی گھر پر — گھر — ہاں لفظ گھر پر اسے یاد آیا تھا۔ باپ دادا کا بنایا ہوا اس کا اپنا ایک گھر بھی ہے اس آرہ شہر میں۔ میر گنج بستی کے نزدیک — جہاں

بدبو، گندے پانی، کوڑے کے ڈھیر اور سڑاندھ پیدا کرتی نالیوں کے بیچ ایک گھر ـــ ایک گھر جس کی دیواریں مٹی کی ہیں، مٹی کا ہی فرش ہے اور چھپر پھوس کے مٹی کی ٹیڑھی میڑھی دیواروں سے بنے مرغی خانے جیسے فقط دو مدد کمرے ہیں اس گھر میں جن میں صرف سیلن اور بدبو ہے کیونکہ نہ باہر کی ہوا آتی ہے ان میں نہ سورج کی روشنی۔ برسات میں چھپر کا ہر سوراخ خوب کھل جاتا ہے اور سیلاب آجاتا ہے ان کمروں میں شام کے ہوتے ہی مچھروں کی فوج کونوں، کھدروں سے نکل کر یلغار کر دیتی ہے اور آفتاب کے نکلتے ہی شروع ہو جاتا ہے مکھیوں کا خطرناک حملہ۔ ہاں اس گھر کے دوزخ میں تو اس کی بیوی، لاڈلی بیٹی منی، اور چھوٹا بیٹا عبدل سب زندگی کا عذاب جھیل رہے ہیں۔ مگر اس کا خاندان ہی اس دوزخ کو نہیں جھیل رہا ہے۔ اس کے ہی جیسے ہیں یہاں کے سارے لوگ ایسے ہی کوڑے کے ڈھیر، گندے پانی اور سڑاندھ پھیلاتی نالیوں کے بیچ جی رہے ہیں سب کے سب۔ اس چھوٹی سی بستی میں اگر پانی کہیں نظر آتا ہے تو صرف گندی نالیوں میں ورنہ پانی کے ایک گھڑے کے لیے محلہ کے باہر سڑک پر کافی دور کے نل پر جاتے ہیں بستی کے لوگ۔ اگر بارش ہو جائے تو ندی بن جاتا ہے پرنالہ اور رستے پر ہی بہنے لگتا ہے۔ پھر اسی میں کھیلتے ہیں بستی کے بچے ـــ اسی میں تیرتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف اچھال کر خوش ہوتے ہیں۔ پھر یہ پانی غلاظتوں کے ڈھیر چھوڑ کر سرک جاتا ہے اور پھر گندگی اور سڑاندھ میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ گندگی، یہ سڑاندھ ان کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے جسے جھیلتے جھیلتے ان کے بچے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں۔

پتہ نہیں کیا ہوا، نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ رکشے کے بریک پر خود بخود [illegible] اور وہ سامنے آتے ہوئے ٹم ٹم سے ٹکرا ہی جاتا خلیفہ ٹم ٹم والا [illegible] نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ کچھ

سا سوچے گا۔ کہیں ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو؟

اچانک رکشے نے ایک زور کا جھٹکا کھایا اور مسافر گرتے گرتے بچا۔ اندھیرے
سڑک کے کسی خود ساختہ گڑھے میں اتر گیا تھا رکشے کا اگلا چکر۔ اس نے
سنبھال نہیں لیا ہوتا تو زبردست حادثہ ہو سکتا تھا۔ مسافر کے ہاتھ
رتو ٹوٹ ہی سکتے تھے۔

"ایک تو شہر کا سب سڑک کھراب ہے اوپر سے بجلیو نہیں رہتی ہے
۔ پتہ نہیں اس سہر کا کونو مائی باپ بھی ہے کہ نہیں۔" شہر کی بدتر حالت
جھلا گیا تھا خلیفہ۔

"کیوں بھئی ایسا کیوں ہے؟ یہ تو بڑا پرانا اور تاریخی شہر ہے۔" مسافر
اس سے خرابیٔ حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اب کا بتائیں مالک۔ ای سہر کا تو حالے کھراب ہے۔ بابو کنور سنگھ اور
ب جیون بابو کا علاقہ ہے۔ بڑے بڑے لوگ ایمیسر منتری ہوئے ہیں
اں، مگر آج تک سہر کے بارے میں کسی نے کچھو نہیں سوچا۔ سب سرکاری
بسر اٹھے کے دار مل کر پیسہ کھا جاتے ہیں۔ سڑک آدھا سودھا مرمت ہوتی
ے۔ سب کام کاغج پر ہی ہو جاتا ہے۔ کوئی دیکھنے والا ہو تب نا۔ سڑک ٹوٹی
ئی ہے۔ نالا کا گندہ پانی ایسے ہی سڑک پر بہتا رہتا ہے۔ بھائی لوگ پینٹ
جامہ اٹھا کر سڑک پار کر جاتے ہیں۔ کیچڑ میں جہاں تہاں پیر گھس جاتا ہے۔
رانیچ سڑک پر یونہی پڑا رہتا ہے پر گندگی اور چوپٹ حالت کے واسطے
ئی آواج نہیں اٹھاتا ـــــ پتہ نا کیسا سہر ہے لوگ سب چیج برداشت کرتا
، پر جبان نہیں کھولتا۔ اسپتال ہی چلے جائیے۔ آپ جیسا مجبوت آدمی جائے
تو بیمار ہو کر لوٹے گا ـــــ اور کتنا بتائیں مالک ـــــ بجلی کو دیکھیے ایسے
روج دن کٹتی ہے مگر کبھی کبھی بیس بیس گھنٹہ غائب رہتی ہے تو بھی کوئی
پوچھنے والا نہیں۔"

تبھی گوپالی چوک آگیا تھا۔ مسافر نے رکنے کا اشارہ کیا تو خلیفہ کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"بس، یہیں روک دو" مسافر نے کہا۔

اس نے دھماکر کے رکشے کو روک دیا۔ مسافر سے گن کر تین روپے لیے اور آگے بڑھ گیا۔ بے وجہ اس کی نظر گھنٹہ گھر کی طرف اٹھ گئی تھی۔ مونچھ والا کڑک ٹریفک کانسٹبل وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور آگے جانے والی سڑک کی طرف چل پڑا۔

"کھلیپا بھیا، رام رام — کھلیپا بھیا، سلام" کئی آوازیں ایک ساتھ اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ دینو، کشن، بھیکو، شبراتی، سب رکشے والے اسے سلام کر رہے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کے سلام کا جواب دیا اور خیریت دریافت کی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا بھائی لوگ؟"

"ہاں بھیا، سب دیا ہے اوپر والے کی"۔۔

اپنے ہم پیشہ رکشے والوں میں بے حد مقبول تھا خلیفہ۔ ان کی خوشی، غم دکھ سکھ، سب میں وہ یکساں طور پر شریک ہوتا تھا بلکہ بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا۔ شہر کے سارے رکشے والے اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سب پیار کرتے تھے اسے۔

اب وہ گوپالی چوک سے چترلولی روڈ کی طرف مڑ گیا تھا۔ تالاب پر جائے گا وہاں اس کے مالک سراج میاں کا گیراج ہے وہاں رکشہ جمع کرے گا دستے میں کئی سواریاں ملیں مگر سب سے انکار کرتا رہا تھا خلیفہ۔ اسے رکشے جمع کر کے گھر پہنچنا ہے۔ آج پھر شٹل کے لیٹ ہو جانے سے اسے گھر آنے میں دیر ہو گئی تھی سلاڑی انتظار کر رہی ہوگی۔ جب بازار سے آٹا چاول اور مسالہ خرید کر گھر پہنچتا ہے تو کہیں چولہا سلگتا ہے اس کے گھر کا۔

ن بھر کی کمائی وہ ان سامانوں کی شکل میں ہر روز گھر لے جاتا ہے تب ہی
م اور دوسرے دن کے کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ ایک دن کسی وجہ سے
یماری کے چلتے وہ گھر بیٹھ جائے تو ایک دانہ نصیب نہیں ہوتا کسی کو۔

اب گاڑی جمع کرنے اور مالک کے ہاتھ میں بارہ روپے رکھنے کے بعد
دکو بالکل ہلکا محسوس کر رہا تھا خلیفہ۔ مگر پیٹ میں کافی ہنگامہ مچا ہوا
ا بھوک کا۔ آج کل وہ گھر کے علاوہ باہر کی کوئی چیز بھی نہیں کھا رہا
ا تاکہ پیسے بچیں۔ بھوک کی یاد آتے ہی اس کے قدم کافی تیزی سے بازار
ی طرف بڑھنے لگے۔

اب وہ میوہ لال بنیے کی دوکان پر کھڑا اپنے سامان کی تفصیل
ٹ کروا رہا تھا۔

"تین کلو آٹا، دو کلو چاول، آدھ پاؤ کڑوا تیل، دو پیے کا سب مسالہ
یہو میوہ بھیا:

پیسے چکانے کے بعد ہاتھ میں سامان کی پوٹلی لٹکائے وہ بغاتی سبزی
ش کے اسٹال کی طرف لپکنے کے انداز میں بڑی تیزی سے بڑھا۔

"بھاتی بھیا! ایک آلو پاؤ بھر، پیاج او پاؤ بھر بیگن تول دو" اس
دور ہی سے آواز لگائی۔

سبزیاں خرید کر وہ کمانی کی چائے کی دوکان کی طرف چل پڑا، ایک
ب گرما گرم چائے پینے۔ شہر کی سب سے اچھی اور سستی چائے ملتی ہے یہاں۔
زانہ کا معمول ہے اس کا۔ ہر شام وہ اسی طرح شٹل کی سواری چھوڑنے
بعد گیراج میں رکشہ بند کرتا ہے، رکشہ مالک کو کرایہ ادا کرتا ہے اور سیدھا
تا ہے بازار کی طرف، وہاں سے چاول، مسالہ، سبزی وغیرہ خرید کر کمانی
یہاں چائے پیتا ہے پھر گوپالی چوک پر نیاز پان والے کے یہاں سے
ڑی خریدتا ہے اور رگھو کی دوکان سے کھینی ۔۔۔ بس اسے اور کسی چیز

نشے کی عادت نہیں۔ دوسرے رکشے والوں کی طرح وہ گانجہ یا شراب کبھی نہیں پیتا۔ آخر اسے اپنے بچوں کی پرورش بھی تو کرنی ہے، اپنے خاندان کے لیے روٹی مہیا کرنی ہے اسے۔ اس کے ساتھی زبردستی بھی کریں تو ہاتھ جوڑ لیتا ہے خلیفہ — اور اس طرح کھینی بیڑی وغیرہ خرید کر وہ سرپٹ بھاگتا ہے اپنے گھر کی طرف۔ مگر راستے میں کہیں بڑی بڑی مونچھ والا پیکڑ ٹریفک کانسٹبل منوہر سنگھ مل جائے تو — تو شامت آجاتی ہے اس کی۔ وہ جتنا بھی کٹ کر نکلنا چاہے منوہر سنگھ اسے دیکھ ہی لیتا ہے اور دبوچ لیتا ہے اسے کسی باز کی طرح۔

"ارے کھلیپھوا! ادھر آؤ۔ آج کتنا کمایا ہے رے — لگتا ہے ڈھیر پیسہ ملا ہے — چل ہمارا حصہ نکال!"

ایسے ہی الفاظ سے منوہر ہمکلام ہوتا ہے اس سے۔ خلیفہ چپ چاپ اس کی ہتھیلی پر پانچ روپے رکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیا کرے۔ بچارہ۔ اگر بحث کرے تو بھیجہ چاٹ جاتا ہے بڑی بڑی مونچھوں والا یہ بدمعاش کانسٹبل۔ اگر اسٹیشن سے چوک تک رکشہ چلاتا ہے تو اس موٹے شرابی پولیس والے کو خوش رکھنا ہی پڑے گا۔ سب رکشے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ سب سلامی دیتے ہیں اس موٹے رشوت خور کو۔ جو سلامی نہ دے اس کی مرمت کر دیتا ہے منوہر سنگھ۔ پھر اس ماہ پیٹ کی کہیں بھی جا کر شکایت کرو، کوئی سنوائی نہیں۔ الٹا رکشہ بھی تھانے میں بند کرا دیا جاتا ہے۔ اب کون لڑے اس بدذات سے روزی روٹی بند کروانے کے واسطے۔ نتھو کہتا تھا کہ منوہر وا کی پہنچ اوپر تک ہے بڑے صاحب تک حصہ پہنچاتا ہے منوہر وا۔ سارا دن رکشہ، ٹم ٹم، بس، ٹرک، ٹیمپو والوں سے پیسہ وصولتا رہتا ہے یہ منوہر سنگھ۔

"بابا! ہم کب اچھا ہوں گے؟" کانوں میں پھر جاگ اٹھا ہے منی کا معصوم سوال۔ کانپ گیا خلیفہ اندر سے۔ جیسے تیسے چائے ختم کی۔ فوراً گھر پہنچنا ہے

پھر ڈاکٹر کے یہاں لے جانا ہے منی کو۔ چائے کے پیسے چکانے کے بعد کل تیس روپے بچ گئے تھے جیب میں۔ ان روپیوں میں کچھ کل اور کچھ آج کی کمائی کے ہیں۔ گھر پر اور بیس روپے بچا کر رکھے تھے اس نے۔ کل پچاس روپے ہوئے اتنے میں شاید دوا کا کام ہو جائے۔ بچ گئی ڈاکٹر صاحب کی فیس تو اپنی پہچان کے ڈاکٹر شریواستو جی سے دکھا دے گا بچی کو۔ امید ہے ڈاکٹر صاحب فیس نہیں لیں گے اس سے۔ بہت بھلے انسان ہیں ڈاکٹر بھاسکر شریواستو۔ اور پھر اس نے بھی تو ان کا بہت بڑا کام کیا تھا۔ سو سو روپے کے نوٹوں سے بھرا بیگ خود ان کے گھر جا کر لوٹا آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو رینگتی ہوئی ٹرین کو پکڑنے کے لیے بدحواس ہو کر بھاگے تھے اور بیگ رکشے کی سیٹ پر ہی پڑا رہ گیا تھا۔ خلیفہ نے تو گنا بھی نہ تھا کہ کتنے پیسے تھے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر بیگ لوٹا آیا تھا۔ پہلے بھی تو کتنی بار وہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم کو گھر تک چھوڑنے گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر تو اس کا دیکھا بھالا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب خود اس سے ملنے آئے تھے اور اسے کچھ انعام دینا چاہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا "ای تو ہمارا پھرج تھا ڈاکٹر صاحب" اور کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا اس نے۔

"کوئی بھی ضرورت ہو تو بے جھجک چلے آنا۔" ایسا یقین دلایا تھا اس کو ڈاکٹر صاحب نے۔

تو وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جائے تو وہ ضرور اس کی بچی کو اچھی طرح سے دیکھیں گے فیس بھی نہیں لیں گے، ہو سکتا ہے اپنی طرف سے دوائیں بھی دیدیں ڈاکٹر صاحب۔ اگر نہ بھی دیں تو کیا تھوڑا تھوڑا کر کے وہ خود ہی خرید لے گا۔

ایسی ہی نہ جانے کتنی باتیں سوچتا گھر کی طرف لوٹ رہا تھا خلیفہ۔ اس کے ننگے پیر کیچڑ بھرے راستے پر تیز تیز چل رہے تھے۔ اچانک اس کے [illegible] کسی نے چھوا۔ اس نے پیچھے کی طرف گردن گھمائی۔ منوہر سنگھ [illegible]

"کیوں بے سالے ـــ آج بھی بنا سلامی دیے ہی بھاگ رہا تھا ـــ یاد ہے چار دن سے کچھ نہیں دیا ہے تو ـــ بیٹا ـــ آج دھرائے ہو ـــ" منوہر سنگھ کے منہ سے شراب کی بدبو پھوٹ رہی تھی۔

"ناجور ـــ ہم بھاگ نا رہے تھے ـــ آپ ہی کے پاس آ رہے تھے ـــ آپ ہی کے پاس ہی آ رہے تھے مالک ـــ" اچانک نازل ہونے والی اس آفت سے گھبرا گیا تھا خلیفہ۔

"چل مال نکال" منوہر نے پیسے کا مطالبہ دہرایا تھا۔

"آپ سے ایک بات کرنا تھا ـــ ایک بنتی کرنا تھا حجور"

"ابے کا بنتی پھنتی لگا رکھا ہے۔ رے ـــ جلدی بول"

"ای کہہ رہے تھے مالک ـــ آج پھر ہم کو ماپھ کر دیں"

"کیوں بے؟" ـــ آنکھیں تر بتر کر بولا تھا منوہر۔

"حاکم! ہمری چھوٹی والی بچی منی بہت جادہ بیمار ہے ـــ ڈاکٹر صاحب سے دکھا کے دوائی لینا ہے ـــ بس ابھی جا ہی رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس ـــ آج بھر ماپھ کر دیں ـــ بس آجے بھر" گڑگڑانے لگا تھا خلیفہ۔ اس کے چہرے سے عجیب سی بیچارگی ٹپک رہی تھی۔

"ارے سسرا! تو روج روج کوئی نہ کوئی بہانہ بناتا رہتا ہے، کل کسی کا اُدھار چکانا تھا تو آج دوائی لانا ہے ـــ سالا! ـــ چار دن ہو گئے کچھ نہیں دیا ہے تو ـــ دیکھ اب جادے جدمت کر ـــ چپ چاپ سے بیس روپے نکال چار دن کے ـــ نہیں تو سمجھ لے میرا نام بھی منوہر سنگھ ہے ـــ ایک دن اندر کر دیا تو نانی یاد آجائے گی تیری" اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کہہ رہا تھا منوہر سنگھ۔ وہ زبردستی پر اُتر آیا تھا ایکدم سے۔

"بس آجے بھر ـــ کل سب جوڑ کر دے دیں گے ـــ سب بقایا نکر دیں گے مالک"

"ابے بیکار بحث لڑائے جا رہا ہے تو ——"

اور بات پوری ہونے سے پہلے منوہر نے زور کا دھکا دیا تھا۔ لڑکھڑا گیا تھا خلیفہ۔ سامان کی پوٹلی زمین پر گر پڑی تھی۔ ٹھوکا پھٹ جانے سے سارا چاول اور آٹا ایک دوسرے میں مل گیا تھا۔ تیل کی شیشی زمین پر گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ سارا تیل کیچڑ میں بہہ گیا تھا۔ اس افراتفری میں روپے گنجی کی جیب سے باہر جھانکنے لگے تھے۔ منوہر کی شاطر آنکھیں روپیوں کو تول رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ آگے بڑھا تھا اور سارے روپے خلیفہ کی جیب سے اس کی پینٹ کی جیب میں منتقل ہو گئے تھے۔ خلیفہ کے چہرے پر مایوسی اور غصے کے اثرات نمایاں ہو رہے تھے مگر وہ پھر بھی گڑگڑائے ہی جا رہا تھا۔

"نا مالک! ایسا ظلم مت کریئے —— بیٹی مر جائے گی ہماری۔"

تمام رکشے، ٹم ٹم والے ارد گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اب منوہر روپیوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ خلیفہ نے اس کے پیر پکڑ لیے تھے۔

"حاکم! ایسا کٹھور نا بنیئے۔"

"ہاٹ ——" اس نے ایک بار پھر بڑے زور کا دھکا دیا تھا خلیفہ کو۔

"مالک! ای پیسہ ہم ایسے ہی نہیں جانے دیں گے —— اس میں ہماری بیٹی کی زندگی چھپی ہے —— ای پیسہ ہم کو لوٹا دو مالک۔" وہ جھلا گیا تھا۔

"اچھا! —— تو اب کو مار کھانے کا من ہوا ہے سالے —— ہٹ جا میرے سامنے سے، اور سن میرے پیچھے مت آنا نہیں تو مار مار کر بھیجہ نکال دوں گا۔" ڈنڈا دکھاتے ہوئے بولا تھا منوہر۔

اب منوہر واپس جا رہا تھا اور خلیفہ اسے مایوسی سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"بابا! ہم کب اچھا ہوں گے؟" بجلی کی تیزی سے کوندا تھا منی کا یہ سوال اس کے ذہن میں اور کسی ہتھوڑے کی طرح چوٹ مارتا ہوا اس کے دل و دماغ کے ٹکڑے کرنے لگا تھا —— یہ تیس روپے چلے گئے تو گھر پر پڑے صرف بیس

روپیوں میں وہ منی کا علاج کیسے کر سکے گا ــــ کیسے خرید سکے گا دوائیاں منی کا آخر بخار کیسے اترے گا ــــ اس طرح تو بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی اس کی بچی اور وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا ــــ اپنی کمزوری کے باعث کچھ نہیں کر سکے گا وہ ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جنازے کا منظر ابھر آیا تھا۔ لوگ کسی بچے کو سفید کفن میں لپیٹے قبرستان لے جا رہے تھے۔ تو کیا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا ــ واقعی مر جائے گی اس کی بچی ــــ نہیں ــــ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا ــ چھین لے گا وہ منوہر سے سارے روپیے ــــ چاہے جو انجام ہو وہ لڑے گا اس بے انصافی کے خلاف ــــ آخر وہ روپیے اس کے ہیں، اس کے پسینے کی کمائی کے ہیں یہ روپیے۔ ان پر صرف اس کا اور اس کے بال بچوں کا حق ہے۔ انھیں کوئی غیر چھین لے یہ برداشت نہیں کرے گا وہ ــ ہرگز برداشت نہیں کرے گا ــــ

اور اس نے دوڑ لگائی تھی۔ منوہر کو اس نے پکڑ لیا تھا۔ اس کا ہاتھ جھنجھوڑتے ہوئے وہ بول رہا تھا:

"اب چاہے جو ہوئے مالک ــ ای پیسہ ہم نہیں جانے دیں گے" نہ جانے کہاں سے اتنی خود اعتمادی آگئی تھی اس کی آواز میں۔

"ابے پھر آگیا ــ نہیں مانے گا تو؟" اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا منوہر

"نہیں ــــ ہرگز نہیں ــــ"

"تو ــ لے ــــ سنبھال ــــ"

ایک دم سے پاگل ہو گیا تھا منوہر۔ انداز ایکدم جارحانہ بن چکا تھا خلیفہ کی پیٹھ، ہاتھ، پیر اور سر پر جگہ جگہ تڑا تڑ برسنے لگا تھا اس کا ڈنڈا۔ چوٹ کھا کر تلملا گیا تھا خلیفہ مگر کوئی آہ اس کی زبان سے باہر نہیں نکلی تھی چپ چاپ پٹ رہا تھا وہ۔ ایک وار بڑے زور سے سر پر پڑا تھا۔ وہ اپنا سر پکڑے

زمین پر گر پڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ بھیڑ میں عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی۔ دو نوا ور شبراتی بھیڑ سے باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے اسے سہارا دے کر زمین سے اٹھا دیا تھا۔ منوہر سنگھ نے دیکھا تھا بھیڑ کی ہر آنکھ سے اس کے لیے نفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔

پتہ نہیں کیا ہوا تھا اچانک اس تھوڑے سے وقفے میں، نہ جانے کیسے سنبھل گیا تھا خلیفہ۔ کون جانے کہاں سے طاقت آگئی تھی اس کے لاغر سے جسم میں۔ شاید اس کے اندر سے اٹھنے والی آواز ہی اسے قوت پہنچا رہی تھی شاید کوئی اس سے کہہ رہا تھا "خلیفہ! تم کمزور ضرور ہو۔ بزدل نہیں ہو۔ اکیلے بھی نہیں ہو۔۔۔ آؤ۔۔۔ ہمت کرو۔۔۔ پھر ظلم کی اس چٹان سے ٹکرا جاؤ۔۔۔ اس کے سامنے گڑگڑانے سے کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ سب کا جینا مشکل کر دیا ہے اس پاپی نے۔۔۔ اٹھو۔۔۔ کوشش کرو اور مکتی دلاؤ سب کو اس وحشی سے۔۔۔ تم لڑو۔۔۔ جنگ کرو اس کائیر سے۔۔۔ روز روز کی جھنجھٹ سے تو بہتر ہے کہ ایک دن ہی اچھی طرح نمٹ لیا جائے۔۔۔ سوچو مت۔۔۔ اسے مارو خلیفہ۔۔۔ اسے مارو۔۔۔ اسے۔۔۔"

اب خلیفہ کا سپاٹ اور بیجان چہرہ حیرت انگیز طریقے سے تبدیل ہو چکا تھا۔۔۔ اس کی شکل انتہائی خوفناک ہو گئی تھی۔۔۔ غصہ، نفرت اور انتقام، سارے جذبے ایک ساتھ پھوٹ رہے تھے اس کے چہرے سے۔۔۔ بجلی سی کوندنے لگی تھی اس کے جسم میں، رگوں میں آگ سی بھر گئی تھی۔ وہ بڑھا تھا اور ایک ہی جھٹکے سے منوہر کا ڈنڈا اب اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ منوہر پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا خلیفہ۔ اس کے ہاتھ مشین کی سی تیزی سے چل رہے تھے۔ کلوک مونچھوں والا کانسٹیبل اب وار کرنے کی جگہ "ارے! ارے" کر کے وار بچا رہا تھا۔۔۔ کچھ ہی دیر میں ٹوٹ گیا تھا لکڑی کا ڈنڈا۔ مگر اس کا غصہ نہیں ٹوٹ سکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زوردار دھوبیا پاٹ مارا تھا اس

نے منوہر کو ـــــ منوہر زمین پر چت پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بھی جاری تھا۔ اس نے بیہوش منوہر کی طرف ایک حقارت بھری نظر ڈالی تھی اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔ اب وہ اپنی چیتھڑی گنجی سے اپنے چہرے کا خون صاف کر رہا تھا۔ پوری بھیڑ اسے تحیر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اچانک بھیڑ کے درمیان سے آواز اُبھری تھی "بھاگو" اور عجیب سی بے چینی پھیل گئی تھی ہر فرد میں۔ پولیس کی ایک تیز رفتار جیپ بھیڑ کے قریب آکر رک گئی تھی۔ بڑے صاحب ڈی۔ ایس۔ پی اپنی بڑی سی توند لیے برآمد ہوئے تھے۔ ساری بھیڑ پر انھوں نے اپنی قہر آلود نگاہ ڈالی تھی۔ پھر سناٹے میں ان کی گرجدار آواز گونجی تھی۔

"ٹریفک کانسٹبل منوہر سنگھ کو کس نے مارا ہے؟"

سارے چہرے خاموش تھے۔ عجیب سناٹا طاری تھا ماحول پر۔ ایک بار ساری بھیڑ کا چکر پورا کر کے انھوں نے اپنا سوال پھر دہرایا تھا۔

"بتلاتے کیوں نہیں تم لوگ ـــــ منوہر سنگھ کو کس نے مارا ہے؟"

اقبالِ جرم میں پہلے ایک ہاتھ اوپر اٹھا تھا۔ پھر کئی ہاتھ اٹھے تھے اور چند ہی لمحوں میں ساری بھیڑ کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ بڑے صاحب سکتے میں آگئے تھے وہ حیران حیران نگاہوں سے بھیڑ کو دیکھ رہے تھے۔

میرا ماضی میرے کاندھے پر

کیفی اعظمی

اب تمدن کی ہو یہ جیت کہ ہار
میرا ماضی ہے ابھی تک میرے کاندھے پہ سوار

آج بھی دوڑ کے گلے میں جو مل جاتا ہوں
جاگ اٹھتا ہے میرے سینے میں جنگل کوئی
سنگ ماتھے پہ اُبھر آتے ہیں

پڑتا رہتا ہے میرے ماضی کا سایہ مجھ پر
دورِ خوں خواری سے گزرا ہوں چھپاؤں کیونکر
دانت سب خون میں ڈوبے سے نظر آتے ہیں

جن سے میرا نہ کوئی بَیر نہ پیار
اُن پہ کرتا ہوں مَیں وار
اُن کا کرتا ہوں شکار
اور بھرتا ہوں جہنّم اپنا

پیٹ ہی پیٹ سراسیم ہے، دل و دماغ
کتنے اوتار بڑھے لے کے ہتھیلی پہ چراغ
دیکھتے رہ گئے دھو پائے نہ ماضی کا یہ داغ

مل لیا ماتھے پہ تہذیب کا غازہ لیکن
بربریت کا جو تھا داغ وہ چھوٹا ہی نہیں
گاؤں آباد کیے شہر بسائے ہم نے
رشتہ جنگل سے جو اپنا تھا وہ ٹوٹا ہی نہیں

جب کسی موڑ پہ پرکھوں کے اُڑتا ہے غبار
جانے ہو جاتا ہے کیوں سر پہ جنوں ایک سوار
کسی جھاڑی سے اُلجھ کر جو کبھی ٹوٹی تھی
وہی دم پھر سے نکل آتی ہے
وہی لہراتی ہے

اپنی ٹانگوں میں دبا کے جو بھرتا ہوں زقند
اُتنا گر جاتا ہوں صدیوں میں ہوا جتنا بلند
اب تمدن کی ہو یہ جیت کہ ہار
میرا ماضی ہے ابھی تک میرے کاندھے پہ سوار

تصویر: بادام علی / مدیا کارپن

سانپ

کیفی اعظمی

یہ سانپ آج جو پھن اٹھائے مرے راستے میں کھڑا ہے
پڑا تھا قدم چاند پر میرا جس دن
اسی دن اسے مار ڈالا تھا میں نے
اُکھاڑے تھے سب دانت، کچلا تھا سر بھی
مروڑی تھی توڑ دی تھی کمر بھی

مگر چاند سے جھک کے دیکھا جو میں نے
تو دم اُس کی ہلنے لگی تھی
یہ کچھ رینگنے بھی لگا تھا

یہ کچھ رینگتا کچھ گھسٹتا ہوا
پرانے شوالے کی جانب چلا
جہاں دودھ اس کو پلایا گیا
پڑھے پنڈتوں نے کئی منتر ایسے
یہ کم بخت پھر سے جلایا گیا

شوالے سے نکلا وہ پھنکارتا
رگِ ارض پر ڈنک سا مارتا
بڑھا تیں کہ اک بار پھر سر کچل دوں
اسے ساری قدموں سے اپنے مسل دوں
قریب ایک ویران مسجد تھی
مسجد میں یہ جا چھپا

جہاں اس کو ہوں سے غسل دے کر
حسین ایک تعویذ گردن میں ڈالا گیا
ہوا جتنا صدیوں میں انساں بلند
یہ کچھ اس سے اونچا اچھالا گیا

اچھل کے یہ گرجا کی دہلیز پر جا گرا
جہاں اس کو سونے کی کینچل پہنائی گئی
صلیب ایک چاندی کی سینے پہ اس کے
ہوں کا گلوبند گردن میں ڈالا
اور اس دھج سے میدان میں اس کو نکالا
دیا جس نے دنیا کو پیغامِ امن
اسی بے حیات آفریں نام پر
اسے حق باری سکھائی گئی

پڑا اس کا ذہرتی پہ سایہ

تو دھرتی کی رفتار رکنے لگی
اندھیرا اندھیرا زمیں سے فلک تک اندھیرا
جبیں چاند تاروں کی جھکنے لگی

ہوئی جس سے سائنس زر کی مطیع
جو تھا علم کا اعتبار اٹھ گیا
اور اس سانپ کو زندگی مل گئی

اسے ہم نے صحاک کے بھاری کاندھے پر دیکھا تھا اک دن
یہ ہندو نہیں ہے، مسلماں نہیں
یہ دونوں کا مغز اور خوں چاٹتا ہے

بنے جب یہ ہندو مسلماں، انساں
اسی دن یہ کم بخت مر جائے گا۔

اس سہ ماہی کا منتخب کارٹون

"اسپین" دہلی کے
شکریے کے ساتھ

آج میں مکمل طور پر کرپٹ ہو گیا

غزل

راہی معصوم رضا

سب ڈرتے ہیں، آج ہوس کے اس صحرا میں بولے کون
عشق ترازو تو ہے، لیکن اس پہ دلوں کو تولے کون

سارا نگر تو خوابوں کی ارتھی لے کر شمشان گیا
دل کی دکانیں بند پڑی ہیں، دل کی دکانیں کھولے کون

کالی رات کے منہ سے ٹپکے، آنے والی صبح کا خون
سچ تو یہی ہے، لیکن یارو، یہ کڑوا سچ بولے کون

لوگ اپنوں کے خوں میں نہا کر، گیتا اور قرآن پڑھیں
پیار کی بولی یاد ہے کس کو، پیار کی بولی بولے کون

مرثیہ عہدِ اُمید

علی عباس اُمید

موم دل سنگ پہ اُبھرے ہوئے اس شہر کی
تعمیر جدید
سنگ دل موم کی مرہون ہوئی

یاد ایام نے آئینۂ دل توڑ دیا
ایک حسرت ہے جو تصویر دکھا جاتی ہے
قصۂ درد سنا جاتی ہے

موسم گل جسے سمجھے تھے وہی عہدِ جنوں
(وقت و حالات کی آوارہ نگاہی کا فسوں)
ہنستے ماحول کے پہلو میں بنا سوز دروں
— اور پھر فاصلوں کے پھیلتے صحراؤں میں
ماعقہ دست بڑھا
صاف اور شفاف سا اک شعلہ اٹھا
آنکھیں بجھنے لگیں، دل لرزا، جگر کانپ گیا
روح پر زخم لگا، درد اٹھا
ضبط کی کوشش بسیار پہ بھی شہر طرب چیخ پڑا

شہر کی چیخ میں تھا کرب مگر
مگر کیا ہوتا
(بے بسی کو بھی ملا ہے کہیں زخموں کا صلا!)
بن گئی شہر کی وہ چیخ بھی گنبد کی صدا

ٹوٹتے فاصلے کچھ اور بھی ٹوٹے، وسعت
بڑھ گئی اتنی کہ دانش کے امیں
بے طلب فاصلوں کے دکر سے کترانے لگے
کاسۂ دست میں سر کو لیے، ہونٹوں کو مقفل کر کے
خالی الذہن، مگر فکر کو یکجا کر کے
موند کر آنکھیں یہ سوچا کیے
اک صبح یا پھر شام کوئی آئے گی
جب کہ دیرینہ نفس ساز طرب کی لے پر
عیش کے زمزمے چھیڑے گا
چراغاں ہوگا

اور سراد بج حیات

چتر لہرائیں گے
آسائش دیرینہ کے ہات
فصلِ صد رنگ کے چہرے سے ہٹے گا گھونگھٹ
دوپہر
اور اگر آگ بکھر گئی تو ماحول کے خنکے سوتے
دستِ قدرت کا کوئی معجزہ لہرائے گا
سایۂ ابرِ رواں کا آنچل

یہ تفکر تھا فقط سعیٔ گراں
اور تفکر کی بھی تفسیر کوئی ہوتی ہے
صبحِ آلام کی تقدیر کوئی ہوتی ہے
دھند کی لوح پہ تحریر کوئی ہوتی ہے
سوچ کے خواب کی تعبیر کوئی ہوتی ہے

اُن کا یہ خواب بھی بس خواب رہا
خواب کی دھرتی پہ تعبیر کا پودا نہ اُگا
رت بدلتی رہی، دن جاتے رہے، کچھ نہ ہوا

وقت کے دشتِ پنہاں کے طفیل
سازِ مضروب ہوئے، نغمے بھی مجروح ہوئے
غنچۂ گل میں اٹھا تیرہ و تاریک غبار
۔۔۔ بوئے بس ہوئے جاگتی قدروں کے محل
جل گئی آتشِ حالات میں دل کی کونپل

موم دل سنگ کے اس شہر میں
ہر گام پہ ریزوں کی بساط
پھول سے پاؤں کو گلنار بن جاتی ہے
جس طرف دیکھیے آتش کدۂ دست میں شعلوں کی زباں
چاٹتی رہتی ہے تاریخ کا جسم
اور نگل جاتے ہیں ماضی کے حقائق کے طلسم

ارتقاء دیکھیے
اس شہر کی سمتوں کی حدوں
دستِ عفریت کی مانند کچھ اس طرح بڑھیں
روح محکوم ہوئی اور وہ حاکم ٹھہریں
نور و نکہت کے سبھی خواب،
وہ سرفاب،
وہ بہتا ہوا آب
نخلِ تہذیب کے پھولوں کی شگفتہ نکہت
کیفِ صہبائے سکوں،
غنچۂ دل کی راحت
سب کی سب آہنی زنجیروں میں محبوس ہوئیں
جینے سے مایوس ہوئیں

یہ تضرع، یہ گھٹن
کرب کی آگ میں جلتے ہوں رشتوں کے بدن
گرمی ایسی کہ قیامت کا یقیں ہوتا ہے

نفسی نفسی کا یہ عالم کہ سرِ راہ گزر
آشنا چہرہ، رفیقِ سحر و شام کوئی
جادۂ عظمت دیرینہ کا ناکام کوئی
اپنی ہی طرح اسیرِ غم و آلام کوئی
بھول کر بھی نظر آئے تو مسائل کو نوید
اس کے مل جانے کی لمحاتی مسرت پہ
برافروختہ ہو کر یکسر
خنجرِ مصلحتِ وقت اٹھا لیتے ہیں
اور مل بیٹھنے کی خواہشِ موہوم
(جو معصوم بھی مظلوم بھی ہے)
اس کی شہ رگ کو قطع کرتے ہیں
اجنبی شخص سمجھتا ہے، بھلا دیتا ہے
اور کبھی دوست کی مانند ملا دیتا ہے

سم چشیدہ سا تبسم ہے، بریدہ فن ہے
سر قلم کا بھی قلم ہو چکا الفاظ کی راکھ
اپنے ہی عہد کی تاریخ کے زخموں پر
گزرے ایام کی تہذیب کے شہ پاروں پر
لذتِ زیست کے پچھلے سبھی معیاروں پر
دستِ امروز نے مل ڈالی ہے
غازہ کی طرح

پیکرِ غم تکلم ہے، خموشی کا طلسم
منجمد ہیں پتھر کے سینے کی طرح
جتنی بھی ٹھیس تھیں اُن سب کو بھلا کر یکسر
شب کا تنہائی کا، ماحول کی یکتائی کا
فن کا، گویائی کا
امید کی رسوائی کا
جائزہ لیتا ہے — پھر بجھتے دیئے کی مانند
جشنِ شب دیکھتا ہے، ہونٹوں کو سی لیتا ہے
ساغرِ درد لبِ روح سے پی لیتا ہے
"تو ہے لب بستہ جو تھا ذہن کے در کی دستک
میں ہی پابستہ ہوں — آوارہ ہوا تھا کل تک
وہ ہے یخ بستہ جسے کہیے فضاؤں کی چمک

رات کے بند کواڑوں پہ کبھی آس کی صبح
اب تو دستک بھی نہیں دیتی کہ
ذہنوں کی تھکن
خود فراموشی کی بانہوں کا سہارا لے کر
چند لمحوں کے لیے خوابوں کے صحراؤں میں
زرد ٹیلے پہ کھڑی ہو کے
نظر کے لب سے
چوم لے چاند کے رخساروں کو
اور انگڑائیاں لیتے ہوئے کہساروں کو

آج وہ مہکے ہوئے دن کہ جو تھے

رشک کے باعث کل تک
اونگھتے کھانستے دم توڑتے لوگ
گردشِ وقت سے مرنے کی دعا مانگتے ہیں
(ہائے کیا چاہتے ہیں!)

رات کی زلف بکھر جاتی ہے جب تا بہ کمر
چپ کے آنچل کے تلے
بل کے شہر اور قمر
جوڑ کر ہاتھوں کو با دیدۂ تر
تا بہ سحر
مالکِ کل سے اجابت کی دعا کرتے ہیں
جاں کنی ختم ہو
دن کی
یہ کہا کرتے ہیں

فکر امروز و شب و روز کے غار
برگِ فطرت پہ پگھلتے ہوئے لوہے کی پھوار
ایک اک پل کی بھی آنکھیں،
فسردہ رخسار
خشک ہونٹوں پہ
کسی عقدۂ دشوار کی گرد
کانپتے ہاتھوں میں
روٹھے ہوئے ایام کا درد

ذہن کی سطح کو چھوتا ہوا اک لمحۂ سرد
آج آئینۂ ماحول کا صیقل ہیں یہی
روز و شب چاک ہیں
اور چاک کا محور ہیں یہی

دشتِ ماحول میں کہرام ہے
کہرام پہ تعزیریں ہیں
ظل کی
اور
غار کی
اب ایک سی تقدیریں ہیں
نفسِ مفہوم بدلتی ہوئی تحریریں ہیں
آج بھی جن کا ہے گل پوش
وہ تعمیریں ہیں
پیرہن دھند کا پہنے ہوئے تنویریں ہیں

موم دل سنگ کے اس شہر کی تہذیب و
تمدن کی بہار
سبزۂ کیف — جسے کہیے غرورِ کہسار
حسنِ فطرت کی پھبن، لمحوں کی عشرت کا خمار
آج دیرینہ روایت کے سوا کچھ بھی نہیں!
کسی بوسیدہ حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں!!
کچھ بھی نہیں۔۔

غزل

نشتر خانقاہی

یہ ارض بے بہا، اس رُت میں بنجر ہو گئی شاید
گل زر خیز مبری، نذرِ صرصر ہو گئی شاید

سلیقہ صارفینِ شہر سے سیکھوں، معیشت کا
مروّج اب یہاں تہذیب دفتر ہو گئی شاید

بھٹکتے پھر رہے ہیں، شہروں میں بیٹے کسانوں کے
تقاوی کھیت کی قیمت سے بڑھ کر ہو گئی شاید

تعلق اپنے گھر سے ہے، نہ ہمسائے سے رغبت ہی
طبیعت اب زمانے سے مکدّر ہو گئی شاید

یہاں سب اپنے اپنے دائروں میں قید ملتے ہیں
یہ محتاجی تو اس بستی میں گھر گھر ہو گئی شاید

تشدّد کی خبر وحشت تاسّف تک نہیں بنتی
مری حالت تو اب پہلے سے بدتر ہو گئی شاید

گھرانے کتنے ہی مجبور دیکھے کوچ کرنے پر
یہ ہجرت خاندانوں کا مقدّر ہو گئی شاید

تیوہار

جاوید اختر

آج اس شہر میں ہر شخص ہراساں کیوں ہے؟
چہرے کیوں فق ہیں
گلی کوچوں میں
کس لیے چلتی ہے خاموشی
آشنا آنکھوں پہ بھی
اجنبیت کی یہ باریک سی جھلی کیوں ہے
شہر سناٹے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ملزم سا نظر آتا ہے
اتفاق کا کوئی رہگیر گذر جاتا ہے
خوف کی گرد سے کیوں دھندلا ہے سارا منظر
شام کی روٹی کمانے کے لیے
گھر سے نکلے تو ہیں کچھ لوگ مگر
مڑ کے کیوں دیکھتے ہیں گھر کی طرف
آج بازار میں بھی
جانا پہچانا سا وہ شور نہیں
سب یوں چلتے ہیں کہ جیسے یہ زمیں کانچ کی ہے
ہر نظر نظروں سے کتراتی ہے
بات کھل کر نہیں ہو پاتی ہے
سانس روکے ہوئے ہر چیز نظر آتی ہے
آج یہ شہر اک سہمے ہوئے بچے کی طرح
اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرتا ہے
جنتری دیکھو
مجھے لگتا ہے
آج تیوہار کوئی ہے شاید۔

غزل

منظر سلیم

جلتی سُلگتی چیختی شہروں سے جاتی ہے ہوا
صحرا سے مل مل کے گلے آنسو بہاتی ہے ہوا

حیراں، پریشاں، نیم جاں، دریا کے اوپر لوٹتی
شعلوں کے جبر و قہر کا قصہ سُناتی ہے ہوا

پیڑوں کو سمجھاتی کہے کا ہے کا یہ کالا دھواں
شاخوں کو ان کی ماتمی کپڑے پہناتی ہے ہوا

چیخیں اُڑاتی دشت میں گلیوں کے مل جاتی کی
سانپوں درندوں کو لہو پیروں دُلاتی ہے ہوا

پھولوں کے چہروں پر لکھی دہشت کو پڑھتی سوچتی
غاروں میں تازے خون کی بو کو چھپاتی ہے ہوا

آہوں سے اپنی چونکتی کچھ طائروں کے بال و پر
گیتوں کو ان کے مرثیہ خوانی سکھاتی ہے ہوا

اے رقیب یہ دل کس طرح شمار کرے

حسن عابد

اے رقیب یہ دل کس طرح شمار کرے
جو شخص میری طرح تیرے غم سے پیار کرے
ترے خیال کے پیکر سجائے شعروں میں
ترے جنوں میں رہے تیرا انتظار کرے
ترے قصیدے لکھے برگِ برگِ تارہ پر
غزل کے پھول ترے حسن پر نثار کرے
سجائے راہِ تمنّا لہو کے رنگوں سے
تمام جادۂ جاں منظر بہار کرے
پلک پلک سے چُنے دلنواز تیروں کو
تمام راہ کے کانٹے گلے کا ہار کرے
نسیمِ شوق سے تازہ رکھے گلِ دشت
خود اپنے ہاتھ سے دامن کو تار تار کرے
جلو میں لے کے چلے حوصلے شہیدوں کے
گلوئے عشق کو خنجر سے ہم کنار کرے
عدو کے خوف سے جو بات کوئی کہہ نہ سکے
اسی کا ذکر سرِ عام بار بار کرے
بڑھائے ہاتھ اگر کوئی پھول کی جانب
تو اُس کے قلب میں پیوستِ نوکِ خار کرے
درازِ دستِ ہوس ہو تو شعلۂ گل سے
سزا یہ دے کفِ گل چیں کو داغدار کرے
ہم اُس کے حوصلۂ دل کی داد دیتے ہیں
جو اِس دیار میں رہ کر بھی تجھ کو پیار کرے

غزل

اُویس احمد دوراں

نہ جانے کون سی شے مجھ میں ہے چھپی ایسی
جہاں جہاں میں گیا حاسدوں کی فوج ملی

میں نرم لہجہ کا، دھیمے سروں کا شاعر تھا
زمیں پر ظلم بڑھا دشمن بدل گئی میری

مرے چمن کے غزالو! تمہیں سلام مرا
تمہارے دم سے مری فکر سربلند ہوئی

بڑا اُداس، بہت سوگوار ہے موسم
کئی دنوں سے لبوں پر ہنسی نہیں آئی

ترے غرور کا مجھ کو جواب دینا تھا
وگرنہ میری طبیعت انا پسند نہ تھی

کچھ آج ہی نہیں صدیوں سے بے اماں ہے یہ
اگرچہ کہنے کو عالم پناہ ہے دلّی

ہزاروں وار ہوئے تجھ پہ قبل بھی لیکن
دُکھی سماج تو اتنا کبھی نہ تھا زخمی

فسادیوں کا جلوس آ رہا ہے رک جاؤ
شرارت آگ کے گولے غرور پھینکے گی

نشان ڈھونڈھ رہا ہوں مگر نہیں ملتا
یہیں کہیں پہ مری پیاری ماں کی تربت تھی

دعائیں دیجیے گلشن کے سربراہوں کو
انھیں کے حکم سے اردو زباں قتل ہوئی

یہ غزلوں کی ہیں ویران بستیاں دوراں
دکھائی دیتی ہیں تم کو جو ڈوبی ڈوبی سی

آزاد غزل

حرمت الاکرام

اُس دیئے سے کہ ہے محراب تمنا روشن
عمر تا عمر رہا، نام کسی کا روشن
ہوئی توسینے کی مدھم اتنی
زجبیں پر ہے اجالا نہ ہے چہرہ روشن
یاد آتا ہے مجھے دیکھ کے مسجد کا چراغ
میں نے بھی دل میں کیا تھا کوئی شعلہ روشن
جانے کس اور چلی چھوڑ کے سورج کو سرِ بامِ افق
رات سے ہو نہ سکا صبح کا رستہ روشن
ہوئے سیراب تو کیا پاؤ گے : بجھ جاؤ گے، ہو جاؤ گے راکھ
پیاس کی آگ سے رہتا ہے سراپا روشن
کیا جلاتا کوئی کشتی میں چراغ
موجیں ٹکرائیں — مواسینۂ دریا روشن
محلوں کو جس سے شکایت رہی اس کٹیا میں
ایک مٹی کا دیا تھا روشن
بٹ گئی اہلِ ہوس میں مہ و خورشید کی اجلی سوغات
کیسے روشن ہو کوئی راہ گزر، کیسے ہو دنیا روشن
آگ شعلوں کی بھی سینوں کی بھی تھی جنگل میں
دیکھنے آئے تھے ہم — شہر ہے کتنا روشن ؟
دل کو جلنے کا سلیقہ ہی نہ آیا حرمت
ورنہ کب ہوتا ہے ایسا کوئی شعلہ روشن !

غزل

شجاع خاور

دونوں بالکل چپ رہتے ہیں خوب زمانہ سازی ہے
شہرِ خرد میں دیوانہ ہے شہرِ جنوں میں قاضی ہے

جینا کہتے ہیں جس کو اس کھیل میں ہم ماہر تو ہیں
ہار گئے تو قسمت اپنی جیت گئے تو بازی ہے

سچی باتیں برسوں پہلے جوشِ جنوں میں لکھ دی تھیں
بعد میں ہم نے جو لکھا ہے سب انشا پردازی ہے

اپنی مرضی کے رستے پر جاؤں تو کیسے جاؤں
آگے آگے مستقبل ہے پیچھے پیچھے ماضی ہے

سمجھوتہ کروا ہی دیا ہے آخر دور اندیشی نے
دیکھو اب میں بھی زندہ ہوں اور دنیا بھی راضی ہے

اپنی باتیں اپنی کتابیں بے مطلب سی لگتی ہیں
کام کا کوئی لفظ نہیں ہے ہر معنی اعزازی ہے

علیل کاغذ قلم کانب جامنی اندھیرا

جینت پرمار

علیل کاغذ کے آسمانوں میں
شبد کے بیج بو رہا ہوں
قلم کا نب سے ٹپکتا ہے جامنی اندھیرا
تمہارے دل کی پرت ہوں لیکن
وصال کی انگلیوں نے اب تک پڑھا نہ مجھ کو
شہر نے اپنے بدن پہ کتنے لباس بدلے
صدا کا سورج نہ لوٹا واپس
نظر میں کالے سوال روشن
علاء میں خواہش کی دھوپ چسپاں
خلوص کا بلب بجھ چکا ہے
شعور کا ہاتھ چھل رہا ہے شریر بچا
سفید پرچھائیوں کے ناخن
کھرچتے ہیں خواب رُت جگوں کے
ندی کی آنکھوں کا نیلا پانی تو مر چکا ہے
شکستہ لمحوں کی مٹھیاں کھول دے نہ کوئی
علیل کاغذ!
قلم کا نب!!
جامنی اندھیرا!!!

جینت پرمار

ہوا کی پسلی کو توڑ کر آ رہی ہے باہر
جلتی چمڑی کی گندھ
عذاب تن میں
عذاب من میں
پھٹی ہوئی کھوپڑی نے آواز دی تو چونکا
صدا کے گہرے کنوئیں میں جھانکا
کوئی بھی چہرا نظر نہ آیا
سیاہ ٹھنڈی ہواؤں کے ہاتھ
میری گردن کو بھینچتے ہیں
سفید عینک میں تیرتے ہیں
وہ دھندلے چہرے
تھوہڑ کا جنگل اگا ہوا ہے
سراب آنکھوں کی پتلیوں میں
اب اپنے رشتے کا دیپ جانم
بجھا بجھا ہے۔

سیپ، کوڑی، تتلیاں، سائے، شجر روشن ہوئے
معجزہ اس کا کہ شب کے بام و در روشن ہوئے
آج کیوں مٹی ہمارے خون کی پیاسی ہوئی
سارے رشتے بجھ گئے نیزوں پہ سر روشن ہوئے
زرد شاخوں پر ہوائیں مرثیہ گانے لگیں
خواب کی تاریک گلیوں میں کھنڈر روشن ہوئے
شام کو جب اس کی یادیں ڈھونڈ کر لائیں ہمیں
میز پر کاغذ، قلم سوچوں کے پر روشن ہوئے
کان کو اچھی لگیں کچھ دیر کرتب بازیاں
تہہ بہ تہہ کھلتے گئے عیب و ہنر روشن ہوئے

بشیر بدر

گئے دن وصل کی خوشبو سمیٹے لوٹ آتے ہیں
کبھی دریا پڑھے دونوں کنارے لوٹ آتے ہیں
کوئی بھی چیز دنیا میں ہمیشہ تو نہیں رہتی
مگر یہ دھوپ ڈھلتے ہی سائے لوٹ آتے ہیں
مرے مالک ہر اک شے پر تری رحمت کا جادو ہے
تری آواز سن کر سبز پتے لوٹ آتے ہیں
ندی کی ریت میں جب ننھے بچے کھیلتے دیکھوں
کناروں پر وہ بچپن کے گھروندے لوٹ آتے ہیں
سنا جو داستانوں میں وہ سب جھوٹا نہیں ہوتا
سنہرے سات گھوڑوں پر سویرے لوٹ آتے ہیں

جینت پرمار

غزلیں

اختر بستوی

مجوانِ فن ہمیشہ یہ سزا پاتے رہے
"تاج" کی تخلیق کرکے ہاتھ کٹواتے رہے

شرطِ ناکردہ گناہی یاد تھی کس کو بھلا؟
لوگ بیدردی سے پتھر پہ برساتے رہے

آگیا شعلہ گروں کی صف میں اُن کا ذکر بھی
برف پر چنگاریاں رکھ کر جو سلگاتے رہے

کنکروں کا بھاؤ سن کر عہدِ نو کے جوہری
موتیوں سے جھولیاں بھر بھر کے پچھتاتے رہے

رہروانِ دشت خوفِ مرگ کو پی کر سرپھرے
زندگی کے شہر تک مرمر کے پہنچاتے رہے

فوج اک اختر تمہارے ذہن میں خوابوں کی تھی
عمر بھر تم جس کی پسپائی سے گھبراتے رہے

نظمیں

اختر بستوی

۱۔ ساتھی

میرے قدموں نے چُنی تھی جو ڈگر اپنے لیے
حکمراں حدِ نظر تک اُس پہ تھیں ویرانیاں
دوسرا رہرو نہ آتا تھا نظر میرے سوا
دل پہ تھا حاوی اکیلے پن کا احساسِ گراں
ذہن کی سانسیں بھی تھیں یہ سوچ کر اُکھڑی ہوئی
بانٹ لے جو بارِ تنہائی کوئی ایسا نہیں
راستے کا ایک پتھر ناگہاں یہ بول اٹھا:
"میں ہوں تیرے ساتھ، تو اِس راہ میں تنہا نہیں"

۲۔ وقت کے قدم

جن کے پھیرے تھے کھنڈر میں اُن ہواؤں نے کہا:
"وقت کی رفتار کا انجام ویرانی ہے کیوں؟"

اس پہ بولی گرد: "میں اس مسئلے کے رُخ کئی
اک یہی پہلو بھلا وجہِ پریشانی ہے کیوں!
میرے بارے میں بھی سوچو، وقت ٹھہرے یا چلے
قایم و دایم ہمیشہ میری یکسانی ہے کیوں؟"

۳۔ میرا نقشِ جمیل

تلخیٔ کام و دہن دنیا سے جو مجھ کو ملی
جھلکیاں اس کی نہ آئیں کچھ مری تحریر میں
ظلمتِ بغض و حسد چھائی رہی ہر سو مگر
خود کو چمکایا ہے میں نے پیار کی تنویر میں
گھر کے یوں نفرت میں بھی، الفت کا ہوں نقشِ جمیل
جیسے گوتم بدھ کی مورت سایۂ شمشیر میں

۴۔ خامشی

درحقیقت خامشی معراج ہے گفتار کی
اس سے بہتر کوئی بھی صورت نہیں اظہار کی
ہو گئی ہے نطق کی ہر ہر ادا جب بے اثر
میں نے دیکھا ہے طلسم خامشی کو کارگر
خامشی ایسے بھی لمحوں کی کہانی کہہ گئی
جن میں گویائی پشیمانی اُٹھا کر رہ گئی

غزل

وجاہت علی سندیلوی

بزم میں تیری بہ اندازِ جنوں کوئی تو ہے
اب حریفِ نازِ چشمِ پُر فسوں کوئی تو ہے

کیسے سمجھوں بے تعلق میرے دل سے تم ہوئے
موجبِ حیرانیِ وجہِ سکوں کوئی تو ہے

تیغ و خنجر دیکھتا ہوں، دستِ قاتل ہے چھپا
حکم سے جس کے بہا ہے میرا خوں کوئی تو ہے

تاک کر پتھر نہ آتے اِس طرح میری طرف
میرے اس شہرِ جنوں میں بے جنوں کوئی تو ہے

آگیا ہے میرا قاتل یا پلٹ آیا رفیق؟
کھول دوں پٹ؟ آہٹیں کب تک سنوں؟ کوئی تو ہے

کیا ہمیں فریاد کا حق بھی نہیں باقی رہا
تم نہیں گر باعثِ حالِ زبوں کوئی تو ہے

بجھ گئی وہ شمع بھی جو آخری دمساز تھی
تھا ارادہ حالِ دل میں بھی کہوں کوئی تو ہے

جوالا مکھی

چندر بھان خیال

یہ بوڑھا وندھیاچل ہے امیں
ہر رات اندھیروں سے تنہا لڑنے والا
وہ باپ مرا
ہر صبح نہا دھو کر دیوی کے مندر میں
زرّیں جل ہاتھوں میں لے کر
کہتا تھا ماں سے — بیٹا دے
وہ بیٹا جو جوان ہو کر
اُس کے بوڑھے انگوں کی بو کی جوالا پر
ایسے ہی شیتل جل چھڑکے
اُس پر راحت کے پل چھڑکے

بھر بھر کر ٹاٹ کے ہوئے ٹکڑوں کی
فوج آئی
اک رات اچانک کر کے میں بھاری سان کے
پتھریلی بھجاؤں والا شعر و ستا
اپنی عمر جوانی [illegible]
پھر کے اُٹھی [illegible]

موسم کے پیلے ہاتھوں میں
لہرایا پرچم پتوں کا
پسلی پسلی سے پھوٹ پڑا
اک نئی سحر کا آفتاب
اُس رات میں کتنا رویا تھا
یہ بوڑھا وندھیاچل ہے امیں

میری خواہش —
تھی دور کسی خاموش جزیرے پر پھیلے
پھولوں کے جنگل کا جگنو
بن کر پریوں کے ساتھ ساتھ اڑتا پھرتا
[illegible]
[illegible]
آزاد جہاں کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

اب آج ہمیشہ کے گھر کے آنگن کا کتا
جانے انجانے تلوے چاٹنے والا وہ
غراتا ہے
راہیں میری مسدود کیے مسکاتا ہے
خوابوں کا ہرا جنگل بھاتے
میری بو باس سے دور کہیں
میری پرچھائیں سے دور کہیں
افلاس زدہ عورت کی برہنہ چھاتی سا
مستقبل میرا چبھتا ہے
امروز کی وحشی آنکھوں میں
اور تاریکی کی شاہراہ جیسا سیاہ
ماضی میرا
جس پر شاہوں کے جوتوں کی کھٹ کھٹ کے سوا
کوئی آواز نہیں آتی
بس ہانپ رہا ہے رہ رہ کر
پتھریلی بھاؤں والا مردہ سناٹا
لگتا ہے بعد از اعتراف

اپنے ہی کفِ حسرت پہ گری سیال تپش کو
چاٹ رہا ہے
وقت کی اُجلی چھاتی پر بیٹھا کوئی نامرد بھی
اب رات مرے زخموں کو چھپانے کی خاطر
اپنے ملبوس گنوا بیٹھی
یہ بوڑھا وندھیاچل ہے اس میں

میں آگ اگلتا جوالا مکھی
میں آگ نگلتا دریا ہوں
میرے ہاتھوں میں سانپ کئی
لہراتے ہیں پرچم کی طرح
اور شیتل جل کی حسرت میں
وہ باپ مرا
اپنی سوکھی سی بانہوں میں گردن ڈالے
روتا تو ہوگا چیں بہ چیں
اپنے بوڑھے انگوں کی بھوکی جوالا میں
جلتا ہوگا دن رات کہیں۔

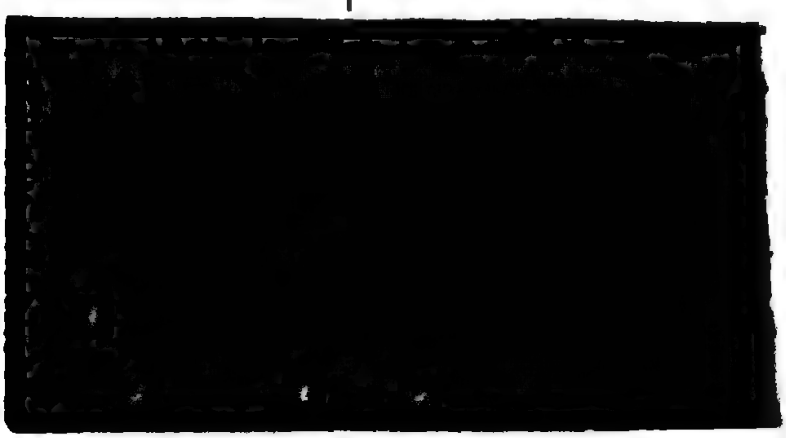

غزل

اقبال متین

گمان و وہم نہیں ہیں، مرا یقیں ہیں اب
مرے قدم مرے احساس کی زمیں ہیں اب

میں جام اٹھا کے یہی سوچتا رہا اکثر
نشہ بھی لے گئے وہ لوگ جو نہیں ہیں اب!

کچھ ایسی چرب زبانی سے جہل چھپتا ہے
یہ لوگ اپنے لیے مارِ آستیں ہیں اب

کبھی جو ساتھ تھے میرے، مری رگِ جاں تک
دلوں کو چھوڑ کے محلوں میں جاگزیں ہیں اب

ہمیں نہ پا سکا آسیب ظلمتِ دوراں
ہر ایک خالی مکاں میں ہمیں مکیں ہیں اب

فریدؔ و نشوؔ و بپنؔ کے ساتھ ہے عمرانؔ
پتہ تو دے گئے ہوتے جہاں کہیں ہیں اب

چلو متینؔ وہیں جا کے پھر انہیں ڈھونڈیں
وہ صورتیں جو زمیں سن کے دل نشیں ہیں اب

میرے لختِ جگر

ـــ فرید اقبال مرحوم، ۱۳ سال

ـــ نشو انسید اقبال مرحوم، ۱۰ سال

ـــ بپن سعید اقبال نوشاد مرحوم، ۱۱ سال

ـــ عمران قیصر مرحوم، ۲۰ سال (مرا بیٹا مشہور ڈرامہ نویس قیصر مرحوم کا بیٹا)

وراثت

اقبال متین

چلو استخارہ بھی آ ہی گیا
کہ اس نے بلایا ہے ہم کو متین
مگر یہ کتابیں، یہ کرسی، یہ میز
یہ میرے قلم، سادہ کاغذ یہ ترشے ہوئے
رسالے کے اوراق ہیں یا تراشے
کوئی نک پار کر روشنائی کی بوتل کھلی بھی نہیں
مگر میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس کا تو انبار ہے

یہ سب کچھ تو ہے، کوئی وراثت نہیں
[illegible] نے میرے کہا بھی نہیں
کہ [illegible] کو تم پہلے کا ظاہری پیرہن تو نہ دیں گے
[illegible] مگر سوچ دیں گے

کوئی نیک بندہ انھیں یہ بتا دے
کہ بانے اُن کے
کاغذوں اور کتابوں میں اپنا کفن، بڑے ہی جتن سے چھپا کر رکھا ہے
قلم ان کے جتنے بھی ہیں، سب کے سب روشنائی سے ایسے بھرے ہیں
کہ تم عطر کے بدلے اُن کے کفن پر سیاہی چھڑک دو
روشنائی چھڑک دو
اور ان کو انھیں کی کتابوں میں دفنا کے سوچو
کہ ہم ہی تو وارث ہیں
ہم کو وراثت میں کیا کیا ملا ہے

چلو ایک ہی کام باقی رہا اب
کسی بزم اردو سے، بزم ادب سے
اُٹھا لاؤ تختی کوئی
اور ابا کی بالیں پہ کتبہ لگا دو۔

غزل

باقر نقوی، لندن

محلوں کے گیت گانے والا ہی محبوب ہوا
جس نے اپنا راگ الاپا وہ مصلوب ہوا

نہریں کھدوانے والے سارے بے نام رہے
پیاسے ہونٹوں سے ٹھنڈا پانی منسوب ہوا

آئینہ تھا، نور کا چہرہ تو دکھلاتا تھا
وحشی دل بھی ڈوب گیا جب چاند غروب ہوا

دل کے خوں ہونے کا منظر کیا دکھلائیں اُسے
لختِ جگر کے گم ہونے پر جو یعقوب ہوا

کیا بتلائیں کیا جادو رکھتے ہیں پیار کے لفظ
کتنے زخموں کا مرہم تیرا مکتوب ہوا

کتنی پشتیں چھوٹے سے گھر میں رہ سکتی تھیں
جد کے گھر سے ہجرت کر جانا ہی خوب ہوا

غزل

باقر نقوی، لندن

بن میں بہے گی پھر سے پُروا، آج نہیں تو کل
پانی ہوگا دریا دریا، آج نہیں تو کل
آزادی کی مانگ میں افشاں بن کے چمکے گی
خاکِ فلسطین و افریقا آج نہیں تو کل
کشتِ ستم پر قرض رہے گا یہ معصوم لہو
پھول بنے گا قطرہ قطرہ آج نہیں تو کل
کب تک چاند ستارے یوں گہنائے جائیں گے
روشن ہوگا رستا رستا آج نہیں تو کل
کب تک رہ سکتے ہیں یکجا ظالم اور مظلوم
کٹ جائے گا ظلم کا رشتا آج نہیں تو کل
بستی بستی ہوگا اک دن جشن چراغوں کا
پھول کھلیں گے صحرا صحرا آج نہیں تو کل

غزل

انیس سلطانہ

تلخ حقائق میں تپ کر ہم کندن بن کر آئے ہیں
لوگ ہمیں پہچان نہ پائے ہم کتنا گھبرائے ہیں

مصلحتوں کی چادر اوڑھے کتنے راز چھپائے ہیں
پھر بھی تم یہ جان نہ پائے کون اپنے کون پرائے ہیں

اپنا نشیمن پھونکنے والو، یہ بھی تمہیں معلوم نہیں
چھوٹے گاؤں سے ناتا کیسا ہم تو فقط ہمسائے ہیں

اہل جنوں پابند جنوں ہیں، اہل خرد کا ذکر ہی کیا
وہ تو نام کے فرزانے ہیں، کچھ نہ کیا پچھتائے ہیں

پتھر کی بوسیدہ عمارت طوفانوں کو سہار گئی
ایک ہوا کے جھونکے میں نیچے کتنے نئے گھر آئے ہیں

اہل جہاں کا ذکر نہ چھیڑو، تلخ ہواؤں کو چھوڑو
جتنا زہر تھا ان کے لہو میں، اتنے جام پلائے ہیں

تم نے انیس بھری محفل میں کیوں اتنا احساس کیا
ترک تعلق بوجھ نہ سمجھو، وہ خود چل کر آئے ہیں

شکستہ دیوار کے سائے

انیس سلطانہ

مرے تصور کی آندھیوں میں
نہ جانے کتنے شریر پیکر
بگولہ بن کر سمٹ گئے ہیں
شکستہ دیوار و در پہ نظریں جمائے اب بھی یہ سوچتی ہوں
بھڑک رہے ہیں یہ کیسے شعلے
لرز رہے ہیں مہیب سائے
یہی وہ شہر جمیل ہے جس کی بارہا میں نے کھائیں قسمیں
ہر ایک کھڑکی سے جھانکتے تھے
وہ تمکنت سے بھرے نظارے
چہار جانب اٹھے شرارے
مگر میں اب بھی یہ سوچتی ہوں
یہی وہ شہر جمیل ہے جو روایتوں کا امیں رہا ہے
محبتوں کا نگیں رہا ہے
ہزار نفرت کے بیج بوئے، ہزار رنجش دلوں میں ڈالے
زمانہ اس کو بھی تاکتا ہے
کسی جھروکے سے سر نکالے طراز ہستی لرز رہا ہے
کوئی سمیٹے ہے بال و پر کو خود اپنے سائے سے چونکتا ہے
سپید ننھا سا وہ کبوتر اماں کی خاطر بھٹک رہا ہے

وہ بربریت کی تازہ مشعل لیے ہیں ہر سو بھٹک رہے ہیں
روایتوں کی سمادھیوں پر چڑھا رہے ہیں یہ برہمی کو
یہ خاک و خوں میں ڈبو رہے ہیں محبتوں کے لطیف پیکر
اور اپنی بھٹکی ہوئی انا کو
فریب تسکین دے رہے ہیں
ہے چھرکی کی تلاش ان کو
نمود جوہر کی آس ان کو

میں اپنی نظروں سے گر گئی ہوں
مگر ان سب سے پوچھتی ہوں
سبب بتاؤ کہ برہمی کیوں ؟
یہ سارے رشتوں سے دشمنی کیوں ،

مرے تصور کی آندھیوں میں
نہ جانے کتنے شرر بگولہ بن کر سمٹ گئے ہیں
خود اپنا دامن جلا رہے ہیں
خود اپنا خرمن لٹا رہے ہیں
روایتوں کی چتا جلا کر یہ اپنا گلشن جلا رہے ہیں
کوئی تو اس آگ کو بجھائے
کوئی تو آئے
جو نفرتوں کے سمندروں کو
قلیل الفت میں قید کر دے۔

شہسوار

لہو میں کوئی شہسوار
دوڑتا ہے رات دن.....
کبھی کبھی
یہ پوچھتا ہے کیا ہوئے ؟
وہ جاں بدست قافلے
اس دشتِ آرزو
وقارِ خواب آبرو
کہاں گئے ؟

کہاں بھٹک گئے عظیم
درد کے وہ قافلے !

کبھی کبھی تو یوں ہوا....
میں جنگلوں میں گم ہوا
بڑی مہیب خامشی
بڑی سیاہ رات تھی
کہیں کوئی صدا نہ تھی
کہیں کوئی دیا نہ تھا
نہ چشمۂ خیال تھے
نہ آہوئے غزال تھے
نہ کوئی دستِ آرزو
نہ کوئی خوابِ آبِ جو
نہ جنبشیں نہ حرکتیں
نہ آہٹیں نہ کروٹیں
خیالِ غم، حواسِ غم
چہار سمت دشت ہو
چہار سمت دشتِ ہو

اکرام خاور

میری سوزش زدہ آنکھوں نے مجھ سے یوں کہا کل شب
"یہ دھیمی آنچ کا جلنا تجھے دیوانہ کرے گا"
میں کیا کرتا، کہاں جاتا .....
کہ مائل تھا میرے سینے میں اک محبوس سناٹا
تعین کون کرتا ہم کہاں پر خیمہ زن ہیں
مسلط ہے سروں پر کون سا منحوس سایہ
اور ایسے میں .....
تماظم روز و شب، تیری لگن کا جان لیوا ہے
بڑے ہی جاں گسل ہیں تیری چاہت کے صنم خانے
نہ خونِ دل کیوں ہے ؟ تمنا سوزِ جاں کیوں ہے ؟
رفیقانِ سفر اتنا بتانا آرزو اک المیہ کیوں ہے ؟

اکرام خاور

"ایک منظر"

شب بے کیف کی تنہائی میں
بند آنکھوں کے دریچوں سے نظر آتا ہے
گاؤں کا مبا حصار
نیم کی چھاؤں اور برگد کا خمار
گاؤں کی گلیاں اور تاریک مکانوں کی
خنک ٹھنڈی چھاؤں
خاک جھڑی ہوئی دیواروں میں قید
نیم خوابیدہ زمانوں کا جمود
چاندنی رات میں مسجد کے مینار
کھیت اور مینڈھ اور میدانوں کا زور
ندیاں، فصلیں، چراگاہوں کا شور
دھول اُڑتی ہوئی راہوں میں
موذّن کی صدا!
سادہ دل لوگ، ستائی ہوئی خلق!!

کنڈلیاں

بھگوان داس اعجاز

دھرتی دھنستی جا رہی بٹا جائے وجود
ماں تڑپے ہے بھوک سے بچہ مانگے دودھ
بچہ مانگے دودھ پیڑ پودے ہیں پیاسے
سب نے آنسو پونچھ دیئے بے جان دلاسے
ہوتی جو برسات تو ماں یوں ہاتھ نہ ملتی
لاشوں کے انبار جلی مرگھٹ کی دھرتی

تنکے تنکے کا یہاں، بارہ ماس اکال
پنچھی اپنا گھونسلہ، اور کہیں تو ڈال
اور کہیں تو ڈال باورے دیس قصائی
گھر گھر میں صیاد سنے گا کون دُہائی
سب نے کھائے بھون بھون چنچی گن گن کے
دانہ ہے بھر پیٹ یہاں نایاب ہیں تنکے

اس گھر میں کئی کھڑکیاں کھلیں گی اتنا جان
بند نہ کر سچائی کا، دروازہ نادان

دروازہ نادان کھلے گا چار دِشاؤں
گندھ اُڑے گی چرچے ہوں گے گاؤں گاؤں
سچائی کا سر اُونچا ہوتا ہے اکثر
دھواں جھوٹ کا قید رکھو گے کب تک اس گھر

رکھو نہ اتنا حوصلہ، دل کی دبے اُمنگ
چلو پانی میں کہاں، گز بھر اُٹھے ترنگ
گز بھر اٹھے ترنگ تو رکھو دل پر پتھر
پگلے موقعہ دیکھ بلائیں جو میں سر پر
سمے دیکھ کر چال چلو سمجھا لو دل کو
جان بوجھ کر دَلدَل میں تم پاؤں نہ رکھو

حال ابھاگا دیش کا کرسی بیٹھے چور
راج بھون میں بھیڑیے دہشت چاروں اور
دہشت چاروں اور لوگ ہیں سہمے سہمے
چمی ہے بھگدڑ آگ لگی ہے جیسے جیسے
شہر سے دوری دور شرافت پڑا اکال
بچا نہ قصبہ گاؤں کوئی پوچھو نہ حال

نظمیں

علی ظہیر

لال قلعہ

میری بچی نے کہا
گھر سے نکلنے کے سمے
"ابو! دلی سے مجھے لال قلعہ لے آنا"
میں نے ہنس کر اسے "اچھا" کہا اور پیار کیا۔

آج جب کیمرہ لے کر میں گیا لال قلعہ
بڑی حیرت ہوئی
کیا دیکھتا ہوں اُس جا پر
دور تک ریت کا ساحل ہے
قلعہ ہے نہ فصل
پیچھے جمنا کی جگہ
کالا سمندر ہے کھڑا
جس کی موجوں میں زبانیں ہیں
کٹاروں کی طرح

عالم وحشت و حیرت میں
میں پلٹا پیچھے
دور مسجد جامع کے کلس روشن تھے

اک تسلی سی ہوئی

کیمرہ لے کے میں ہوٹل کی طرف لوٹ گیا
کیا پتہ مسجد جامع بھی کہیں ہٹ جائے
اپنی بچی کے لیے میں نے سڑک
سے لے لی
قلعہ کی پوسٹ کارڈ کی تصویر

تم سے.....

ایک آنچل ہے
جو پھیلا ہے اُفق تا بہ اُفق
ایک سایہ ہے جو چھایا ہے دل وحشی پر
نغمگی ایک طرح پھوٹتی رہتی ہے کہیں
خامشی رنگ لیے گھومتی رہتی ہے کہیں

ڈھونڈتا رہتا ہوں
لہجوں میں کبھی باتوں میں
ڈھونڈتا رہتا ہوں
خوش بُو میں
کبھی چاندنی راتوں میں تجھے
تجھ کو پایا تو بہت دل کو سکوں آئے گا
تجھ سے مل لوں گا تو
راتوں میں، میں ڈھل جاؤں گا۔

نظمیں

مشرف عالم ذوقی

۱۔ بچے کا سوال

چپے چپے پہ پولیس بیٹھی ہے
پوسٹر کیسے میں چپکاؤں گا
ماں سے بولا تھا کہ کام ہوتے ہی
لوٹ کر جلد چلا آؤں گا

ماں نے بولا تھا کہ یہ پوسٹر جادو کا ہے
اس کو کھولو گے تو اک ملک نکل آئے گا
اس کو کھولو گے تو اک صبح نکل آئے گی
ملک ایسا کہ کبھی تم نے نہ دیکھا نہ سُنا
صبح ایسی کہ کبھی پہلے نہ آئی ہوگی
ایسی دلکش کہ کبھی خواب میں دیکھی ہوگی

ماں نے بولا تھا کہ جب پوسٹر چپکا دو گے
اُس حسیں ملک کی تعبیر نکل آئے گی۔

۲۔ تم انھیں قیدی بنانے کا جرم نہیں کر سکتے

اگر تمہیں اپنے جسم کے ساتھ
ذہن و دماغ کے میزائل کا استعمال بند کرنے کے لیے
کسی تنگ کوٹھری میں دنیا کی نظروں سے چھپا کر
(جہاں تم انھیں چڑیوں کے ان دیکھے سنسار
اور ان دیکھی منزلوں کی داستانیں سنایا کرتے تھے
جہاں آزادی کے ڈینوں پر ڈولتے ہوئے خوبصورت لمحوں پر
شام گھونسلوں میں واپس آنے تک کے درمیان
ایک خوبصورت منزل چھپی ہوتی تھی)

تمہیں ایک گمنام اندھیرا دے کر کہا جائے کہ چپ چاپ بیٹھ جاؤ
ہونٹ سی لو، آگے مت دیکھو کہ تم نظر بند ہو،
قیدی ہو،

ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اس کے باوجود تم قیدی نہیں ہو
تم قیدی نہیں ہو سکتے
تمہاری روح سے اپنا رشتہ جوڑ کر
ہم نے اپنے تمام احساسات لہولہان کر لیے ہیں
تم دیکھو، یہ ایک ہاتھ نہیں، کروڑوں ہاتھ ہیں، جو چڑیوں کی،
ان دیکھی منزلوں اور ان دیکھے سنسار کی تلاش میں،
اور برحق جیت کے لیے ابھی سے اٹھ گئے ہیں

تم دیکھو یہ آزاد ہاتھ ہیں اور کروڑوں ہاتھ ہیں

تم گھبرانا نہیں، تمہارے نام آزادی کا اور آنے والی،
سنہری آزادی کا جشن منالیا ہے ہم نے
اور ان کے رنگ آلودہ دماغ اور زنگ آلودہ جسم کے چاروں طرف کیلیں
ٹھونک کر،

ان کے جسم نما تابوت کو عبرت کے لیے،
آنے والی نسل اور آنے والی دنیا کے لیے رکھ چھوڑا ہے
اور ہوا میں صرف ایک اعلان لکھ دیا ہے
مسکراتی صبح کا پیغام لانے والی آزادی زندہ باد، پائندہ باد۔

۔ رسّی پھاندتی لڑکی

تم اداس لگی
تو آنکھوں کے آگے کھلے ہوئے سارے پھول بھی اُداس لگے
تم اسے دوستی نہیں کہو گی؟
سچ کہوں، تو زندگی کو کبھی میری آنکھوں سے دیکھنا،
دیکھنا اور پڑھنا،
پڑھنا اور جاننا،

وہاں تم بھی ہو گی
لیکن تم خود کو پہچان نہیں پاؤ گی
اس لیے کہ وہاں تمہاری شبیہہ مختلف ہو گی

مختلف اور کئی حصوں میں بٹی ہوگی
ایک حصہ پردیس میں کھوئے ہوئے اُس چہرے کا بھی ہوگا
جس کے انتظار میں تم کلسڈر والی اُداس لڑکی بن جاتی ہوگی
اداس اور حساس، اور سارے جنموں کے ساون کی پیاس لیے
ایک حصہ رسیاں پھاندتی، تیزی سے بڑی ہوتی اس لڑکی کا بھی ہوگا
جو ہانپتی نہیں، بکھرتی نہیں، اور رسی کا سرا جس کے ہاتھ سے
چھوٹتا نہیں،

پہچانا، ؟ یہ بھی تم ہو.... ہاں تم
ممکن ہے ایک حصے میں کہیں میری بھی مداخلت رہی ہو
کسی اجنبی لمحے میں کہی گئی میری کوئی بات، جو تمہیں اچھی لگی ہو،
اور تم نے اسی واسطے مجھے یاد رکھا ہو،
لیکن یہ سارے چہرے، ہاں تمہارے چہرے، ہر وقت تمہیں میری آنکھوں میں
ملیں گے

اور میں چاہتا ہوں
اُداس ہونے سے پہلے، تم اپنے آگے، ان میں سے صرف ایک ہی چہرہ اپنے
پاس رکھ

رسیاں پھاندتی، تیزی سے بڑی ہوتی اُس بچی کا چہرہ
جو ہانپتی نہیں
بکھرتی نہیں
اور رسی کا سرا جس کے ہاتھ سے چھوٹتا نہیں۔

۴۔ ساون

ہم اس ساون کے منتظر ہی کیوں رہتے ہیں
جو چھلاوہ ہے، دھوکہ ہے
اور زندگی میں کبھی آ بھی نہیں سکتا
کیا ایسا سوچنا مایوسی ہے
ناکامی ہے اور بزدلی ہے

نہیں ہے، تب بھی ہم اس ساون کے منتظر ہی کیوں رہتے ہیں
جو چھلاوہ ہے، دھوکہ ہے
اور زندگی میں کبھی آ بھی نہیں سکتا

ممکن ہے وہ ساون کلپنا ہو
تصور ہو،
کتابی ہو
یقیناً تب بھی ہم اسے کھینچ لائیں گے
اس لیے کہ وہ ساون کبھی ہم نے بچپن میں دیکھا تھا
پھر نہیں دیکھا
اب اس وقت کی دھندلی دھندلی یادیں ہی بچی ہیں

اور اب ہمارے بچے بڑے ہو چکے ہیں
اور ہمیں موقع بھی نہیں مل سکا کہ انھیں ساون کی کہانیاں ہی سنا سکیں

اس لیے کہ تب تک حالات ہی بدل چکے تھے
بچے صرف جھلڑ اور لوہ کے موسم ہی دیکھتے رہے
ایک سے موسم

لیکن اب لگتا ہے
ان کی آنکھوں میں بھری ہوئی بغاوت
اس موسم کے تسلسل کو توڑنا چاہتی ہے

چلو اچھا ہے، اگر ان کی آنکھوں میں کوئی ساون پک رہا ہے
لیکن جس طرح پک رہا ہے، میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں
یہ ساون چھلاوہ نہیں ہو سکتا
اور یقیناً ایک دن میرے بچے اس ساون کو کہیں سے توڑ کر اپنے کھیتوں
میں لے آئیں گے
تو کیا میں اُس دن کا انتظار نہ کروں ؟

اس سہ ماہی کے منتخب کارٹون

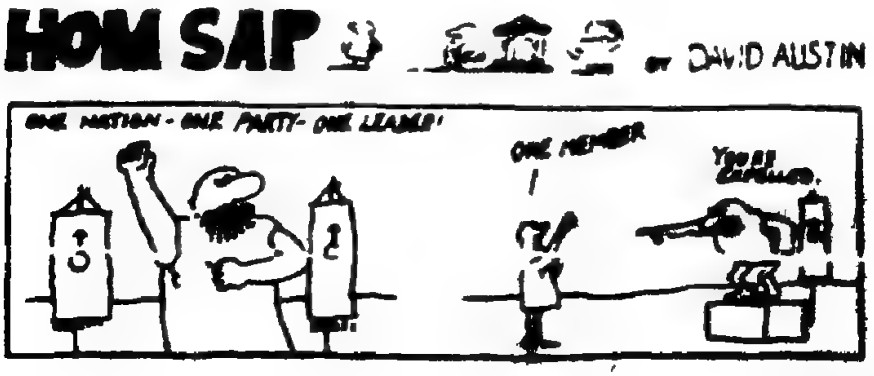

لفظوں کے انبار میں

مجھے ڈھونڈنا ہے
تو پہلے
حصارِ بدن سے نکل آؤ باہر
بکھر جاؤ
ذرّوں کی مانند
صحرائے فکر و نوا میں
کہ میں
اپنے گھر کی اک اک شے میں
مدفون ہوں
گھر سے باہر فضاؤں میں
بکھرا ہوا ہوں
کتابوں میں لکھا ہوا ہوں
تراشیدہ لفظوں کے انبار میں
دب چکا ہوں
دماغوں کے زندانوں میں بند ہوں
اور دفتر کی سب فائلوں میں
کچھ اس درجہ
پھیلا ہوا ہوں
کہ اب
ڈھونڈنے والوں کو
پہلے خود بھی بکھرنا پڑے گا!

بانو نازی پوری

غزل

ظہیر غازی پوری

آئینہ چہرے سے اور عکس تباہی سے بچا
مجھ کو میں نے نہیں دیکھا تو گواہی سے بچا

یہ بھی ایسا ہوا لکھا نہ مجھے تو نے کہیں
ذہن فکروں سے تو کاغذ بھی سیاہی سے بچا

کیوں یہ بیٹھے ہو لک دامن یوسف کی مثال
کون اس دہر میں ناکردہ گناہی سے بچا

ان زمینوں کی طرف اب کے سفر کرنا ہے
جن کا ہر خط نقوشِ کفِ راہی سے بچا

اس کو شبنم کی لطافت بھی گراں گزری ہے
دشتِ غم میں جو تری شعلہ نگاہی سے بچا

جسم چھلنی ہوا، نشتر لگے، نیزے بھی چبھے
شیشہ شیشہ مگر احساس تباہی سے بچا

آج تک آئینہ، فکر و مطالب کیسے
میرے اندر کے انا دار سپاہی سے بچا

سبَاعی

سکندر توفیق

["سباعی" اردو کے شعری ادب میں ایک نئی صنف ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ خالص اردو اور خالص ہندستانی ہے۔ "سباعی" سبع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "سات"۔ اس لیے اسے رباعی کے وزن پر "سباعی" کہنا صحیح نہیں۔

"سباعی" کی تعریف ہے: "سات مصرعوں والا ایسا مسمط (یا نظم) جس میں ایک اور صرف ایک مستقل مضمون ڈرامائی اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ وحدت تاثر حاصل ہو"۔ ساخت کے لحاظ سے سباعی مندرجہ ذیل اشکال پر مشتمل ہوتی ہے:-

۱۔ مصرع + مسدس	۵۔ ۱ مصرع + مخمس + ایک مصرع
۲۔ مسدس + مصرع	۶۔ مربع + مثلث
۳۔ ۲ مصرعے + مخمس	۷۔ مثلث + مربع
۴۔ مخمس + ۲ مصرع	۸۔ قافیوں کا کوئی اور دروبست

ذیل میں چند "سباعیاں" بطور نمونہ پیش ہیں۔

(سکندر توفیق]

شباب، شیب بنا ماجرا سناتے ہیں
کہ زندگی کے ورق کو اُلٹتے جاتے ہیں
ہماری ہستی نگارندۂ امور نہیں
جو فصل بوئی کبھی تھی وہ اب سکھاتے ہیں
سرورِ وقت کی تکرار ہے، نہیں فردا؟
پلٹ پلٹ کے وہی روز، آتے جاتے ہیں
ہم اپنے آپ کو دہرا کے تھک سے جاتے ہیں

۲

سوتے ہیں شہر سارے، ویران بستیاں ہیں
وہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
سب وقت کی گپھا میں گم گشتہ ہستیاں ہیں
پہچان تھی انھیں سے اِس مشتِ خاک کی بھی
صحرا نوردیوں کی، دامن کے چاک کی بھی
دل کے قریب اب تو عصرِ جدید آئے
اپنائیت سے کہتا حل من مزید آئے

۳

چھوڑ کر شہرِ وفا جب مرے احباب گئے
دل کی دھڑکن کے وہ انداز وہ آداب گئے
تھے مسرت کے امیں سارے جو اسباب گئے
مرے ماحول کے خوش رنگ وہ القاب گئے
بے وطن مجھ کو کیا اپنے وطن میں یکسر
دوست، سب لے گئے، تسکین و فغاں کے منظر
میں اَنا بستہ اندھیرا وہ پراگندہ سحر!

۴

عکس آئینہ مرے پیکرِ خاکی کی نمود
بزمِ اغیار میں شہرت مری افواہ کبود
کیا بتاؤں میں تجھے کیا ہے مرا سرِّ وجود
مرا مسکن نہ مکاں ہے نہ زماں ہے اے دوست
ان میں ہستی کی روانی ہی عیاں ہے اے دوست
میرا مسکن تو ترا دل ہے جہاں پر میں ہوں
میری پہچان، وہی ترا گماں ہے اے دوست

۵

انتشارِ ارماں کا احتساب وعدوں کا
وقت کب رہا باقی پھر نئے ارادوں کا
زندگی بسر کرنے مشغلہ ہے یادوں کا
زیست، سانس لینے کا، گویا اک قرینہ ہے
اب نہ کوئی مقصد ہے مدعا نہ منزل ہے
بجھتی اب تصور میں کل کی بکھری محفل ہے
مضمحل قوی سارے دل مگر وہی دل ہے

۶

نخلِ امید پر کھلا غنچۂ پُر فضا ہے موت
اپنے ہر ایک درد کی سمجھو تو اک دوا ہے موت
ایک پیامِ سرخوشی ایک حسیں ندا ہے موت
کیسی نگارِ دلربا کتنی یہ خوش ادا ہے موت
دل کو وفورِ یاس کی گھر چکی سیاہ رات
صبحِ امید موت ہے موت ہے رمزِ کائنات
جرم کے نثار کیجیے لقبِ حیات بے ثبات

وحدت الوجود کا اسلامی نظریہ۔

کتابوں کی باتیں

[بعض کتابیں تنقید و تبصرہ چاہتی ہیں بعض بعض خاموشی کی طلب گار ہوتی ہیں، بعض تفصیل طلب ہوتی ہیں، بعض مطالعہ طلب۔ "عصری ادب" کو ہر سہ ماہی بڑی تعداد میں تبصرے کے لیے مطبوعات موصول ہوتی ہیں۔ سب پر تبصرہ ممکن نہیں خواہ تبصرہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ لہٰذا ہم موصولات کے ضمن میں ان کا ذکر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعض سہواً یا کسی تبصرہ نگار کی تساہلی سے نظرانداز ہو جاتی ہیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

جن حضرات نے پچھلے ایک سال میں اپنی کتابیں "عصری ادب" کو بھیجی ہوں وہ براہ کرام یاددہانی ضرور کرا دیں۔ ۱۹۹۰ء میں "عصری ادب" غیر حاضر رہا، ڈاک بھی گڑبڑ رہی، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ م۔ ح]

یوگیش کمار کی دو کتابیں اور پھر کناڈا کے خالد سہیل کی تین کتابیں کسی بھی تبصرہ نگار کا امتحان بن سکتی ہیں۔ یوگیش ہندستان میں رہتے ہیں کتابیں بھی یہیں چھپتی ہیں اور بازار میں مل سکتی ہیں۔ خالد سہیل پاکستان میں پلے بڑھے اور اب کناڈا کے شہری ہیں۔ ان کی کتابیں پاکستان میں چھپیں اور ہندستان میں نہیں ملتیں مگر دونوں مصنفوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے

کہ یہ انسان کو انسان اور صرف انسان کی حیثیت سے دیکھنا اور پیش کرنا چاہتے ہیں اور جتنے تفرقے، تعصبات اور تاثرات کے لیبل، جغرافیہ اور جنس، مذہب اور رسم و رواج کے بندھن، تہذیبی منطقوں کی تقسیمیں ممکن ہیں ان سب سے اوپر اٹھنا چاہتے ہیں۔ فخر کی بات ہے کہ یہ عالمی سطح کی تخلیقات اردو میں لکھی گئیں اور اردو میں شائع ہوئیں۔ دونوں مصنف اردو ادب کو بین الاقوامی سطح کی روشن خیالی سے ہمکنار کرنے کے کوشاں ہیں۔ 'بے نام قاتل' کی امریکی لڑکی کا مکالمہ روشن خیالی کے اس عظیم جہاد کا اشاریہ ہے:

"یوگی! اپنی حفاظت کرنا سیکھو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اور مجھے بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں وہ نہیں ہیں جیسا ماما ہمیں دیکھنا یا بنانا چاہتی ہیں تم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے تم مرد ہو اور میں عورت، اور یہی وہ سچائی ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے پاس کھینچ لائی تھی۔ ماما اپنی حکمرانہ خواہش کی تکمیل کی خاطر آج ہم پر ہندستانی اور امریکی لیبل چپکانا چاہتی کیونکہ وہ بخوبی جانتی ہے کہ دنیا کے لوگوں پر حکومت کرنے سے قبل ان کو بانٹنا یا تقسیم کرنا ضروری ہوتا ہے ایسا کیے بغیر اس کی ظالمانہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ ماما ہماری بھلائی نہیں چاہتی کیونکہ ایسا کرنے سے خود اس کی اپنی موت ہوتی ہے۔" ص، ۱۵

'بے نام قاتل' کہانی بھی ہے اور مجموعے کا نام بھی اور اس مجموعے میں دو ناولٹ اور دو افسانے شامل ہیں۔ یہ بھی کریمر کا روحانی سفر، تکنیک اور نفس مضمون دونوں لحاظ سے منفرد ہے جو ایک امریکی لڑکی کی انسانوں سے اتھاہ پیار کی ہنتھواں کونسل، ملک، قومیت، مذہب اور روحانیت کے نام پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں سے ٹکراتے دکھاتی ہے اور ایک ایسی جمالیاتی کیفیت اور کردار نگاری کا ایسا دل چھو لینے والا مرقع چھوڑ جاتی ہے جو معاصر اردو ادب میں

نایاب ہے اور یہ کہانی بیگی کی بہن، اس کے نیگرو دوست، ڈکٹ جیسن ہندستانی گرو مہیشور، مالک چند پنجابی، اقبال سنگھ کانسٹبل، ڈاکٹر ملہوترا، ایک یتیم ہندستانی لڑکے اور ایک ہندستانی جج شفیع قریشی کی زبانی بیان ہوتی ہے جو مختلف اخلاقی قدروں کو نسل، قوم، زمانے، طبقوں اور شخصیتوں کی بھٹیوں سے گزر جاتی ہے اور آخر میں معصوم بیگی کریمری کو گناہگار ٹھہراتی ہے جرم بجرم بے گناہی، قصور؟ انسانیت سے غیر مشروط پیار۔

یہی قصور افسانہ "کالے سائے" میں گم نام نوجوان کا ہے جو اپنا نام جیمز بریلتھ بتاتا ہے اور جب پولیس انسپکٹر اسے بتاتا ہے کہ "وہ بچارا تو اسپتال میں پڑا ہے گولی اس کی ناک کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے اور ممکن ہے کہ مر بھی جائے تو وہ گمنام نوجوان صرف اتنا کہتا ہے:

"ہم نہیں مریں گے..... شیرف کلارک کے بکتر بند سپاہی تتر بتر ہونے کا حکم دیں گے لیکن ہم گیت گاتے آگے بڑھتے جائیں گے۔" ص ۶۹

سنو فلاور میں یادگار کردار مسز مرفی کا ہے جس کی کردار نگاری میں مصنف نے اپنی ساری شائستگی، ہنرمندی اور صاحب نظری صرف کر دی ہے مسز مرفی کے ہاں محبت کا جو نازک تصور ابھرا ہے وہ بڑا ہمہ گیر اور بھرپور ہے ایسا ہمہ گیر اور بھرپور جس کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی۔ اس کا کردار پڑھنے والے کے تصور حیات کو متاثر کرتا ہے۔ سنو فلاور زندگی کی لطافت اور اس کی کثیف اقادیت اور منفعت پروری کی دردناک آویزش کی کہانی ہے اور بقول مسز مرفی:

"دراصل کائنات میں پائی جانے والی مختلف اشیا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہم شاید اسی لیے پریشان رہتے ہیں کیونکہ ہم ایسی رشتوں کو پہچان نہیں پاتے۔" ص ۸۵

(بے نام قاتل" ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ گلی وکیل والی۔ لال کنواں۔ دہلی۔ ۱۹۹۱ء صفحات ۱۵۷، قیمت ۶۰/-)

آخر میں یہ ذکر ضروری ہے کہ یوگیش کمار نے امریکہ میں چھ سال قیام کیا اور دونوں ناولٹ اور افسانے امریکی زندگی کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کا فکری اور حسیاتی دائرہ آفاقی ہے اور اسے جغرافیائی حد بندی میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

کلر بلائنڈ (افسانے) ——— انور قمر

قلم پبلی کیشنز بمبئی صفحات ۱۴۴ قیمت: ۳۰/-

حال میں شائع ہونے والے مجموعوں میں کلر بائنڈ کی نمایاں حیثیت ہے ان افسانوں میں ایک نئے ڈھنگ سے علامتی افسانے اور واقعاتی افسانے کو ہم آہنگ کیا گیا ہے اور تعمیم اور تہہ داری کی مدد سے افسانوں میں معنویت کے متعدد زاویے ابھارے گئے ہیں۔ انور قمر کو کہانی کہنے کا فن بھی آتا ہے اس لیے علامتی رنگ کے باوجود یہ افسانے دل چسپی قائم رکھتے ہیں۔ بعض افسانوں کی تہہ داری انھیں دورِ حاضر کے اہم ترین افسانوں میں شمار کرنے کا مستحق بناتی ہے خصوصاً مہر بند، گم شدہ باپ، ذبیحہ اور پرندے کا سایہ جن میں بیک وقت اپنے دور اور اپنے ملک کے ہنگامی مسائل کو انسان کے ازلی وجود کی کشمکش سے پیوست کر کے افسانے کی تخلیق کی گئی ہے تکنیک کی سادگی اور اندازِ بیان کی روانی اور دل کشی نے ان افسانوں کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

"مہر بند" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو سات دروازوں والی ایک پُر اسرار عمارت میں داخل ہوتا ہے جہاں تنہا رہنے والا انسان اپنی دل چسپیوں کا حال اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب بھی دل گھبراتا ہے وہ اس عمارت کے تہہ خانے میں اتر جایا کرتا ہے۔ وہ رخصت کے وقت اسے بھی نصیحت کرتا ہے کہ:

"آپ دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہا کریں اس کی بجائے آپ اپنا گم شدہ تلاش کریں..... آپ کی دنیا کی تقریباً ہر عمارت میں لفٹ ہے پر دکھ کی بات یہ ہے کہ لفٹ اوپر کی طرف

ہے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہر عمارت میں ایک
تہ خانہ بھی ہوتا ہے..... تہ خانے میں اتر کے دیکھیے کہ تہ خانے
کے راستے آپ کو کہاں پہنچاتے ہیں۔"

یہ محض خود شناسی اور عرفان ذات کی ترغیب نہیں، اس میں اپنے آپ کو پہچاننے کے علاوہ انسان کو تمام لوازم کے ساتھ پہچاننے کا رمز بھی ہے۔

اسی طرح گم شدہ باپ، جہاں جنریشن گیپ (نسلوں کے درمیان خلیج) کا افسانہ ہے وہاں معاشروں کی مغائرت کی کہانی بھی ہے۔

بہرحال افسانوں کا یہ مجموعہ نہایت توجہ اور دلبستگی کے ساتھ مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے اور یقیناً دور حاضر کے افسانوی ادب میں اہم اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔

"جمال ہم نشیں" ——— مترجم: راجندر سنگھ ورما

گھاس منڈی، شیرانوالہ گیٹ۔ پٹیالہ صفحات ۲۰۰ قیمت -/۱۵

راجندر سنگھ ورما لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ہندو پاکستان کے ممتاز ہمعصر انگریزی شعرا کے شاہکار اردو نظم میں ترجمے کیے ہیں اور کامیابی سے کیے ہیں ان سے یقیناً اردو شاعری کا افق وسیع ہوگا اور موضوع، طرز ادا، اور امیجری کی رنگارنگی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے گا..... علاوہ، احمد علی، کملا داس، دلیپ چترے، نسیم، ازیکیل جیسے شاعر شامل ہیں شان الحق حقی کا مختصر سا پیش لفظ بھی اہم ہے۔ ماضی پرستی کے موضوع پر پرتیش نندی کی ایک مختصر نظم کا ترجمہ دیکھیے اور ورما جی کی کاوش کی داد دیجیے:

۱۔ گیا ہوں میں
۲۔ جہاں بھی جس طرف بھی
۳۔ غم تنہائی سے پالا پڑا ہے
۴۔ سوا کچھ اور احساس جلاوطنی ہوا ہے

۵۔ زباں میری محبت کی زباں ہے
۶۔ مگر میرا وطن جانے کہاں ہے
۷۔ میں ہوں رمز آشنا سب موسموں کا
۸۔ مہینے کارپردازانِ فطرت
۹۔ بدلنے لگتے ہیں جب اپنی رنگت
۱۰۔ تو پت جھڑ باندھتا ہے مجھ سے پیمان محبت
۱۱۔ مجھے ڈستی ہے یہ وحشی وراثت
۱۲ مرے جھونے سے (کیا طرفہ ستم ہے)
۱۳۔ بدل جاتی ہے پتھر میں ہر اک شے

۳، ۴ میں قافیے کی کھنک اور ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں قافیے کی بحر کی ہم آہنگی اور پھر آخری دو مصرعوں کی صوتی کھنک قابل داد ہے۔

"لکشمن ریکھا (افسانے) ——————— منظر کاظمی

سائمہ پبلی کیشنز۔ بھونڈی صفحات ۱۳۸ قیمت: -/۱۰۰

منظر کاظمی کے ۱۷ افسانوں کا خوبصورت اور بہت ہی خوبصورت چھپا ہوا یہ مجموعہ انسان کے اندر درندگی اور شائستگی کے کشمکش کی داستان ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں دہرائی جاتی ہے۔ بار بار منظر کاظمی کی کہانیاں انسان کے اس حیوانی وجود کی واپسی کا ذکر رنگا رنگ علامتوں کے ذریعے کرتے ہیں کہیں جنگل کی طرف واپسی ہے، کہیں آسمان کی کائی میں لپٹا ہوا چاند ہے، کہیں فرقہ وارانہ فسادات ہیں تو کہیں بچی ہوئی ٹانگیں۔ یہ پارہ پارہ شخصیت اسی اشرف المخلوقات انسان کی ہے جو کہیں طوطوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تقریریں، قصے یہاں نہیں ہیں اور اگر ہیں تو بکھرے ہوئے اس بکھراؤ کے پیچھے احساس کا کرب البتہ نمایاں ہے۔

(م۔ ح)

"برف زار" (شعری مجموعہ) ——— عبدالقوی ضیا

پاکستان کلچرل سوسائٹی سسٹری (کناڈا) صفحات ۱۷۶ قیمت: ۰/۷

کناڈا میں رہ کر اردو کی کلاسیکی غزل کی تمام روایتوں، لطافتوں اور نزاکتوں کو ملحوظ رکھ کر شعر کہنے والے مورخ شاعر عبدالقوی ضیا کی غزلوں کا یہ مجموعہ احساس اور جذبے کی ہلکی ہلکی آنچ سے روشن ہے اور غزلوں میں لہجے کی چٹکی بھی ہے اور انداز بیان کی طرفگی بھی۔

محبت تھی فروزاں درد کا احساس تھا جب تک
ہوئی انسانیت رخصت تو انسانوں کو نیند آئی

فکر کے نئے گوشے بھی ہیں (کچھ نہیں ہے تو یہ ہونا کیسا) کہیں نئے استعارے بکھرے ہیں (کوئی ٹوٹا ہے کوئی آئینہ کیا)۔ غرض "برف زار" کا مطالعہ رنگا رنگ کیفیات سے گزرنا ہے اور کلاسیکی مزاج کے قاری کے لیے کیف اور لطف سے بھرپور۔

"جمع و خرچ وفا" (مجموعۂ کلام) ——— راشد آذر

سوماجی گوڑہ۔ حیدرآباد صفحات ۱۴۴ قیمت: ۱۶/-

راشد آذر دور حاضر کے کامیاب اور نامور نظم نگاروں میں ہیں۔ گو اس مجموعے میں چند غزلیں بھی ہیں مگر ان کا آرٹ بنیادی طور پر نظم کا آرٹ ہے وہ ذاتی تجربے میں وسیع تر تہذیبی اور انسانی صورت حال کو پیش کرتے ہیں اور دردمندی سے پیش کرتے ہیں ان نظموں پر کبھی کبھی محض عشقیہ یا ذاتی اور واردات ہونے کا شبہ ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے وسیع تر معروضی حقیقتوں کا تانا بانا بڑی خوبی سے بُنا گیا ہے۔ رشتہ ماضی و حال کے یہ مصرعے دیکھیے:

وہی ہے آج بھی ماضی و حال کا رشتہ
دروغ مصلحت آمیز حاکم دوراں
صداقت آج بھی ہے سینہ چاک و تشنہ دہن....

حیات گھوم رہی ہے زمین کے محور پر
افق کے پار کسے دیکھنے کی ہمت ہے۔

یہی انداز "یہ کیا غضب ہے" "شب فسانے تھے" اور "درد تہہ جام" "پیر تسمہ پا" میں نمایاں ہے اور شاید سب سے زیادہ بے محابا طور پر "خوابوں کے رشتے" میں منظوم ہوا ہے:

وہ خواب جو میری زندگی تھے
وہ کب کے ردی کی ٹوکری میں
پڑے ہوئے ماندگی کے وقفے کے منتظر ہیں
کہ میں کبھی کارزار ہستی میں شور و غل سے
تھکوں تو بس ایک لمحہ رک کر
انھیں اٹھالوں۔

راشد آذر کی نظموں کا کثیر الجہتی انداز اور اس کے ساتھ ان کے احساس کی صلابت نے اختر الایمان کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

"بین کرتا ہوا شہر" (مجموعہ کلام) ——— عتیق اللہ
اردو مجلس، یتیم پورہ، دہلی ۳۴ صفحات ۱۲۸ قیمت ۳۲/-

بائیس نظموں اور اکیاون غزلوں کا یہ مجموعہ صلابتِ احساس سے بھرپور ہے۔ عتیق اللہ تلازموں کی نئی فضا لے کے آئے ہیں۔ التماس کی سوکھی شاخوں پر ٹنگے ہوئے صبر کے چیتھڑے، ابتدا کی ہولناک دھند، دلدل میں پھنسا ہوا چاند، بے بیان واپس جاتے ہوئے رسول، یہ سب تلازمے اور ترکیب ایسے چوٹ کھائے ہوئے احساس کا پتہ دیتے ہیں جو درد سے چور ہے مگر ابھی تک کسی آسودہ بخش حل تک نہیں پہنچا ہے۔ "دوسرے درجے کا شہری" اور "اب" مجموعے کی اہم نظمیں ہیں۔ ایک اندھی آندھی ہے جس کے تلازمات ان نظموں میں بار بار محسوس ہوتے ہیں عتیق اللہ اس آندھی کو نظم کے استعاروں میں

ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں گو اس میں جن کا لہجہ غالب نظر آتا ہے اور اس زہر کے اندر سے اُبلتا ہوا شعری کیفیت کا امرت کہیں کہیں مدھم پڑ جاتا ہے عتیق اللہ احساس اور فکر کو پیکر تراش تخیل کی سطح پر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

برہنہ دیویاں ننگے سیاہ رو اصنام
کسی کسی کے تو سر پر اُگے ہوئے ہیں سینگ
کسی کسی کی تو پیشانیوں پہ آنکھیں ہیں
کوئی پہاڑ اٹھائے ہوئے ہے شانے پر
کسی درخت کے نیچے پڑا ہوا ہے کوئی
کسی کے ہاتھ میں آدھا بدن ہے انساں کا
کسی کے پاؤں کے نیچے کوئی تڑپتا ہے
ہزار پا کوئی مصروف بادہ پیما
کسی کے پاؤں تلے معبدوں کے مینارے
کسی کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی صلیبیں ہیں (ص ۴۹)

عتیق کی نظمیں البتہ ایک چھناکے کے ساتھ اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ شاید ان کے اختتامیے زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔ یہ مجموعہ بلاشبہ راشد اور اختر الایمان کی روایت کو آگے بڑھانے والی نظموں سے عبارت ہے گو ان نظموں کی تعداد کم ہے اور نصف سے زیادہ حصہ غزلوں نے گھیر لیا ہے غزلوں میں بھی اچھے، بے محابا اور بے ساختہ شعر ہیں۔ مثلاً

اُلٹ پڑی ہے زمین سر پر کہ زیر پا کوئی آسماں ہے
ترے غبار فسوں سے نکلا ہوا وہ سیارہ اب کہاں ہے

خون کی دھار تیز رو ہے بہت
اک گماں سا ہے، اک یقیں کم ہے

ایک اور صرف ایک محبت ایک سے زیادہ ہو تو تم ذکر

ہم سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب ہم نے قدم رکھا یہ خاکداں ویراں تھا

سبھی کے ہاتھ کٹے ہیں بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا

صحرائے اعظم (ڈراما) ——————— زاہدہ زیدی

سرسید نگر علی گڑھ صفحات ۱۴۳ قیمت ۱ ۰/۰

سیموئیل بیکٹ کے ڈرامے "گودو کا انتظار" کے دو مرکزی کردار گوگو اور دیدی (ولادی میر) کے گرد زاہدہ زیدی نے خلیجی جنگ میں عراق اور امریکا اور اس کے اقوام متحدہ والے حلیفوں کے ٹکراؤ اور کمزور ملکوں کی بے بسی کو تمثیلی پیرایے میں ڈھالا ہے۔ شہنشاہ کیلٹس گویا صدر بش کا دوسرا نام ہے اور اس کے گرد منڈلانے والے امرا اور نواب — شاہ مرغاں، شاہ طلائی، شاہ جوہری ملک عرب ممالک ہیں اور نواب خلافت، نواب مخاصمت اور نواب مباشرت امریکہ کے دیگر حاشیہ نشیں ملکوں کے نام ہیں — راجہ جے شنکر (ہندستان کے چندر شیکھر ہیں) اور نواب غریب نواز (پاکستان کے نواز شریف ہیں)۔

گوگو اور دیدی دنیا کے عوام کے نمائندہ ہیں اور بہرام (صدام حسین کے ڈرامائی روپ) کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ جنگ تو وہ نہیں روک سکے مگر وہ آخر میں طے کرتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا اور سنا ہے وہ دنیا بھر کو اس ڈرامے کی شکل میں دکھائیں اور سنائیں۔ (ص ۱۳۳)

ڈرامے میں سبھی واقعات اور کردار گویا استحصال کا ننگا روپ ہیں مکالمے طویل ہیں اور کردار چوبیں اور برملا طور پر علامتی ہیں اور ڈرامے کا طرز بیان

براہ دست ہے، مکالمے کہیں کہیں بہت طویل ہو گئے ہیں لیکن کویت پر قبضہ مخالفانہ اور پھر اس قبضے سے خلیجی جنگ کے شعلے بھڑکنے، امریکا کے نئے عالمی نظام کے ظہور اور سوویت روس کی بے بسی کے پیچھے کارفرما عناصر کا زیادہ گہرا اور زیادہ تجزیاتی مطالعہ ڈرامے کو کہیں زیادہ موثر بنا سکتا تھا۔

"بچے گھر کے" ——— یوگیندر پال طائر

ہما پبلی کیشنز جموں صفحات ۱۳۶ قیمت: ۲۵/-

طائر کی غزلوں کا یہ مجموعہ ایک حساس شاعر کی مختلف کیفیات کا آئینہ ہے عرش صہبائی کے شاگرد رشید ہیں اور کلام میں دردمندی اور طرفگی موجود ہے۔

"سوز نشاں" مجموعہ کلام ——— سید احمد سحر

خلیل غربی۔ شاہجہاں پور صفحات ۱۷۵ قیمت: ۵۰/-

غزلوں، نظموں اور قطعات کا یہ مجموعہ قومی اور عالمی واقعات سے متاثر ہونے والے حساس شاعر کے جذبات کا مرقع ہے جس میں شاعر کی ذات اور اس کا عہد دونوں جلوہ گر ہیں۔

"مٹی کا قرض" (ناول) ——— اظہار صہبائی

بازید خیل۔ شاہجہاں پور صفحات ۱۸۱ قیمت ۷۵/-

مجاہد آزادی اشفاق اللہ خاں کی سوانح پر لکھا ہوا یہ ناول قومی اور مذہبی جذبے سے سرشار ہے۔ پورا ناول فلیش بیک میں لکھا گیا ہے اور اشفاق اللہ خاں کی گھریلو زندگی، ان کی انقلابی مہمات، نیپال، دہلی اور کاکوری کے ان کے سفر اور پھر جیل کی سرگزشت، خوبی سے بیان کی گئی ہے ناول نگار نے اشفاق اللہ خاں کے کردار کو ملک کے مجاہدانہ رنگ روپ کے پس منظر میں کامیابی سے پیش کیا ہے وہ بھی ایک ایسے دور میں جب ملک ان مجاہدوں کو تیزی سے بھولتا جا رہا ہے۔

(م۔ ح)

"کتاب نظر" (مضامین) ——— راہی فدائی

ابو الکلام اکادمی، کلکتہ (پی ڈی) صفحات ۱۱۲ قیمت: -/۴۰

اس مجموعے کے بعض مضامین اردو دنیا کے لیے نئی معلومات فراہم کرتے ہیں خاص طور پر مثنوی یوسف زلیخا کا نو دریافت مخطوطہ و شارح میں اردو اور سب سے بڑھ کر اختر کٹرپوی کی مثنوی در مدح ٹیپو سلطان شہید والا مضمون توجہ کا مستحق ہے۔

"اردو شاعری میں دوہے کی روایت" ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی

اردو بک سنٹر، علی گڑھ صفحات ۳۰۳ قیمت: -/۸۰

دوہا، عروض، لہجے اور شعری لوازم کے اعتبار سے برج بھاشا اور اودھی میں منفرد صنف ہے۔ اردو میں دوہے لکھتے وقت عام طور پر ان لوازم کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا اسی لیے اردو کے دوہوں میں سے اکثر ہندی دوہوں کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ سمیع اللہ اشرفی نے دوہے کی روایت سے تفصیلی بحث کی ہے اور ڈنگل ہندی اور اردو کے عروض سے واقفیت فراہم کی ہے اردو میں دوہا لکھنے والوں کے نمونے جہاں تک ہو سکا ہے مصنف نے فراہم کرائے ہیں۔ دوہے پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب اہم ہے اور اس کے بغیر اردو دوہے کا کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہوگا۔

"ڈگر پنگھٹ کی" (ڈرامے) ——— رفعت سروش

نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی ۱۴ صفحات ۱۶۰ قیمت: -/۶۰

رفعت سروش کے چھ ڈراموں کا مجموعہ۔ پہلا ڈراما امیر خسرو پر ہے دوران کے زندگی، دور اور شاعرانہ کمال کو تمثیلی رنگ میں پیش کر دیا ہے "بصور بگولے اور غنچے پھر لگا کھلنے" اور زندگی کی طرف ریڈیائی ڈرامے ہیں اور مختلف سماجی، فنی اور نفسیاتی مسایل کو پیش کرتے ہیں ان میں سب سے کامیاب ڈراما "زندگی کی طرف" ہے جس میں بلراج کی ذہنی الجھنوں کو تحلیل نفسی

کے طریقے پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ڈرامے کا فنی پہلو مجروح نہیں ہوا ہے۔

"تابوت کی صدا" ——————— شاعر: نرنجن پاڑھی

مترجم: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

کامران پبلی کیشنز، رحمت بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱

صفحات ۹۶ قیمت: ۴۰/-

نرنجن پاٹھک کی موت اور موت کے پس منظر میں تصور حیات پر مربوط اُڑیا نظم حفیظ اللہ نیولپوری نے بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کی ہے۔ ترجمہ شستہ اور رواں ہے اور نظم خیال انگیز اور فکر خیز۔

"سورج کو روک لو" ——— ——— مقصود ایس اے حسنی

المنیر، فیروز پور روڈ، لاہور صفحات ۹۶ قیمت: ۴۰/-

مقصود ایس اے حسنی کی نثری غزلوں کا مجموعہ جس میں غزلیت کم ہے مگر اپنے دور کا دکھ درد غالب ہے۔

(م۔ح)

"ہندستانی معاشرے میں مسلمانوں کے مسائل" مترجمہ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں

پیٹریاٹ پبلشرز، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی صفحات ۴۰۰ قیمت: ۷۰/-

یہ کتاب ہندستانی مسلمانوں کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی مسائل اور معاملات زندگی سے متعلق ۳۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو گراں قدر نامور ادیبوں اور دانشوروں نے ان مسائل پر لکھے ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں ہندستانی مسلمانوں کے متنوع مسائل کو منظم اور معروضی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ بظاہر تو اس کا موضوع ہندستانی مسلمانوں کا احاطہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اس کتاب کا دائرہ کار بہت وسیع ہے جو مذہب اور سیاست، تاریخ اور اقلیتی تہذیب کے مسائل سے جڑا ہوا ہے۔

(اطہر فاروقی)

"ہے دلی پوشیدہ....." ـــــــــــ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں

صفحات قیمت

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کے ۸ مضامین اور ۳ تراجم پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جو ادب اور تنقید، سماج اور سیاست، مذہب اور تہذیب سے متعلق کچھ نئے رجحانات، فکر انگیز خیالات اور تازہ معلومات سے ہمیں متعارف کرتی ہے خاص طور پر قدیم گنج کی تہذیبی زندگی پر شہرہ نامہ قابل قدر ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہے۔

(اطہر فاروقی)

"ٹوٹا ہوا آدمی" ـــــــــــ ڈاکٹر خالد سہیل

ناشر: ۱۳۹۶، بلور اسٹریٹ ویسٹ۔ ٹورنٹو (کناڈا)

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ۔ لکھنؤ صفحات ۱۳۰ قیمت: ۸۰/-

ڈاکٹر خالد سہیل ایک ماہر نفسیات ہیں۔ انھوں نے اپنے اس ناولٹ میں ایک نفسیاتی مریض کی اذیتوں کا تجزیہ کیا ہے۔ غریب الوطنی کے کرب کو قاری تک پہنچانے کے لیے انھوں نے کناڈا کی زندگی کا انتخاب کیا ہے جہاں وہ خود رہتے ہیں اور اس زندگی کو قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک نوجوان شہزاد ملک والدین کے ساتھ کناڈا آجاتا ہے مگر گھر کی مشرقی تہذیب اور باہر کی بے فکر فضا اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ بات بات پر غصہ کرتا ہے جس کی وجہ سے گھر کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور باہر کے لوگ اسے برداشت نہیں کر پاتے ہیں لیکن جیوتی کی ہمدردی اس کی زندگی کے رُخ کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ شہزاد تمام تر تلخیوں کا زہر اپنے خلق سے اتار لیتا ہے۔ لیکن کناڈا کا قانون، جو جذبات سے عاری ہے۔ جیوتی کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح مصنف نے مشرق و مغرب کی قدروں کی کشمکش پر گہری چوٹ کی ہے۔ شہزاد کی الجھنوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ابراہیم کا کردار

ایک سلجھے ہوئے انسان کا کردار ہے جس نے دنیا دیکھی ہے اور ہر پہلو سے دنیا سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شہزاد کو صحیح راہ دکھاتا ہے اور شہزاد ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔

اس ناولٹ میں مغربی طرز زندگی کے جن پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے وہ قاری کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں ہیں۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کا اپنے مریض سے شادی نہ کرنے کا قانون۔

جنسی بے راہ روی کی تصویر کشی اتنی رواں اور برجستہ ہے کہ کہانی کا ایک اہم اور ضروری حصہ محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ پڑھتے وقت قاری چونکے گا ضرور لیکن کہانی کا بہاؤ رکتا نہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف کی تہذیبی جزئیات پر گہری نظر ہے۔ وہ ایک دانش ورانہ شعور رکھتے ہیں بعض جملے قاری کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتے ہیں۔

اظہار خیال کی بے باکی ناولٹ کی حقیقت کے دائرے میں لاکھڑا کرتی ہے اور مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے بلا کم و کاست کہنے میں کامیاب ہے۔

خالد سہیل کا شوخ طرز تحریر ان رومان پرور فضاؤں اور جنسی لذت کو بے باکی سے پیش کرنے میں کبھی واضح اور کبھی مبہم اشارے نہایت دل چسپ پیرائے میں کرتا ہے۔ اُن کے اس انداز بیان میں دل کشی ہے اور کہانی پن قاری کے ذہن کو محیط کیے رہتا ہے اور اُس وقت کہانی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح مصنف نے مغربی تہذیب کی ظاہری اور باطنی تصویریں بہت نفاست اور دردمندی سے کھینچی ہیں۔

آخر میں جج اپنا فیصلہ سناتا ہے تو مصنف کا مرکزی نقطۂ نگاہ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے اور شہزاد کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ جج کے فیصلے کا احترام کرے۔

شہزاد ملک اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے جسے مصنف نے بہت خوبصورتی

سے تراشا ہے۔ اس کردار کے ذریعے کناڈا کی اُس سوسائٹی ہی کی نہیں مغرب اور مشرق کی اقداری کشمکش کی بڑی عبرت ناک عکاسی کی ہے۔ جیوتی کا کردار بہت صحت مندانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ بہت نڈر ہے، کسی کے آگے جھکتی نہیں ہے وہ، وہ کرنا پسند کرتی ہے جو اسے اچھا لگتا ہے مگر قانون کے سامنے مجبور ہو جاتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ اس ناولٹ کا بہت مثبت پہلو ہے۔

جگہ جگہ ناولٹ میں انھوں نے غالب کے اشعار کا برمحل استعمال کیا ہے بعض اشعار کے ٹکڑے بھی اپنے جملوں میں استعمال کیے ہیں جو اسلوب بیان کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ناولٹ کے ابواب کے عنوانات بھی غالب کے اشعار کے مصرعوں پر رکھے ہیں جو کہانی سے بہت مطابقت رکھتے ہیں۔

ہارون ایوب

"مقدس جیل" ---- ڈاکٹر خالد سہیل

ناشر۔ ۱۲۹۶، بلور اسٹریٹ ویسٹ۔ ٹورنٹو (کناڈا)

ملنے کا پتہ:۔ نصرت بلشرز، حیدری مارکیٹ۔ لکھنؤ

دوسرا ناولٹ "مقدس جیل" دراصل ایک طویل افسانہ ہے عرب ممالک کے رہن سہن پر ہے اور وہاں کی عورتوں کی حالت پر گہرے اور تیکھے طنز کیے ہیں موضوع وہی مشرق و مغرب کی اقداری کشمکش ہے جن کے دو پاٹوں میں فرد کی زندگی پس کر رہ جاتی ہے۔

وارنیکا ایک ایسی لڑکی ہے جو پلی بڑھی تو کناڈا میں مگر خدمت خلق کے جذبے سے نرس کی حیثیت سے عرب آجاتی ہے مگر یہاں کی تنہائی سے اکتا جاتی ہے کیونکہ باہر کی زندگی میں عورتوں پر بڑی سخت پابندیاں ہیں۔ وہ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتی ہیں یہاں تک کہ بازار بھی نہیں جا سکتی ہیں۔ وہ خدمت خلق کا کام پابندیوں کی وجہ سے پورا نہیں کر پاتی اور تنگ آکر وہیں

اپنے ملک چلی جاتی ہے۔

موضوع نیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔ مصنف خالد سہیل خود اس ناولٹ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"میرا اس کہانی کو لکھنے کا مقصد کسی کے مذہبی یا روحانی جذبات کو مجروح کرنا نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ماحول اور معاشرہ یہاں لاکھوں انسان، انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کی روشنی حاصل کرنے جاتے ہیں۔ ان شہروں کی گلیوں اور بازاروں میں آج بھی انسان ظلم کے اندھیروں میں زندگی گزار رہے ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ عرب ممالک کے موضوع پر اردو ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جب کسی مصنف نے قلم اٹھایا بھی ہے تو جذباتیت سے مغلوب ہو کر قصیدہ خوانی پر اتر آیا ہے۔ وہاں کے انسانی حقوق کی بات کسی نے نہیں کہی ہے۔ وہاں کی عورتوں کے مسائل پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اس موضوع پر خالد سہیل کا یہ چھوٹا سا ناولٹ ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔

کہانی کو پیش کرنے کا انداز دوسرے طویل افسانوں کے مقابلے میں مختلف ہے۔ ایک کردار ڈائری کے سہارے بہت سے چھوٹے چھوٹے کردار تراشے ہیں جو قاری کے ذہن پر ایک غیر فانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

اس ناولٹ "مقدس جیل" میں سماج اور عورتوں کی بہبود کا مذہب ہے، دوستی کی رفاقت ہے، انسانی دوستی کا گہرا رنگ ہے، ایثار ہے۔ یہ ناولٹ بہت دل چسپ اور موضوع کے اعتبار سے بہت نرالا ہے۔

(تبصرہ نگار: ہارون ایوب)

صبح کا ستارہ (مجموعہ کلام) ——— احتشام اختر
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، صفحات ۱۰۴ قیمت [illegible]

شروع کی غزلوں میں گو ردیف غزلوں پر غالب آگئی ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ مجبوری دور ہوئی ہے اور احتشام اختر کی غزلوں میں لہجے کی طرف نے جگہ پائی ہے۔ ؎

مجھے مٹانے کی کوشش فضول ہے یارو
میں مثل موج صدا ہوں مجھے زوال کہاں

اور اس لازوال آواز کی لہروں میں ایسے شعر بھی ہیں۔ ؎

پیسے والے نیند سے محروم ہیں — جھونپڑی میں سو رہے ہیں آدمی
رات کو چلنا مجھے مشکل ہوا — راستے میں سو رہے ہیں آدمی

دل میں چبھتے تھے وہ کانٹوں کی طرح — جسم تھا جن کا گلابوں کی طرح

احتشام اختر جدیدیت سے وابستہ ہیں لیکن دبلے میں انھوں نے شاعری میں سماجی اور سیاسی شعور کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ اعتراف محض لفاظی نہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار اس حسیت اور اس سیاسی اور سماجی دردمندی کے گواہ ہیں اور سچ بھی تو ہے کہ ؎

اڑنا یہ ڈال ڈال پہ اچھا تو ہے مگر
پرواز کا مزہ تو میاں آسماں میں تھا

احتشام اختر اپنی غزلوں میں نغمگی اور دردمندی کے آمیزے سے کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اسی لیے ان کی بعض غزلوں میں قافیہ ردیف اور وزن میں بھی ندرت ہے اور لہجے اور لحن کی بھی ؎

دل کے اوراق پہ لکھتا رہا برسوں جن کو
وہی افسانہ ہواؤں میں اڑاؤں گا میں آج

خاص طور پر ہندی کے عام فہم اور شیریں الفاظ سے غزل کو سجانا ان کا کام ہے۔ ؎

تمہیں ارپت یہ میرے شعر ہیں کلپنا کے ہیں
کہ جیسے آرتی میں پھول یہ آرادھنا کے ہیں

سادہ انداز بیان اور بے ساختگی کے ساتھ نظم ہونے والے مضامین۔ ان کی بعض غزلوں کو دل کش اور وجد آفریں بنایا ہے۔ مثلاً ؎

گگن پر دل کے جو چھایا بہت ہے
اسی بادل نے ترسایا بہت ہے

۱۰۴ صفحات کے اس مجموعے میں جگہ جگہ ایسے دل نشیں اشعار دامن کھینچتے ہیں اور احتشام اختر کے شعری سفر سے توقعات وابستہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ (م۔ح)

"اردو اِن ٹو ویکس" (URDU IN TWO WEEKS)

مصنف: ڈاکٹر نصیر احمد خاں

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی ۶۷ صفحات ۱۱۲ قیمت: ۵/-

انگریزی میں اردو کی یہ نئے طرز کی کتاب ہے جس میں انگریزی حروف کے ذریعے ۲۱ اکائیوں میں اردو کے حروف، ان کی آوازیں اور ان کے اِملا اور ان کو ملا کر لکھنے کے ضابطے سکھائے گئے ہیں لکھنے کی مشق کے لیے ۲۰ صفحات مخصوص کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب گو صرف ایسے ہندی داں حضرات کے لیے ہے جو انگریزی جانتے ہوں مگر دوسروں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی اردو سکھانے کا یہ حیات اللہ انصاری کے "دس دن میں اردو" کے بعد سب سے کم وقت میں اردو سکھانے والا قاعدہ ہے اور اپنے سائنٹیفک طریق اور سائنیاتی شعور کے اعتبار سے قابل تعریف ہے۔

(م۔ح)

"فکرِ اقبال کی سرگزشت" ——— از: ڈاکٹر عبدالحق [illegible]
ناشر: رحمان منزل، بلوا گھاٹ، جون پور (یو پی) صفحات ۱۷۶ قیمت [illegible]

عبدالحق صاحب ماہرِ اقبال کی حیثیت سے اب معروف ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے میں اقبال پر ان کے دس مقالے شامل ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری مقالہ یعنی "اقبال کا شعری آہنگ" اور "فکرِ اقبال کی سرگزشت" کو کل سرمایہ کی حیثیت حاصل ہے۔

اقبال کے آہنگ کی تشکیل کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق نے فلسفیانہ جہت، جوش و خروش، نغمگی، تکرارِ صوت، مترنم اور غیر انفی آوازوں کے ساتھ خوش آہنگ قافیوں اور ردیفوں کے استعمال، اجزخوانی اور سیال صنعت ہونے کو بڑی اہمیت دی ہے لیکن اس کی نشان دہی بھی شاید ضروری تھی کہ یہ اقبال کی پوری شاعری کے سبھی ادوار پر محیط نہیں۔ مختلف ادوار میں ان خصوصیات میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے ہاں فکر و اسلوب دونوں سطح پر شاعر اور ملا کی کشمکش مبلغ اور فن کار کی کشمکش جاری رہی ہے اور اس نے ان کے آہنگ کو بھی متاثر کیا ہے۔

فکری سرگزشت میں جو بات سب سے زیادہ متاثر کن ہے بحیثیت انسان اقبال کی زندگی کے حوادث کا تطابق ان کے فکری اور فنی ارتقا سے (ص ۲۹/۲۸) اس پہلو میں ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے نظریات کے رد و قبول میں اقبال کی ذاتی (اور سماجی) زندگی کے محرکات کا مطالعہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

اسی مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے ڈاکٹر عبدالحق نے مجموعے کے آخری مضمون میں اٹھایا ہے اور بغیر لگی لپٹی رکھے صاف لفظوں میں مظفر برنی صاحب کی علی الرغم کہہ دیا ہے کہ وطن دوستی فکرِ اقبال کی ابتدا ہے انتہا نہیں (ص ۱۳۵) گو وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ "(اقبال کے نزدیک) ہندستان کو غلامی سے نجات دلانے کا ایک فکری راستہ یہ بھی تھا کہ عالمِ اسلام کو بیدار کیا جائے اور اس [illegible] طاقت کو یہاں کی جابرانہ حکومت کے خلاف استعمال کیا جائے" ص ۱۳۹

غرض اس مجموعے میں اقبال کے شعری، مذہبی اور سیاسی جہات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اقبال کے شارحین پر اور مرتبین اقبال پر جائزہ اور تجزیاتی مضامین بھی شامل ہیں۔

البتہ مصنف نے اقبال سے ذرا آگے بڑھ کر ان پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی ہے اور اقبال کے کمزور گوشوں سے خود اقبال کے لفظوں میں آسان گزر گئے ہیں ضرورت یہ بھی ہے کہ اقبال کی فروگذاشتوں کی نشان دہی بھی کی جائے تاکہ اقبال پرستی کی جگہ صحت مند اور معروضی اقبال شناسی عام ہو۔

رسالہ "شاعر" اقبال نمبر بمبئی (جلد اول) ـــــ مرتب: افتخار امام

صفحات: ۶۳۹ ۱۹۸۸ء قیمت: ۵۰/-

اقبال پر اتنا کچھ لکھا اور چھاپا جا چکا ہے کہ اس موضوع پر کچھ نئی بات کہنا دشوار ہے مگر افسوس صد افسوس افتخار امام کو کہ انھوں نے بالکل نئے انداز کا "اقبال نمبر" مرتب کیا مضامین تو اس میں بھی ہیں مگر زاویۂ نظر کی تازگی ہر مضمون میں موجود ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال پر چار نایاب کتابیں اور بعض نایاب خطوط اور مضامین اس نمبر میں چھاپے گئے ہیں۔ مظلوم اقبال اور قادیانیت کے بارے میں اقبال کے سلگتے ہوئے رویوں کی داستان پہلی بار "شاعر" کے "اقبال نمبر" میں مبسوط انداز سے ہندستان پہنچی ہے۔ محمد امین زبیری کی خدوخال اقبال بھی نئی معلومات فراہم کرتی ہے۔ غرض "شاعر" کا "اقبال نمبر" میں ایسی متعدد دولتیں لیے ہوئے ہے جن کی بدولت اقبال شناسی اس نمبر کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔

رسالہ "فن اور شخصیت" بمبئی گنیش بہاری طرز نمبر ـــــ مرتب: صابر دت

قیمت: ۱۰/-

صابر دت جب کبھی فن اور شخصیت کا خصوصی نمبر شائع کرتے ہیں وہ اردو دنیا کا اہم واقعہ ہوتا ہے۔ اس بار انھوں نے ایک ایسے شاعر کو خاص نمبر کے لیے چنا

جس کا مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا اور گنیش بہاری طرز کے منتخب کلام اور ان پر منتخب مضامین شائع کر کے حق ادا کر دیا

"عام سا ردِ عمل" (مجموعۂ کلام) ——— شارق کیفی

ناشر: ۱۳۲، گڑھی راؤ پہاڑ سنگھ، بریلی صفحات ۱۴۳ قیمت: ۵/-

۱۹۷۸ء سے اب تک کی غزلوں کا یہ انتخاب مزے دار اور لطیف اشعار سے خالی نہیں۔ غزلوں میں بعض جگہ ردیفوں نے مزے میں اضافہ کر دیا ہے جیسے

روز کا اک مشغلہ کچھ دیر کا اس گلی کا راستہ کچھ دیر کا
پھر مجھے دنیا میں شامل کر گیا خود سے میرا واسطہ کچھ دیر کا

بعض جگہ غزل میں نئے زاویے بھی اُبھرے ہیں۔

حقیقتوں کو جاننے کی کوششیں فضول ہیں
حقیقتیں یہی نہیں رہیں گی انکشاف تک

کہیں امیجری اور فضا نے غزل کو نیا لہجہ دے دیا ہے۔

غلط بیان دلا تو دیے تھے اشکوں سے
مگر یہ ٹوٹنے والے گواہ کس کے ہوئے

شارق کی غزلوں میں رسیلا پن اور انوکھا پن موجود ہے۔ احساس اور پیرایۂ بیان دونوں کی تازگی ہے اور ان کی غزلوں سے نئی کیفیات کی توقع کی جا سکتی ہے بشرطیکہ انھیں تقلید کے بھیڑیے نہ اٹھا لے جائیں۔ چلتے چلتے بعض مزے کے شعر سنتے چلیے:

تمام شہر نہ جینے میں ہے نہ مرنے میں
یہ اس طرح کے ادھورے گناہ کس کے لیے

کھڑے تھے دیر سے بس یوں کہ تیرے شہر کا نام
کہیں لکھا تھا جسے بار بار پڑھتے رہے

شارق کی شاعری سے اردو غزل کو امیدیں وابستہ ہیں۔

تبصرہ نگار: م۔ ح

"شاخِ مرجاں" (مجموعہ کلام) ——————— وارث کرمانی

زیادہ تر نظموں کے تین حصے ہیں: تشبیہیہ تمہید، گریز اور زیادہ تر مختصر اختتامیہ جو کبھی کبھی چونکا دیتا ہے۔ لیکن "نیا آدمی" "اکتوبر کا مہینہ" "ایک تین سال کی بچی" دوسرے انداز کی ہیں۔ تصورات پہ ماضی پرستی اور زندگی کی شکست و ریخت کا تاثر غالب ہے۔ مگر عصری آگاہی اور انسانیت دوستی کی رَو بھی جگہ جگہ نمایاں ہو جاتی ہے (نیا آدمی، درد آشنا نگاہیں)

"شاخِ مرجاں" کی نصف درجن نظموں میں یادِ ماضی اور تجہل کی ملاوٹ سے ایک خوابوں کا جہاں تعمیر ہوتا ہے اور پھر وقت کے بپھرے ہوئے طوفانوں کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں "ندیم تنہائی" کا امتیاز یہ ہے کہ شاعر صرف منصوبے بناتا ہے جہاں تصور کے تانے بانے جوڑنے کے، اور اس میں اس کی ندا کے ساتھ رنگ بھرنے لگتا ہے

ع اے صبا، اے ندیم تنہائی!

"فادمہ" میں نفسیاتی پہلو ہیں اور خود احتسابی ہے اُس برہنہ ذہن کی جسے زُہد کی چادر ہی لباس عطا کرتی ہے۔

بیان کے پیرائے کلاسیکی ہیں۔ ع "ہونٹوں پہ ہنسی، رخ پہ حیا یاد رہے گی۔"

ع "شہر میں پھر وہ ہیں میہماں آج کل" جیسی مسلسل غزلیں سماں باندھ دیتی ہیں۔

تبصرہ نگار: سعید الظفر صدیقی

"جینے کی ادا کا شاعر" ——————— منظر شہاب

منظر شہاب کے وجود کا کوئی لازمی حصہ ان کی ذات سے ٹوٹ کر جدا ہو گیا ہے۔ مگر وہ اب بھی یادوں کے حصار میں گردش کرتا رہتا ہے۔ پانے اور کھونے کی اسی لذت اور اذیت سے منظر شہاب کی شاعری کا منظر نامہ ابھرتا ہے۔ مگر اس ٹوٹے ہوئے حصے

کو گرفت میں لینا اس لیے دشوار ہے کہ "ساتھ یوں بھی گزرتا ہے سمجھ میں عشق کی
ایک چاہت کئی محبوب میں بٹ جاتی ہے"۔ اور یوں بھی منظر شہاب "زندگی اور
ادب کو معلوم سے نامعلوم کے دو طرفہ اثباتی اور منفی سفر" کا عمل سمجھتے ہیں اور
زندگی ہی کی طرح ادب کو بھی کسی مخصوص رنگ میں مقید نہیں مانتے۔ یہی وجہ ہے
کہ ان کے یہاں ایک دھنک رنگ کیفیت ابھرتی ہے۔

بنیادی طور پر ان کے شعری کردار کی تعمیر رومانی عناصر سے ہوئی ہے۔ مگر
انھیں وہ ذہن بھی نصیب ہے جو علل کو معلول سے جدا کر کے دیکھنے کا عادی نہیں ہے
انھوں نے زندگی کو "اختلافِ معانی" کے حوالے سے سمجھا ہے اور فن کار کو صرف کی
جادوگری اور آہنگ کی عشوہ طرازی کا رمز شناس ہونا لازمی مانا ہے۔ ساتھ ہی
ساتھ اُن کا یہ بھی یقین ہے کہ "ایسے موضوعات جو سماجی ارتقا میں بارج ہوں تخلیقی
ادب کی سطح کو پست کر دیتے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ منظر شہاب نے کبھی "ذات کے
محبس اور انانیت کی قبر" کو جائے عافیت نہیں سمجھا۔ وہ سرخ پھولوں کی چاہت
میں زرد پتوں کی طرح بکھر کر بھی اپنی انگنائی میں تلسی کا ایک ننھا سا پودا اُگانے کی
تمنا کرتے ہیں اور تیغ ستم سے حنا حنا ہو کر بھی درد کا لمو زر نگار کر سکے ہیں۔ ان کی
آنکھیں درد کی شاخوں میں بھی پھولوں کے چراغ دیکھتی ہیں۔ شاید اسی لیے منظر شہاب
اس وقت بھی ذات اور کائنات سے وابستہ رہے جب کہ ان کے اکثر ناموری منظر
نے جدیدیت کی چکا چوند میں اپنے چہرے بدل لیے۔ یہ حقیقت اپنے آپ میں کچھ کم
دلنواز نہیں کہ زندگی کو جمیل تر بنانے کے خواب ان کی آنکھیں کبھی نہیں بھولیں
اور یہ خواب کبھی معشوقِ ستم شعار اور کبھی حسنِ بہار کی صورت ان کے دل میں
پرورش پاتے رہے۔

"پیراہنِ جاں" منظر شہاب کے بیالیس سالہ ذہنی سفر اور شعری تجربات
کا حاصل ہے جس میں کل ۲۳ نظمیں، ۴۲ غزلیں، ۲ گیت، ۳ آزاد قطعات اور
کچھ رباعیات ہیں۔ ظاہر ہے اتنی طویل مدت کے پیش نظر یہ سرمایہ کافی زیادہ

ہیں۔ اتنے عرصے میں تو ان کے بعض ہم عصروں نے کوئی نصف درجن مجموعے شائع کر دیے ہیں۔ گویا منظر شہاب کو کار زمانے نے بیان شوق کا موقع بہت کم دیا۔

منظر شہاب کو پیکر تراشی اور فضا آفرینی سے ایک فطری لگاؤ سا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نظم "چاندنی رات" بھی ایک خوب صورت مثال ہے۔ اس میں بھی ایک دلکش طلسماتی رات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ رات کا عالم ہے، ہر طرف سیلِ نور جاری ہے، کائنات جیسے کنول میں سمایا ہوا ساگر ہے۔ دور نیل گگن میں چاندنی کی کشتی بہشت کا مانجھی کھے رہا ہے، کہیں کہیں روئی کے گالوں کی طرح شفاف ابر کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے ہیں، جھومتی گاتی زمزمے سناتی دھرتی کی گود میں کھٹولے پر ایک معصوم چاند کا ٹکڑا سو رہا ہے، پاس ہی ماں اپنا سمٹا سمٹا وجود لیے لیٹی ہے جس کا آنچل اوس میں بھیگا ہے اور نینوں میں کاجل پھیلا پھیلا ہے۔ ماں کے اس تقدس حسن اور بچے کی معصومیت نے حسن کائنات میں رفعت اور ربودگی پیدا کر دی ہے۔ ایسے میں کوئی شخص اگر کوئی آرزو کر سکتا ہے تو یہی کہ ؎

گردشِ وقت کاش تھم جاتی　　صبح ہوتی نہ کوئی شام آتی

عشقیہ جذبات کی حامل نظموں میں "مشورہ" "لہجے کی شوخی" برجستگی اور تیکھے پن کی عمدہ مثال ہے۔ زیریں لہروں میں ایک گہری اذیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ شاعر نے اپنی محرومی کو چھپانے کے لیے شاید شوخ لہجہ اختیار کر لیا ہے ؎

تم بھی گستاخ اداؤں کو سکھاؤ تہذیب
شوخ جذبات کو سنجیدہ بنالوں میں بھی
معتدل تم بھی بناؤ بت کافر کا مزاج
عقل کی راہ، محبت کو دکھاؤں میں بھی

"حسن بیان" کا پہلا حصہ نظموں کا ہے۔ پھر رباعیات، آزاد قطعات

اور ۲ گیت ہیں، سب سے آخر میں غزلیں ہیں۔ ان کی غزلیں جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے پر محیط ہیں، دانشوری کا رنگ لیے ہوئے ہیں، کہیں کہیں اقبال کی آواز بھی چمک اٹھتی ہے۔ ؎

وہ سفید خواجگی تھی، یہ سیاہ خواجگی ہے — وہ طریق گمرہی تھا، یہ طریق رہزنی ہے
نہ محبتوں کا حاصل، نہ صلہ ہے محنتوں کا — کہ متاعِ کوہکن پر وہی جبرِ خسروی ہے
نہ میرِ عشق میں میری نوا سے گرمیٔ شوق — بلا کشانِ محبت کی آبرو ہوں میں
مرے جنوں نے سکھائی ہے بے خودی مجھ کو — بلا سے رند نہیں غیرتِ سبو ہوں میں

یہ اقبالیت فکر کی کم، اسلوب کی زیادہ ہے۔ لیکن جب کبھی منظر شہاب دانشوری کے آسمان سے اتر کر وادیٔ دل میں آئے ہیں تو ان کی غزلوں میں کہیں جذبات کی شوخی اور شدت، اور کہیں درد اور المناکی کی کسک پیدا ہو جاتی ہے۔ ؎

جانے کیوں آج بھی ویرانۂ دل تک آکر — اکثر آواز ترا دیدۂ تر دیتا ہے
لذتِ زخم مجھے موت سے برگشتہ کر — پھر کوئی دعوتِ پیکاں نظر دیتا ہے
فریب کار سہی دل کا غم گسار تو تھا — وہ اک خیال جو برسوں رہا گماں کی طرح
درد مندی بھی ہو گئی رسوا — جبر کا کیا گلہ کرے کوئی
خود ہی رونا ہے، خود ہی چپ ہونا — درد کب ساتھیوں نے بانٹا ہے

منظر شہاب لفظوں کے رمز شناس ہیں۔ ان کے یہاں خنجر، لہو، رہگذر، رات، راگنی، شجر، جنگل، آواز کی تصویر، دھوپ، خواب، پہاڑ، آگ، بگولا، وغیرہ کبھی زندہ پیکر، کبھی بامعنی نشانات بن کر ابھرتے ہیں۔ ؎

نرور صبح تلک بارشیں ہوئی ہوں گی — اداس آنکھ کا آنگن دھلا دھلا سا ہے
قاتل نے پھر لکھا ہے خنجر پہ نام میرا — ہو دوستی تو ربطِ باہم نہیں بدلتا
سراغِ قتل، شہادت، ثبوت سب گونگے — لہو خموش تھا، خنجر بھی بے زباں نکلا

اب تک یہ سنا اور مانا جا رہا تھا کہ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا مگر نو دولتیوں کے اس عہد نے وہ قانون جنم دیا ہے کہ زبانِ خنجر کی طرح لہو بھی گنگ ہو کر رہ گیا

ہے مگر منظر شباب اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین بھلے ہی آسمان کی طرح طرز ستم ظریفی اختیار کرے، غم شرار بلائے جان بن جائے اور حالات کی آندھیاں تیز تر ہو جائیں لیکن جینے کی ادا سلامت رہنی چاہیے۔ ؎

پیراہن جاں چاک رہے، تیز ہوا میں
طوفان میں جینے کی ادا چاہیے یارو

تبصرہ نگار: سید احمد تمیم

عبدالرحیم خانخاناں ——— شیخ سلیم احمد

ناشر: خسرو کتاب گھر، ۱۵ بستی نظام الدین، نئی دہلی ۱۳ ۱۹۹۰ء صفحات ۱۸۲ قیمت ۱۰/-

عبدالرحیم خانخاناں کی شخصیت کئی حیثیتوں سے نہایت ممتاز ہے وہ بڑا امیر ہے جس کی تعریف میں اتنی زبانوں کے اتنے معروف شاعروں نے نظمیں کہیں اور قصیدے لکھے اور ان شاعروں میں عرفی جیسا شاعر بھی تھا جو بادشاہان وقت کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ شیخ سلیم احمد نے اس بھولے بسرے امیرزادے، فوجی جرنل، وزیر، علم دوست، ادب اور ادب نواز شاعر کو پھر سے زندہ کر دیا ہے اور ۱۸۲ صفحات میں اس کی شخصیت اور کارناموں کا تعارف پیش کر دیا ہے۔ اس سے شاید اندازہ ہو کہ خانخاناں کو بھلا کر ہندستانی تہذیب نے اپنی دھنک کا ایک بیش قیمت رنگ ضائع کر رکھا ہے ان کی کوشش قابل داد ہے البتہ برج بھاشا کو ہندی کہہ کر صفحہ پر زیادتی کی ہے یہی زیادتی ص ۱۲۰ اور ص ۱۵۹ پر بھی ہوئی ہے اور اسے "ہندوی" کہا گیا ہے۔ جنگوں اور معرکوں سے زیادہ سروری وہ نظریاتی کشمکش تھی جو ابوالفضل اور فیضی کی روشن خیالی اور ملا بدایونی اور دوسرے رجعت پسند اور کٹر پنتھی عناصر کے درمیان جاری تھی جس کا عکس ص ۳۴ پر ہے

کتاب شیخ سلیم احمد بڑے سلیقے سے لکھی ہے خانخاناں کی شخصیت کے سبھی پہلو [illegible] گئے ہیں اور ان کے دور کے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آئے ہیں [illegible] شستہ اور رواں ہے اور کتاب میں ناول کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے

قیمت کچھ زیادہ لگتی ہے مگر ان دنوں انسان کی جان کے علاوہ اور کونسی شے ہے کہ خون جگر سے لکھی ہوئی کتاب ہی کی گرانی کا شکوہ کیا جائے۔

(م۔ ح)

۱۔ "محرک"۔ شاعر شاہد کلیم کے ۱۲۲ صفحات پر پھیلے ہوئے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو حق شناس پبلی کیشنز نگر نولی، پٹنہ ۴ سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ قیمت تیس روپے محض مضامین خیال انگیز ہیں گو "جدیدیت" کے اثرات نمایاں ہیں۔ گو "نئی نظم کا قاری کا بہ مرکزی استدلال محض اردو قاری پر یہ الزام کہ وہ "سہل پسند اور تن آسان" ہے نظم کی ناکامی کا عیب سا جواز لگتا ہے۔

۲۔ "موسم موسم روپ"۔ شاہد کلیم کا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۹۰ء میں محلہ دودھ کٹورہ آرہ سے شائع ہوا۔ ناشر ہیں ثروت پبلی کیشنز پھلواری کوٹھی۔ دریا پور، پٹنہ ۴ صفحات ۱۲۸، قیمت ۴۰/- بیس نظمیں ہیں باقی غزلیں۔ "جدید" شاعروں کے اکثر مجموعہ ہائے کلام کی طرح یہ بھی حمد سے شروع ہوتا ہے۔ شاعری شادابی اور تازگی سے خالی نہیں ہے۔ نظموں میں قنوطیت اور گہری اداسی کے بجائے امید اور حوصلے کی جھلکیاں ہیں خاص طور پر سرحد دشت پر ریگستی پرچھائیاں اور عجیب لوگ اور اس کا یہ مصرعہ بھی۔

عجیب لوگ تھے وہاں
دعائیں مانگتے تھے آفتاب کے زوال کی

قابل توجہ ہیں۔ غزلوں میں کہیں عصر حاضر کے شاعروں کی طرح میں گونج اٹھتی ہیں۔ پھر بھی شاہد کلیم کی شاعری محض تکرار اور تقلید نہیں ہے۔ دو شعر ان غزلوں کی دردمندی کے ثبوت ہیں ؎

سناٹے سے پوچھیں شاید سناٹا ہی بولے
شہر کا اک اک شخص ہوا ہے پتھر کیسے کیسے

تشنگی ریت پر سبزہ اگا دیا میں نے
کہیں تو خون کی برسات معتبر کر دی

۲۔ گھر داب (ڈرامے)۔ کمال احمد کے دو ڈرامے گھر داب اور پیا ترا، اس ۱۲۵ صفحے کے مجموعے میں شامل ہیں۔ ناشر ہیں شاداب کتاب گھر ڈی ۲۲/۱ سرسید احمد روڈ کلکتہ ۱۲، قیمت ۱۶/۔ سال اشاعت ۱۹۸۸ء دونوں ڈرامے بار بار اسٹیج ہو چکے ہیں۔ ڈرامے آج کی حقیقتوں پر طنز ہیں اور ان سے متاثر ہونے والے مختلف طبقوں کے لوگوں کی سرگزشت پیش کرتے ہیں۔ مکالمے مختصر، بلیغ اور موثر ہیں۔ کہیں کہیں علامتی انداز زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ دوسرا ڈراما تخیلی ہے اور ایک ایسے ملک کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں فرقہ وارانہ نفرت، لوٹ مار اور پیسے کے لالچ انسانوں پر غلبہ نہیں پا چکے اور ایک بیاتری وہاں یہ سب برائیاں پھیلاتا ہے اور انھیں تہذیب کا نام دیتا ہے۔ ڈراما موثر اور مختصر ہے۔

۳۔ شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ۔ مصنف: ڈاکٹر شیخ عبدالرحیم انصاری (ڈنڈیلہ کلاں، ڈاکخانہ رہلہ ضلع پلاموں ۸۲۲۱۲۴) ۱۹۹۰ء صفحات ۲۴

قیمت: ساٹھ روپے

محنت سے لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں مذہبی، علمی، ادبی، تعلیمی اور فلسفیانہ مقالات کا جائزہ مصدری لیا گیا ہے۔ آخر میں شبلی کے اسلوب پر ایک باب ہے اور شروع میں احوال و آثار پر۔ تنقیدی مقالات میں شبلی کے خیالات کا تجزیہ نہایت اہم ہے اور مصنف نے اس جائزے میں دیانت دارانہ معروضیت قائم رکھی ہے۔ اس کا ایک ضمنی مگر اہم فائدہ یہ ہے کہ شبلی کے زمانے میں جو اہم موضوعات اور تصورات توجہ طلب ہیں ان سب کا احاطہ ہو گیا ہے اور شبلی اور ان کے معاصرین کے رویے اس باب میں واضح ہو گئے ہیں۔

۴۔ عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر ——— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

۱۹۹۰ء، ناشر مصنف (کوہسار، بارہ پور، بھاگلپور) صفحات ۳۰۰ قیمت ۱۲/۔

شرر پر اور بھی کتابیں لکھی ہیں مگر مناظر عاشق ہرگانوی نے ناول نگاری اور شرر کی [illegible] الگ راہ نکالی ہے اور ان کی شاعری پر مدلل اور تفصیلی بحث کی ہے۔ [illegible] اس تقابلی سے ان کی اہمیت ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے اس نئے موضوع پر

[illegible] سلیقے سے لکھا ہے۔ شرر کی معرکۂ آرا نظموں کے علاوہ مثنوی [illegible]
ڈرامے ظلم و تلاش پر بحث خیال انگیز ہے۔ (صفحہ ۱۳۴)

۶۔ متاعِ آخرِ شب (مجموعۂ کلام) ——————— محسن زیدی

مرتبین: محمود سعدی، طرح نو، ایمن آباد، ۱۹۹۰ء، صفحات ۱۲۸، قیمت ۔/۴۰

کلاسیکی مزاج کی پختگی کے ساتھ سادہ اور دل نشین پیرائے کی غزلیں اس مجموعے کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان میں احساس کی طرفگی بھی ہے اور ردیف قافیے اور دل نشیں اور کیف آگیں بحروں کی سحر آفریں کھنک اور گونج بھی ہے جو پڑھنے والے پر دیر تک چھائی رہتی ہے۔ خوبی اس شاعری کی یہ بھی ہے کہ یہ کرتب بازی اور رواج زدگی سے خالی ہے، سیدھی سادی باتیں ہیں، دل سے نکلتی ہیں، دل میں بیٹھتی ہیں۔ اونچی اڑانیں یہاں نہیں ہے، ہاں شناسا کیفیتوں کی دل آسائی ہے اور اسی میں محسن زیدی نے اپنے شاعرانہ تیور پیدا کیے ہیں۔ مثال کے لیے چند شعر کافی ہیں گو بعض غزلیں ایسی مرقع ہیں کہ ان میں سے کسی شعر کا انتخاب دشوار ہے۔ (مثلاً ہر چند یہ حق میں مرے اچھا نہیں ہوگا والی غزل) بہرحال چند شعر جن کی جھنکار دیر تک گونجتی ہے:

محسن زمانہ میرا مخالف تو تھا مگر ۔۔۔ میرا بھی تھا قصور میں سرکش ہی ایسا تھا

ہمیں جتنی ہے ان کی اب خبر پہلے نہ ہوتی تھی
وہ ہم سے اب ہیں جتنے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے
چلے آتے تھے طائر لوٹ کر اپنے بسیروں میں
نکل کر گھونسلوں سے دربدر ایسے نہ ہوتے تھے

تم ساتھ ہوا کرتے ہو ہنگامِ سخن بھی ۔۔۔ ہم شعر بھی کہتے ہیں تو تنہا نہیں کہتے

کیسے زرے سبھی بولتے منہ بند ہوئے
اب کسی منہ سے کبھی حق بات نکلنے سے رہی

سوچنا اور اداس ہو جانا ۔۔۔ حال ہے دل کا آج اور ہی کچھ

بڑھ کر اٹھا لو اب بھی جو اوراق مل سکیں ۔۔۔ جلدی کرو کہ پھر [illegible]

۷۔ گمشدہ پاسے سے غزلی (تنقیدی مضامین) ——— سید خورشید عالم

ناشر مکتبہ دانیال کراچی ۱۹۹۰ء صفحات ۱۵۲ قیمت ۶۵/-

سید خورشید عالم لکھنؤ کے روڑے ہیں کناڈا میں ایک مدت سے مقیم ہیں لیکن ذہن کے دریچے کھلے رکھتے ہیں اور اردو کے قدیم اور جدید ادب سے گہری وابستگی ہے ان کے آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ ان مباحث سے عبارت ہے جو دورِ حاضر کی چٹ پٹے اور سرسری تنقیدی مضامین لکھنے والوں کے لیے اجنبی ہیں۔ تہذیب، جمالیات، ادب اور حقیقت، جبر، آمریت اور آزادیٔ اظہار کے ادبی رشتے ان کی توجہ کا خاص مرکز ہیں۔ ان سبھی مباحث میں سید خورشید عالم نے ایک متوازن مارکسی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے اور مختلف مسائل کی جدلیاتی اور طبقہ واری نوعیتوں کو واضح کیا ہے۔

دو مضامین البتہ سوانحی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ بات کی بات مری جان اور یادوں کے قبرستان بولتے ہیں۔ دونوں میں ہندستانی مہاجر کی سرگزشت بیان ہوئی ہے مگر تناظر محض پاکستان اور ہندستان کا نہیں بلکہ دورِ قدیم تک پہنچتا ہے اور عالمی تاریخ پر چھا تا ہے۔ لیکن اس تنوع کے باوجود ہر مضمون اور مقالے میں گہری وابستگی کے نشانات ملتے ہیں جو اپنے زمانے کو اور اس کے پیدا کردہ ادب کو اس کے سبھی متعلقات کے ساتھ سمجھنا چاہتی ہے۔

۸۔ زندگی کا رقص (افسانے) ——— م م راجندر

۱۹۸۵ء صفحات ۳۳۲ قیمت ۴۵/-

"زندگی کا رقص" کے افسانے پڑھتے وقت عجیب تازگی کا احساس ہوا ایسی تازگی جو مدتوں سے اردو افسانے سے غائب ہو چکی ہے۔ آج کل کے اکثر افسانوں کو پڑھتے وقت دماغ پر ایسا بوجھ اور اعصاب پر ایسا تناؤ ہوتا ہے جیسے ہڈیاں چٹخ رہی ہوں مگر "زندگی کا رقص" کے افسانے سچ مچ نشاط کار ہیں۔ یہ لذت اردو افسانے سے جانے کہاں اور کیوں رخصت ہو گئی۔

[illegible] نے اپنے [illegible] کہا کہ م م راجندر اتنے اچھے قصہ گو اور ایسے منجھے ہوئے

افساد [illegible] کے باوجود کہیں [illegible] بشیر [illegible]
اول میں [illegible] جواب [illegible] وہاں کی [illegible]
ان کے ظلم کو [illegible] رہنے دیا اور ان کے مشاہدے اور [illegible] کو [illegible] کر دیا۔

بہرحال ان کہانیوں میں انسانی رشتوں کا بڑی لطافتوں، نزاکتوں اور [illegible]
کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ "ایک ہار ایک جیت" میں چند بے تکلف دوست [illegible]
مجذوب سے جوئے میں جیتنے والا نمبر پوچھنے کی سعی کرتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں
مگر اس شکست کے اوان کیسی یگانگت اور بے تکلفی کے رشتے ابھرتے ہیں اور کہانی
پڑھنے والے سرشار کر جاتے ہیں۔ اسی طرح تین چہرے تین تاثر کہانی میں تہذیبی فضا
کا انوکھا پن دل موہ لینے والا ہے کہ یہ کہانی مشرقی ہندستان کے آخری کنارے کی
لپی اور لاڈینی جاتیوں کی زندگی کے اردگرد بنی گئی ہے۔ شاید مجموعے کی سب سے تاثر
کہانی "الجھن!" ہے جس میں عنفوان شباب میں ایک لڑکی کی نفسیات کو بڑی خوبی
سے پیش کیا گیا ہے۔ غرض "زندگی کا رقص" دل دوز اور نشاط انگیز کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

۹۔ رنگ ہزاروں خوشبو ایک (مجموعہ کلام) ——————— بیکل اتساہی

ناشر: اردو اکادمی۔ دہلی ۱۹۸۹ء صفحات ۱۳۶ قیمت -/۲۸

بیکل اتساہی مشاعروں کے بے حد مقبول شاعروں میں ہیں۔ اس مقبولیت میں
ان کے ترنم ہی کو دخل نہیں ہے ان کی لفظیات اور پیرایۂ اظہار کو بھی دخل ہے۔ انھوں نے
ہندی اردو ملواں زبان استعمال کر کے اسے اپنے گیتوں میں نئی مٹھاس اور گھلاوٹ
عطا کی ہے۔ موضوعات بھی وطن پرستی اور انسان دوستی کے ہیں۔ قومی رہنماؤں [illegible]
نظموں سے قطع نظر ان کی نظمیں اتحاد اور یکجہتی کے سلسلے میں پُرخلوص اور دردمند
احساسات کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ محرموں کی پہچان کے قائل نہیں، ہاں [illegible]
رشتوں کے خواہشمند ضرور ہیں۔ پھر وطن پرستی کی جو لے ان کے یہاں ملتی ہے وہ شاید
اردو شاعری میں اور کہیں اس قدر والہانہ پن کے ساتھ اور کسی [illegible]
دے گی ہر چند وہ وطن دوستی کے زمزمے گاتے ہوئے اہل وطن کی [illegible]

[illegible] کوئی کہیں ذکر تو کر رہا ہے ہیں مگر اس کے ذمہ داروں کے چہروں پر نقاب ہی [illegible] بنا دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ان نقابوں کی رنگا رنگی کی توصیف بھی کر جاتے ہیں۔

بہرحال گیت کو ایک نئی زبان دینے اور شعری مزاج کو ہندستانیت سے قریب تر کرنے کے لحاظ سے یہ مجموعہ اہم ہے۔

+ ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت ——— مرتبہ رشید الدین خاں

ناشر ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی ۱۹۸۹ء صفحات ۶۸۴ قیمت ۵۸/-

ابوالکلام آزاد پر مضامین کا یہ مجموعہ چھ عنوانات پر مشتمل ہے :۔ ذہن اور فکر، تفسیر و تفہیم (قرآن)، صحافت اور ادارت، انشا و اسلوب، سیاست اور قیادت، شخصیت اور کردار۔ ہر عنوان کے تحت ۲ سے ۷ تک مقالے شامل ہیں۔ رشید الدین خاں متوازن اور معروضی انداز میں مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لیا ہے اور ان کی زیادہ مقبول نہ ہونے کے اسباب اور خود ان کی شخصیت کے تضاد پر بھی روشنی ڈالی ہے دونوں اقتباسات توجہ طلب ہیں۔

> مولانا آزاد سے ناواقفیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے زمانے اور عہد میں ایسے لوگ کم ہیں جو ان کی اردو کے اسلوب، اس کے زور بیان، اس کے استعاروں اور الفاظ کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ عام طور پر یہ احساس نہیں ہے کہ ہندستان میں اردو زبان (سے) اجنبیت ہمارے عہد کا ایک نہایت اندوہناک المیہ ہے جس کے باعث ہم اپنی اور قومی تحریک کی بھی وراثت کے ایک معتدبہ حصے سے محروم ہو گئے ہیں۔ ص ۳۶

ابوالکلام آزاد کی فکر و عمل کی کاوشوں کی ناکامیابی کی اس سے بڑی دلیل [illegible] کیا ہو گی کہ جو زبان و ادب صدیوں کی طواں تہذیب کی تخلیق تھا اور جسے آزاد [illegible] آزادی کا وسیلہ بنایا آزاد ہندستان میں اجنبی ہو گیا۔

[illegible] اقتباس یہ ہے۔

"پھر مولانا آزاد کی دل آویز شخصیت میں بھی خود اپنے تضاد موجود تھے۔ ایک طرف یہ کوشش تھی کہ مذہبی استعاروں اور اصطلاحوں کی مدد سے مسلم عوام کے شعور کو فروغ دیا جائے اور دوسری طرف ان میں مشترکہ قومیت کا احساس بیدار کیا جائے جس کا مطلب تھا مسلم فرقہ پرستی، تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کی سیاست کے خلاف جدوجہد۔" ص۲۲

دراصل یہی وہ تضاد تھا (بلکہ ہے) جو مولانا آزاد ہی کو نہیں، گاندھی اور نہرو سے لے کر آج تک کے قومی رہنماؤں کو درپیش ہے اور اسی بنا پر ہندوستان میں سیکولرازم کا راستہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار ہو گیا ہے۔

اکثر مضامین میں ابوالکلام آزاد کے مذہبی اور سیاسی افکار میں تضاد کا ذکر ملتا ہے اور خاص طور پر مشیرالحق مرحوم اور انور معظم کے مضامین میں اس تضاد کا خیال انگیز تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ظفر احمد نظامی نے بڑی خوبی سے یہی تضاد جنگ آزادی میں آزاد کے مختلف رویوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تضاد ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ مذہبی، سیاسی اور تہذیبی تشخص اور متحدہ قومیت کے دھارے میں ملنے کا تضاد ہے جو آج بھی ہندوستان میں سیکولرازم کی راہ روکے ہوئے ہے۔ مذہب کو سیاست سے الگ کیے بغیر اس رکاوٹ کو دور کرنا ممکن نہیں اور برعظیم کے ممالک میں بورژوا اور جاگیردارانہ طبقے مذہب کے سیاسی استعمال سے باز رہنے کی وسعت نظر پیدا نہیں کر سکتے۔ آزاد بھی اسی طبقہ داری مجبوری کا شکار ہیں جو تضاد کی طرح ان کے یہاں ابھری ہے خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان کا تعلق ہندوستان کی اقلیتی فرقے سے تھا اکثریتی فرقے سے ہوتا تو یہی کمزوری قوم پرستی کہلاتی۔ بہرحال یہ مجموعہ مضامین آزاد شناسی کے سلسلے میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

موضوعات

۱۔	نجیب محفوظ کی کہانیاں	ڈاکٹر عبدالحق، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
۲۔	نجیب محفوظ کی کہانیاں (جائزے)	ایضاً
۳۔	غزل پارے	شجاع خاور
۴۔	آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم	مرتبہ عتیق اللہ
۵۔	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	مرتبہ تنویر احمد علوی
۶۔	آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	مرتبہ قمر رئیس
۷۔	آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	مرتبہ عنوان چشتی
۸۔	نوراللغات (حصہ اول و دوم)	شائع کردہ ترقی اردو بیورو
۹۔	ادبی تجزیے	صابر سنبھلی
۱۰۔	CONTEMPERORY URDU VERSE	راجندر سنگھ ورما
۱۱۔	MUSLIMS IN INDIA	شائع کردہ وزارت خارجہ حکومت ہند
۱۲۔	ٹوٹا ہوا آدمی	خالد سہیل کے دو ناولٹ
۱۳۔	رات کے آخر ہوتے ہوتے (مجموعہ کلام)	عین تابش
۱۴۔	سیل وجود (مجموعہ کلام)	ساجدہ زیدی
۱۵۔	دھنک احساس کی (مجموعہ کلام)	راج نرائن راز
۱۶۔	اکیلی ایضاً	بلراج کومل
۱۷۔	منظر پس منظر	ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں
۱۸۔	فکر و تحقیق (ششماہی)	ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی
۱۹۔	زمین (مجموعہ کلام)	اختر الایمان
۲۰۔	چاندنی بیگم (ناول)	قرۃ العین حیدر
۲۱۔	گردش رنگ چمن	قرۃ العین حیدر

مکتوبات

میں تو آپ کو لکھنے والا ہی تھا۔ عصری ادب کے اس شمارے میں شیخ عبداللہ کی کتاب سے متعلق کمال احمد صدیقی کا طویل تبصرہ دیکھا۔ انھوں نے یہ تو صحیح لکھا ہے کہ اس کی زبان دیکھنے کا کام میرے سپرد ہوا تھا۔ مضمون سے سروکار نہ تھا۔ میٹنگ کے ذریعے میرے پاس ابواب آتے رہتے تھے اور میں اُن میں حسب ضرورت صحت کر کے واپس کر دیتا تھا۔ کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ اکثر و بیشتر جگہ غلطیاں رہ گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اُس کاپی سے کتابت نہیں ہوئی جو میں نے دیکھی تھی یا پھر کاتب نے غفلت برتی ہے کتاب کی اشاعت میں خاصی تاخیر بھی ہوئی۔ یہ کام ۱۹۸۱ء کے نومبر میں میں نے ختم کر دیا تھا۔ شیخ صاحب کا انتقال ستمبر ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ یہ کتاب تو ۱۹۸۶ء کے شروع میں شایع ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ کم سے کم ایک باب حذف کیا گیا ہے مثلاً اندرا گاندھی پر بہت تلخ تبصرہ تھا وہ کتاب میں نہیں ہے۔ کمال احمد نے بہت سی پتے کی باتیں لکھی ہیں اس لیے ان کا تبصرہ بہرحال اہم ہے میں بھی اس پر کسی وقت لکھوں گا۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ چند صفحے آپ کے 'عصری ادب' کے لیے ہی لکھ دوں۔

آل احمد سرور۔ سری نگر

"عصری ادب" کا تازہ شمارہ دیکھا۔ ایوب مرزا اور کنول نین پرواز کی تحریریں بہت دل چسپی سے پڑھیں۔ وحید اختر کی نظم بہت خوب صورت ہے۔ انھیں جو صدمہ بیگم کی شہادت کا ہوا ہے اس سے تو آپ واقف ہیں۔ ایک بار ملا تھا کچھ بجھے سے تھے لیکن اب انھوں نے پھر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔

یہ معلوم تھا کہ آپ شاعری بھی کرتے ہیں اور نیم دخشاں [illegible]

لکھتے ہیں۔ اس شمارے کی جان "آتش چنار" پر کمال احمد صدیقی کا بے لاگ تبصرہ ہے۔ کشمیر کی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے اور اس عہد کے بیشتر واقعات کے وہ عینی شاہد ہیں۔ ان کی تحریر کی روشنی میں شیخ صاحب کے متعدد بیانات مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ بعض امور جن کا ذکر ضروری تھا شیخ صاحب نے مصلحتاً ان سے اعراض کیا ہے۔ بعض بیانات میں مبالغے کی بھی جھلک ہے۔ کمال صاحب کے تبصرے کی غالباً یہ پہلی قسط ہے۔ اگر ایسا ہے تو دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔

مختار الدین احمد۔ علی گڑھ

۱۔ مضمون سے پہلے ایک مختصر سا تعارف نامہ شائع کرنے سے مضمون کی افادیت بڑھ جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے رسالے کے پڑھنے والوں میں ہر شخص کا علم، معلومات اور تجربہ یکساں نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر مجھے بلراج ساہنی کی عظمت بالکل معلوم نہیں۔ یہ تعارف نامہ مصنف کا بھی ہو۔

۲۔ مضمون نگار کا مکمل پتہ (ڈاک کا پتہ) ضرور شائع کیا جائے۔

۳۔ آپ ایک موضوع دے کر ایک علمی مباحثہ تحریری طور پر شروع کریں۔ موضوع کے چناؤ کے لیے بھی آپ ایک اعلان نکال دیں اور پڑھنے والوں سے ایسے موضوع مانگیں جن کا نہ صرف اردو زبان سے بلکہ زندگی سے بھی تعلق ہو۔ انیس و دبیر، مومن و غالب سے دنیا عاجز آ چکی ہے۔ یا یوں کہیے کہ گراموفون کی سوئی اپنے بزرگوں کی تعریف پر ہی اٹک کر رہ گئی ہے۔ آپ کے رسالے کا نام تو عصری ادب ضرور ہے لیکن (کم از کم) ان دو شماروں میں ماضی ہی ماضی نظر آتا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو آپ کا موقر رسالہ اس سوئی کو آگے بڑھا سکتا ہے۔

اس مباحثے سے ایک دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ نوعمر اور غیر ادیب بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے۔

الفاظ کی تعداد محدود کر دیں یعنی صاحب مضمون کو لازم ہو جائے کہ [illegible] میں بند کرے!

۴۔ میں ایک موضوع تجویز کرتا ہوں:

"اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے رومن رسم الخط لازمی ہے"

میرا مضمون جو موضوع کے حق میں ہے تیار ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو اسے میں فوراً بھیج دوں گا مگر میرے مضمون کے ساتھ کم از کم ایک مضمون رومن رسم الخط کے مخالفین کا بھی ہونا شرط ہے۔

محمد نعیم اللہ۔ لندن

'عصری ادب' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کے پچھلے خط کا کچھ ایسا مغموم تاثر ہوا تھا کہ کچھ کہنے یا لکھنے کا یارا ہی نہ رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جن امور کی نشاندہی آپ نے کی تھی وہ سب ہی سو فی صدی کی حد تک حقیقت پر مبنی تھے۔ اب 'عصری ادب' دیکھ کر بہت ہمت بندھی اور خوشی ہوئی کہ "ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" کے بمصداق آپ مصروفِ جدوجہد بلکہ مصروفِ جہاد ہیں۔

زبان کے سلسلے میں خاص طور پر عمل استعمال اور املا کے باب میں، ظاہر ہے استنادی حیثیت آپ ہی اہل علم اور اہل قلم کی ہے۔ روشنی ہم ایسے بے بضاعت لوگوں کو آپ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ میری ساری بساط دو تین کتابوں کی مرہونِ منت ہے۔

۱۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول 'شریف زادہ' اور 'امراؤ جان ادا' کے نسخے مولوی نور الحسن علوی نیر کاکوروی کو پیش کیے تھے۔ نیر کاکوروی ان دنوں [illegible] اور ایٹہ میں وکالت کرتے تھے اور نور اللغات کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں ان کے سگے بھانجے امیر احمد علوی نیپہ چھاؤنی میں رجسٹرڈ تھے چونکہ ان کا بھی مشغلہ ادبی و علمی تصانیف تھا اس لیے نیر کاکوروی نے اپنی بہت سی کتابیں امیر احمد علوی کو دے دیں ان کے بڑے صاحبزادے مشیر احمد علوی (والد مرحوم) نے کاکوری میں ایک اچھا کتب خانہ قائم کیا اور جو کتابیں [illegible]

[illegible] والد مرحوم کی ذاتی لائبریری (الہ آباد) میں بھی رہیں۔ میں نے اور والد مرحوم کی زبان کے ساتھ ہی بچپن میں دونوں ناول کئی کئی بار پڑھے۔ دونوں پر لال اور نیلی پنسل کے نشانات جگہ جگہ تھے۔ والد مرحوم نے بتایا کہ ان دونوں کتابوں کے محاورات اور ترکیب کو نیر کاکوروی نے بطور سند استعمال کیا تھا۔ مولوی نیر کاکوروی کے بعض لوٹ "لکھنؤ میں مستعمل ـــــ دہلی میں نامقبول" وغیرہ وغیرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ان ہی شذرات کے ذریعے اردو زبان سے کچھ شد بد ہوئی۔

۲۔ دوسری کتاب۔ وہ بھی بہت ہی بچپن کا تاثر ہے۔ میر ضامن علی (جلال لکھنوی) کی تصنیف "سرمایۂ زبان اردو" تھی۔ اس میں مذکر و مونث کی بحثوں کے علاوہ بعض ترکیبوں، ضرب الامثال اور محاوروں کے استعمال پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ مثلاً اب تک یاد ہے کہ انھوں نے "من گڑھت" پر زور دیا ہے اب لوگ اس کو من گھڑت لکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے دل سے لوگ بعض باتیں گڑھ لیتے ہیں۔ "گڑھنا، بمعنی وضع کرنا جیسے سنار زیور گڑھتے ہیں یا لوگ الفاظ میں گڑھتے ہیں۔" مگر اب میں خود بھی جب کوئی چیز لکھتا ہوں تو باوجود تاکید کے اکثر رسائل گڑھنے کے بجائے گھڑنا لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "افکار" میں میں نے لکھا تھا "یہ بات انھوں نے برجستہ گڑھی تھی" چھپ کر وہ جملہ اس طرح ہو گیا "وہ بات انھوں نے برجستہ گھڑی تھی"۔

۳۔ تیسری کتاب جس نے زبان سیکھنے میں مدد کی ڈاکٹر عبدالحق کے خطبات و مقالات کا ایک جامع مجموعہ تھا۔ یاد نہیں کس نے کہاں چھاپا تھا مگر الہ آباد میں والد کی لائبریری میں بہت نمایاں رکھا رہتا تھا اس میں زبان آسان سے آسان [illegible] اور اسلوب کو عربی و فارسی کے اثرات سے پاک کرنے پر زور دیا گیا تھا [illegible] "لوگ اش اش کر اٹھے" مگر مدیران جرائد نے ہمیشہ اس [illegible] "تبصرہ" لکھتا ہوں مگر لوگ اس کو "وطیرہ" لکھ دیتے [illegible] اس بات میں شکایت کبھی نہیں کی۔ چنانچہ زبان و بیان کے

بارے میں کوئی توجیہات ہی نہیں ہیں۔ جو دونوں میں لندن [illegible]
ٹائمس میں ایک ہی لفظ کو مختلف املے لکھتا ہوں جب کہ گارڈین اور [illegible]
میں وہی لفظ دوسرے املا — اور اکثر تو دوسرے معنوں میں استعمال کرتا [illegible]
میں نے خود کبھی MOSLEM نہیں لکھا مگر سنڈے ٹیلی گراف میں یہی املا استعمال
کرنا پڑتا ہے جب کہ ٹائمس تک میں MOSLIM رائج ہو گیا ہے چونکہ انگریزی کے
اخباروں کے گھریلو انداز HOUSE STYLE مختلف ہیں اس لیے مدیران جسرائد
(یا کاتب حضرات) کی تصحیح پر جھنجھلانا بالکل چھٹ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ
خود جو طرز فغاں ایجاد کریں گے وہی اہل گلشن (اگر اس نام کی کوئی چیز باقی
بچی) کی "زبان ٹھہرے گی" پھر ہم یا ہمارے بعد آنے والے مستند آپ ہی کو مانیں گے
اور حوالے بھی آپ ہی کے طرز استعمال کے دیں گے۔ ندامت یہ ضرور ہے کہ میرے
ایسے کم علم کی رائے کو آپ نے اہمیت دی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ من آنم کہ من دانم

ہاں اب یہ ذکر بھی ہو جائے۔ شیخ عبداللہ کی سوانح حیات پر کمال احمد صدیقی کا
وقیع اور بہت ہی قابل غور تبصرہ پڑھا۔ کچھ ایسا اشتیاق ہوا کہ آتش چنار کے حصول
کی کوشش شروع کر دی بالآخر فاخر حسین صاحب کے ذریعے حاصل ہو گئی اور
پڑھی..... ہم نے اور بھائی نے مل کر.....

معاف فرمائیے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد — کمال احمد صدیقی کے جامع
تبصرے کے بعد — اور ہندستانی سیاسی افق سے تھوڑی بہت واقفیت کے بعد
بھی یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ مرحوم تھے کیا؟ محب وطن تھے کہ غدار؟ شیر کشمیر تھے یا
صداقت آشرم کی بکری؟ مجاہد ملت تھے کہ ننگ قوم؟ صاحب ایمان و یقین تھے یا
بے ایمان و ننگ دیں؟ شیخ حرم تھے کہ ابلہ دیر مرحوم نے ساری عمر [illegible]
مہمان خانوں ہی میں گزاری۔ خواہ وہ جنوبی ہند کے جیل خانے ہوں یا [illegible]
میں وزیر اعظم کی قیام گاہیں۔ وہ کس حیثیت سے کس [illegible]

دیوانگی جب تک یہ نہ کیا جائے کہ شیخ مرحوم کہا تھے۔ بھارتیہ ودیا بھون کے اتہاس کاروں اور دیوانے کے شیوخ الہند سے معذرت کے ساتھ اس وقت تک ہماری تو رائے یہ ہے کہ سوانح عمری کسی رستاوی نوعیت کے زمرے میں شامل نہ کی جائے گی۔ یوسف ٹینگ صاحب کا اصرار ہے کہ کتاب کے تمام جملے اور فقرے خود شیخ مرحوم کے فرمودہ ہیں۔ تاہم بقول کسے ثبت است بر جریدۂ عالم ..... اب والی بات کہاں ؟

قیصر تمکین۔ لندن

گوشۂ مشتاق یوسفی تو پسند تھا ہی پڑھنے سے پہلے کیونکہ میں نے ان کی سب کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ لیکن آپ نے ان پر مضمون بہت خوب لکھا ہے۔ آپ کی رائے حرف بہ حرف درست ہے۔ آپ نے ان کے طرز تحریر کو پیراہن یوسفی خوب کہا ہے۔ اس کے کئی پہلو اور معنی تہہ در تہہ بات ہے۔ واقعی انھوں نے نثر کو آرٹ بنا دیا۔ ہر لمحے کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ کیسا فکر انگیز جملہ لکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ آپ نے بھی ایک ایسا جملہ لکھا ہے جو میں یہاں نقل کر رہا ہوں ۔ ہر خوبصورتی کا صحیح ردعمل اس کا مقابلہ اور تجزیہ نہیں بلکہ سپردگی ہے۔ مشتاق یوسفی نے جو بات غیاث الدین کے لیے کہی ہے کہ لفظ کا مزاج، وہ جانتے ہیں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ جو منظر کشی اجنتا ایلورا کی نقاشی اور سنگتراشی کے سلسلے میں وصل ناآشنا ان ترسے برہم چاریوں اور بھکشوؤں، جن پر بھوک بلاس حرام تھا۔ اور جو عورت کے جسم کو صرف سپنے میں دیکھتے تھے۔ یہ ان کی ہنر مندی اور سنگتری کی اپنی مثال آپ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی کام اردو نثر میں لفظوں سے وہی کچھ کام یوسفی صاحب نے لیا ہے یعنی الفاظ سے لہو کی گردش اور خوب خوب الاؤ گرما دیا ہے۔

[illegible] جملہ جگر سوز ہے اور [illegible] سرمستی ساتھ TO THE LIFE

مرزا عظیم بیگ چغتائی پر ان کے ماجرے کا مضمون پڑھا زندگی کے ایک نئے پہلو سے آپ نے آشنا کر دیا۔

ملراج ساہنی پر بھی ایک اچھا مضمون تھا۔ مجھے ادھورا سا لگا۔ آپ نے بیکل اتساہی کی دو تصویریں ایک ہی شمارے میں شائع کی ہیں اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

آپ کا اعلان برائے اشاعت "تذکرہ شعرائے ہند" بھی پڑھا یہ تو بہت بڑا کام ہے انسائیکلو پیڈیا کی طرز کا کام ہے۔ یہ تو بہت بڑا منصوبہ لگتا ہے۔ آپ نے پہلے بھی بہت بڑے بڑے کام کیے ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ اس کو بھی مکمل کر لیں گے۔

"باعث تاخیر" میں آپ نے بہت خوبصورتی اور اختصار سے کیا ہے کہ وہ بات جو میرے اور آپ کے درمیان اکثر ہوتی تھی کہ اب دنیا پر ہیروئن اور منشیات فروشوں کی اجارہ داری ہے۔ اور اب ان لوگوں نے ادب اور آرٹ کی بھی سرپرستی شروع کر دی ہے فلمی حلقوں میں تو ان کا بہت اثر ہے۔ صدر ریگن کی اہلیہ محترمہ کا بھی تذکرہ آپ نے خوب ذکر کیا ہے۔ لندن میں نعیم اللہ صاحب کی فکر انگیز بات کو بھی آپ نے لکھا ہے ہم حال کے نئے سائنسی تقاضوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں ——

"عصری ادب" کو اس بارے میں پہل کرنی چاہیے ایک گوشہ اس کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں دوسری زبانوں کے تراجم بھی ہو سکتے ہیں اردو میں طبع زاد لکھنے والے مشکل سے ملیں گے۔ جب کوئی مضمون طبع ہو گا تو اس میں دل چسپی لینے والوں کا ایک نیا حلقہ ضرور پیدا ہو گا۔

لیاقت حسین۔ دہلی

"عصری ادب" ۱۹۸۱ء کے صفحہ ۱۳۲ پر ایک نظم "بدلتے سائے" کے عنوان سے شائع ہوئی جو میرے نام سے ہے شاید کتابت کی غلطی ہوئی یا ترتیب دینے میں کسی اور شاعر کے بجائے میرا نام چھپ گیا ہے۔ نظم پڑھنے کے بعد میں بھی

[illegible] میں [illegible] کرتا رہا مگر یہ نظم میری نہیں ہے۔ کسی اور کی ہے غلطی سے شائع ہو گئی ہے۔

بیکل اتساہی۔ نئی دہلی

آئینے ترچھے آئینے دیکھ لیے۔ جو کچھ آپ نے کہا حرف بہ حرف صحیح ہے۔ لیکن اس وبا کو روکا کیسے جائے۔

نوشادی ادب کے علاوہ اب تو بکاؤ ادب بھی تخلیق کیا جا رہا ہے یعنی پیسہ پھینکو اور افسانے لکھوا لو، ناول لکھوا لو، نقاد خرید لو، مبصر اور تبصرہ خرید لو۔

پھر بھی اجالے کی کرنیں کہیں نہ کہیں سے تو پھوٹتی ہی رہتی ہیں۔

شفیقہ فرحت۔ بھوپال

جنوری ۱۹۹۲ء کا "عصری ادب" ملا۔ بلراج ساہنی والے مضمون کو چھوڑ کر پہلے سے آخری صفحے تک پڑھ ڈالا۔ لکھنؤ اور دریا آباد کے سفر سے آج ہی صبح پانچ راتوں کے بعد لوٹا ہوں۔ کتاب بیوی کے ساتھ آنے کی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔

مشتاق یوسفی کی چاروں کتابیں گرمیوں میں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کی ستائش بہت پسند آئی۔ مصنف کے کھلے ذہن، دردمند شعور، عام طور پر [illegible] اور ترقی پسند رویے کو آپ نے بالکل صحیح طور پر سراہا اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ میں خود ان پر لکھنا چاہتا تھا مگر اس کے لیے مجھے دوبارہ اور پڑھنا پڑے گا اور اتنی فرصت کہاں سے لاؤں۔ آپ کی نقاشی بہت قابل [illegible] ہے۔ [illegible] ان کے بعض محاوروں، اکثر انگریزی کی غیر ضروری یورش [illegible] اور [illegible] آپ [illegible] میں پہلا مضمون بھی تھوڑی کوشش سے [illegible] [illegible] اور [illegible] پیچھے کا پیشہ دوبارہ بیان کر [illegible] [illegible] ہو جائے۔ ورنہ اس حالت میں [illegible]

ہوتا ہے۔ پہلوئے ذم اکثر ہلکا ہے اس سے انھیں بچنا چاہیے۔

انٹرویو سے ان کے ادبیانہ رویوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور انھوں نے اپنے "مجلے" کے آغاز میں جو مزاح کا پہلو نکالا ہے خوب نہیں بہت خوب ہے۔

عظیم بیگ پر ان کے صاحبزادے کا مضمون دل کو چھوتا ہی نہیں، زخمی کر جاتا ہے۔ کیسے باہمت اور صاحب ارادہ تھے! ہمارے معاشرے میں زیادہ تر تو مظلوم ہی رہے ہیں اور "سیانے" ہمیشہ بے وقوفوں پر ہی زندہ رہے ہیں۔ حالانکہ یہاں مزاح نگار اہل قلم انسانی ہمدردی کا مرقع تھا مضمون ذرا کھردرا ہے مگر یادگار رہے گا۔

آپ کے اداریے بہت معلوماتی ہیں۔ بس حالاتِ حاضرہ کے خاتمے پر اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے ع ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے۔

تبصرے اہم کتابوں پر ہیں، لائبریری میں منگاؤں گا کہ خود اتنی دولت کا مالک نہیں۔

سعید الظفر چغتائی۔ علی گڑھ

"عصری ادب" جنوری ۱۹۹۲ء موصول ہوا۔ تسلسل میں گو چند ماہ کا تعطل در آیا، مگر اب یوں لگتا ہے کہ پرچہ اپنی پچھلی آن بان اور دلکشی کے ساتھ فکر و عمل کے نئے راستوں میں آگہی اور بصیرت افروزی کی شمعیں روشن کرے گا۔

زیر نظر شمارے کے آڑے ترچھے آئینے میں ہمارے عکسی پیکر اتارتے ہوئے مسائل کو تہہ آب سے سطح آب تک لے آیا ہے۔ علم و ادب کی توقیر اگر قدیم ہے تو ایسے رجحانات کو شکست دینا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

ہاں صاحب! ہمارے لندن کے کرم فرما نعیم اللہ صاحب کے اردو والوں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے وہ مسائل یقیناً موجود ہیں اور ان پر ہمیں

ادبی ذی تقدیر دانشوروں، ادبا اور شاعروں اور تخلیقی تنقید لکھنے والوں کو محدود فکر کرنے کی تلقین بے جا ہوگی لیکن سرے سے عملاً ادب اس سلسلے سے عاری ہے، یہ کہنا شاید غلط ہوگا۔

بات نکلی ہے تو یہ عرض کر دینے میں مضائقہ نہیں کہ آپ کے نامور نگار نے اپنے منتخب مجموعہ مضامین ـــــ گریز چاہے ہے خرابی جو ۹۰-۱۹۸۹ء میں طبع ہوا اس کے صفحہ پر ادب کے لوپس کا مسئلہ زیر بحث لاتے ہوئے تقریباً ویسے ہی سوالات اٹھائے ہیں جن کا ذکر آپ کی اور نعیم اللہ صاحب کی گفتگو کا موضوع ہے۔

اردو زبان و ادب ایک مخصوص تاریخی عہد، تہذیب اور کلچر سے اپنا نمو اٹھا کر یہاں تک آئی ہے اور کم و بیش پچپن سال سے آزاد نسلی، ترقی پسند فکر اور حقیقت پسندی و سچائی کا پرچم اٹھائے معاشرے میں عدل و انصاف، فرقہ پرستی اور نسلی و لسانی بربریت کو اپنے اشعار نثری شہ پاروں، ناول اور افسانوں کی سپر پر روک رہی ہے اور دنیا سے ظلم اور ناہمواری کی شطرنجی بساط کو الٹ دینے کے درپے ہے۔

خورشید عالم۔ کناڈا

الکحل سے پاک، وٹامنوں سے بھرپور،
جڑی بوٹیوں سے تیار طبّی لحاظ سے تصدیق شدہ،
طلباء کی ذہنی صلاحیتوں کو بڑھانے والا نادر ٹانک

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گھر بھر کی صحت کے لیے [illegible]

[illegible]

● [illegible] ● [illegible] ● [illegible]

Registration No
21887-71

07 Nov-1982

ASRI ADAB

D 7, Model Town DELHI-9

پروفیسر محمد حسن کی تصانیف

۱۔ ادبی تنقید
۲۔ ہندی ادب کی تاریخ (طبع اول ۔ دوم سوم
۳۔ مطالعۂ سودا
۴۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک
۵۔ ملال لکھنوی
۶۔ عرض ہنر
۷۔ معاصر ادب کے پیش رو
۸۔ جدید اردو ادب
۹۔ شناسائیاں
۱۰۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و تاریخی پس منظر
۱۱۔ مشرقی تنقید
۱۲۔ ادبی سماجیات
۱۳۔ ادبیات شناسی
۱۴۔ ہیئتی تنقید (ہندی)
۱۵۔ رنجیر نغمہ (شاعری)
۱۶۔ میرے اسٹیج ڈرامے
۱۷۔ موہن کھی (ڈرامے)
۱۸۔ تماشا اور تماشائی (ڈراما)
۱۹۔ پیسہ اور پرچھائیں (ڈراما)
۲۰۔ ضحاک (اردو اور کنڑ ترجمہ)
۲۱۔ کہرے کا چاند (ڈراما)
۲۲۔ زلفیں زنجیریں (ناول)

۲۳۔ [illegible]
۲۴۔ [illegible]
۲۵۔ [illegible]
۲۶۔ [illegible]
۲۷۔ [illegible]
۲۸۔ [illegible]
۲۹۔ [illegible]
۳۰۔ [illegible]
۳۱۔ [illegible]
۳۲۔ [illegible]
۳۳۔ [illegible]
۳۴۔ [illegible]
۳۵۔ [illegible]
۳۶۔ [illegible]
۳۷۔ [illegible]
۳۸۔ [illegible]
۳۹۔ [illegible]
۴۰۔ [illegible]
۴۱۔ [illegible]
۴۲۔ [illegible]

ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹